وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ
اکرم التفاسیر
وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ
الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی
13

بسم اللہ الرحمن الرحیم
وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ
اکرمُ التفّاسیر
وَمَآ اُبَرِّیُٔ نَفْسِیْ
الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی
13

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بدبختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہوگی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔

www.QuranTafseer.net

0092 323 520 5255

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کر کے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

از دِل خیزد بر دِل ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے ''اسرار التنزیل'' کے ہوتے ہوئے ''اکرم التفاسیر'' کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خودنمائی کی پہلے کوئی تمنا تھی، نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسر قرآن کہے، نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم و معارف عطا فرمائے، انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو اپنے وقت نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب و کتاب، جنت و دوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو رہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ، اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں، آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل و حمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے۔ اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم و ایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village بنا دیا اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے۔ اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے

تبدیل ہو رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی ''اسرار التنزیل'' کے ہوتے ہوئے ''اکرم التفاسیر'' کے منظر عام پر آنے کی۔ لہٰذا ''اسرار التنزیل'' کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا، جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقام ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا، عطا و کرم کی اس بارش میں اہل بصیرت نے دیکھا کہ فہم قرآن کا پیغام، قلب پر وِجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

''اسرار التنزیل'' کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ ''اکرم التفاسیر'' میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہل علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے، نجات اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے ... آمین ...

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

امیر محمد اکرم

امیر محمد اکرم اعوان

شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرّم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث، مفسیرین کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن و حدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدنّی ان علمائے ربانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرّم کے خطابات سے ماخوذ ''اکرم التفاسیر'' بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علومِ جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدنّی کی ایسی روشن مثال ہے، جس میں نہ صرف علومِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں، لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرّم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ، ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں، جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جابجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔

حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا باالفاظ دیگر ''فکر قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنانِ اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں، لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانونِ وراثت سے پریشان ہیں، جنت و دوزخ یا ثواب و عذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں، جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرّم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ ''اکرم التفاسیر'' میں آپ نے اسی فکر قرآنی کو اجاگر کیا ہے، جو اس تفسیر کا طرۂ امتیاز ہے۔

امیر المکرّم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت و رسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبہ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہدِ غلامی کرلو۔ تمہاری ذِمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے، یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے۔ جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہل حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرّم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں، عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے، عصر حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالم اسلام ہی کی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکر قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرّم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے۔ لیکن حضرت امیر المکرّم قرآن کی روشنی میں حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔

آپ سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیہ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین اور پورے ایمان سے منبر رسول ﷺ پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دُنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دو چار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبہ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرّم کے زوردار اندازِ بیان میں فکر قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرّم نے فکر قرآنی کی بات کرتے ہوئے اُمت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی، اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم اُمید افیون سے کم نہیں، جس نے اُمت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت مدظلہ العالی کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرّم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبہ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے، جو ہر دور میں خون مسلم کو گرم اور اُمت مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔ امیر المکرّم نے ''اکرم التفاسیر'' میں یہ فکر اس قدر

نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسر قرآن سے آگے مفکر قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرّم کی پہچان بطور مفسر قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکر قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکر قرآن امیر المکرّم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔ آمین۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَللّٰھُمَّ سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط

اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۝

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُوْا

پارہ 13 وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ

سورۃ یوسف رکوع 7 آیات 53 تا 57

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ۭ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾ وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ۭ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور میں اپنے آپ کو پاک صاف نہیں کہتی بے شک نفس تو (انسان کو) برائی ہی سکھاتا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم فرمائے۔ بے شک میرا پروردگار بخشنے والا مہربان ہے ﴿۵۳﴾ اور بادشاہ نے کہا ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو خاص اپنے ساتھ رکھوں گا پس جب (بادشاہ نے) ان سے گفتگو کی کہا یقیناً آج سے آپ ہمارے ہاں بڑے معزز (اور) بڑے قابلِ اعتماد ہیں ﴿۵۴﴾ (یوسف علیہ السلام نے) فرمایا مجھے ملکی خزانوں پر مقرر کردیجیے بے شک میں حفاظت بھی رکھوں گا (اور اس شعبہ کو) خوب جانتا بھی ہوں ﴿۵۵﴾ اور ہم نے اسی طرح

سے یوسف (علیہ السلام) کو ملک (مصر) میں بااختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں۔ ہم جس پر چاہیں اپنی رحمت متوجہ فرمائیں اور ہم خلوص سے نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ﴿۵۶﴾ اور آخرت کا اجر کہیں بہتر ہے ایمان لانے والوں اور پرہیزگاری کرنے والوں کے لیے ﴿۵۷﴾

تفسیر ومعارف

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

بادشاہِ مصر کے دربار میں بات ہو رہی ہے اور امراء کی وہ بیویاں جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے، موجود ہیں۔ انہوں نے حضرت یوسفؑ کی پاکبازی کی شہادت دی اور زلیخا جو اُن عورتوں کے روبرو پہلے اقبالِ جرم کر چکی تھی، بول اٹھی کہ اب وہ وقت رہا نہ وہ حالات رہے، وہ جوانی رہی نہ وہ اقتدار رہا، بات بھی کھل کر سامنے آ گئی، لہٰذا میں اقرار کرتی ہوں کہ غلطی میری تھی۔ میں نے ہی انہیں ورغلانے کی کوشش کی جبکہ وہ تو بلاشبہ سچے، کھرے پاکباز شخص ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے پہلے اُن کے روبرو اُن پر تہمت لگائی تھی اور آج چونکہ وہ یہاں موجود نہیں ہیں تو میں ان کی عدم موجودگی میں اس کا کفارہ ادا کر رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی یہ بات جان لیں کہ میں نے ان کی غیر حاضری میں ان کے ساتھ خیانت نہیں کی۔ اور مجھے یہ بھی تجربہ ہو گیا ہے کہ اللہ کریم خیانت کرنے والوں کو کبھی کامیاب نہیں کرتے۔ زلیخا نے مزید کہا، وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ میں اپنے نفس کو بری الذمہ قرار نہیں دیتی اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ یقیناً نفس برائی کا حکم کرتا ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ سوائے اس کے کہ میرا پروردگار کسی پر رحم کرے۔ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یقیناً میرا ربّ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اکثر مترجمین اور مفسرین کرام نے اس قول کو حضرت یوسفؑ سے منسوب کیا ہے۔ جن مفسرین کرام نے اس قول کو یوسفؑ کی طرف منسوب کیا ہے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ زلیخا کا کلام بھی ہو سکتا ہے چونکہ اس قول میں نفس کے علاوہ اللہ کی رحمت اور بخشش کی بات ہوئی تو یہ سمجھا گیا کہ یہ قول حضرت یوسفؑ کا ہے جبکہ یہ بادشاہ کے دربار میں بات ہو رہی ہے۔ زلیخا کلام کر رہی ہے، اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے بعد اسی تسلسل میں کہہ رہی ہے وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ میں اپنے نفس کو بری الذمہ قرار نہیں دیتی۔

قواعدِ زبان کے مطابق جب سامنے موجود آدمی کلام کر رہا ہو اور اسے کسی دوسرے کی بات کرنا ہو تو اس

کے لیے کلام میں کوئی اشارہ آتا ہے مثلاً یہ کہا جائے کہ ''پھر انہوں نے یہ کہا''، اس اشارے کو قرینۂ صارفہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسا قرینہ جو بات کو دوسرے کی طرف پھیر دے۔ اس جگہ قرآن حکیم میں کوئی قرینۂ صارفہ موجود نہیں ہے بلکہ زلیخا کی بات ہی تسلسل سے جاری ہے۔ اگر کلام کا رُخ حضرت یوسفؑ کی طرف پھیرنا مقصود ہوتا تو اس کا اشارہ کلام میں موجود ہوتا۔ یہ قول حضرت یوسفؑ کا نہیں ہے۔ اس کا ثبوت خود اسی سے متصل گزشتہ آیات میں موجود ہے کہ بادشاہ نے جب شاہی قاصد کو یوسفؑ کے پاس بھیجا تو آپؑ نے فرمایا، قَالَ ارۡجِعۡ اِلٰى رَبِّكَ فَسۡـَٔلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِىۡ قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ کہ تم واپس اپنے بادشاہ کے پاس جا کر کہو کہ پہلے اس جرم کے بارے معلوم کرے جس کے الزام میں مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ پہلے ان عورتوں سے تفتیش کر لے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ یہ پتا تو چلے کہ میں مجرم ہوں یا بے قصور ہی قید ہوں۔ یوسفؑ کا یہ پیغام قاصد بادشاہ کے پاس لے کر آیا تو بادشاہ نے زلیخا اور دیگر عورتوں کو تفتیش کے لیے طلب کیا۔ یوسفؑ ابھی جیل میں ہی تشریف فرما تھے جب زلیخا شاہی دربار میں اقبالِ جرم کر رہی تھی اور نفس کی بات کر رہی تھی (وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ) لہٰذا یہ الفاظ زلیخا کے ہیں نہ کہ یوسفؑ کے۔ عورتوں کی ساری باتیں سننے کے بعد بادشاہ کہتا ہے کہ اب تو معاملہ صاف ہو گیا ہے، اب یوسف کو بلا لائیں۔ لہٰذا یہ قول یوسفؑ کا نہیں ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام تخلیقاً معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ عصمت انبیاء علیہم السلام کی اہم صفت ہے۔ کوئی غیر نبی معصوم عن الخطا نہیں ہوتا۔ یعنی نبی تخلیقی طور پر نبیؑ ہوتا ہے اور اس کا نفس امارہ نہیں ہوتا، برائی کا حکم نہیں کرتا اس لیے بھی یہ قول یوسفؑ کا نہیں ہے۔

تفسیر ''الجمال والکمال'':

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ اپنے دور کے نہایت اعلیٰ پائے کے عالم، مفسّر اور فقیہہ تھے۔ علمی اعتبار سے بہت معروف اور قضاء کا عہدہ رکھنے والے متقی قاضی تھے۔ انہوں نے سورۂ یوسفؑ کی تفسیر 'الجمال والکمال' کے نام سے لکھی ہے۔ غالباً حج کے قیام کے دوران مکہ مکرمہ میں لکھی گئی جس میں انہوں نے بہت مفصل بحث سے ثابت کیا ہے کہ یہ قول زلیخا کے اس مسلسل کلام کا حصہ ہے جو اس نے شاہی دربار میں کیا۔ اور حضرت یوسفؑ اس کلام کے اختتام کے بعد وہاں تشریف لائے۔

صاحب تفسیر الجمال والکمال کی ساری زندگی اللہ کے دین کی سرفرازی کے لیے وقف رہی اور وصال بھی واپسی کے سفر کے دوران ہوا۔ قاضی صاحبؒ کے زمانے میں حج کا سفر تقریباً ایک سال میں مکمل ہوتا تھا۔ قاضی صاحبؒ کو کئی مرتبہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ حتیٰ کہ اسی مبارک سفر سے واپسی پر جہاز میں ہی ان کا وصال ہوا اور جہاز پر ہی ان کا جنازہ پڑھا گیا۔ اور سمندر میں ایک کشتی پر ان کی میت کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ جہاز کے مسافر دور تک

ان کا وجود مبارک دیکھتے رہے۔ اللہ قادر ہے اس نے انہیں سمندر کی تہہ میں اتار دیا۔ آج بھی ان کی قبر سمندر کی تہہ میں ہے۔ سمندر نے ان کی قبر پر مٹی ڈال دی ہے۔

نفس کیا ہے؟

مفسرین کرام نے اس پر بہت بحث کی ہے۔ صاحب تفسیرِ مظہری (رحمۃ اللہ علیہ) لکھتے ہیں کہ جب عناصرِ اربعہ آگ، مٹی، ہوا اور پانی ملتے ہیں تو اس سے نفس پیدا ہوتا ہے۔ روح اور چیز ہے، نفس اور چیز ہے۔ روح عالم امر سے ہے۔ اللہ کریم اسے انسانی بدن میں ڈال دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر نفس جب تک دین سے آشنا نہیں ہوتا، ایمان نہیں لاتا، اس پر ان عناصر اربعہ کے اثرات ہوتے ہیں۔ کچھ عادات مٹی سے لیتا ہے جس میں رذالت، خصالت کمینہ پن آ جاتا ہے۔ کچھ آگ سے لیتا ہے جس میں تکبر، نخوت اور غرور پایا جاتا ہے۔ کچھ اثرات ہوا سے لیتا ہے، کچھ پانی سے۔ نفس کے یہی عناصر اس کی بنیاد ہیں۔ تو ہر نفس، نفسِ امارہ ہی ہوتا ہے سوائے انبیاء علیہم السلام کے۔

امارہ سے مراد ہے کہ وہ دنیا میں اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے۔ اسے کسی کی اطاعت کی پروا نہیں ہوتی لیکن جسے نور ایمان نصیب ہوتا ہے اور وہ کلمہ پڑھ کر اسے قبول کر لیتا ہے تو پھر عناصر اربعہ کے اثرات میں وہ قوت نہیں رہتی۔ نفس ان کے اثرات سے آزاد ہو کر نفسِ لوامہ بن جاتا ہے۔ نفسِ لوامہ کی خاصیت ہے کہ وہ گناہ کرنے کے بعد افسوس کرتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ گویا نفس ملامت کرتا ہے۔ جو بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اپنے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا اتباع کرتا ہے، معاملات میں سچا کھرا ہوتا ہے۔ عبادات کے فرائض و واجبات و سنن ادا کرتا ہے تو ترقی کرتے ہوئے وہی نفس، نفسِ مطمئنہ بن جاتا ہے۔ نفس کی یہ تین حالتیں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام میں نفسِ امارہ نہیں ہوتا۔ نبی تخلیقی طور پر نبی ہوتے ہیں۔ جب بیت اللہ کی تعمیر نو ہو رہی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک بہت کم تھی۔ بچپن تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف تہہ بند باندھ رکھا تھا۔ کرتا مبارک جسم اطہر پر نہیں تھا، کندھے پر پتھر اٹھا رکھے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے، انہوں نے اپنے ننھے بھتیجے کا تہہ بند کھول کر کندھے پر رکھ دیا کہ اس پر پتھر رکھ لیں، جیسے ہی تہہ بند کھولا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہو گئے۔ چچا نے جلدی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ستر ڈھانپ دیا۔ تہہ بند باندھ دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوش میں آ گئے۔ تو انبیاء علیہم السلام کے نفس اس طرح کے نہیں ہوتے کہ انہیں عام آدمی کی طرح لیا جائے۔ اور نبی کا نفس امارہ نہیں ہوتا۔

قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ تب بادشاہ نے کہا اب تو معاملہ صاف ہو گیا، (یوسف علیہ السلام یہی چاہتے تھے اور وہ کام ہو گیا) لہٰذا ایسے نیک، پارسا، خوبصورت، خوش اطوار، نکتہ رس صاحب دانش وبینش کو میرے پاس لاؤ، میں ان کو خاص اپنے پاس رکھوں گا۔ جب معاملہ صاف ہو گیا تو یوسف علیہ السلام تشریف لے آئے فَلَمَّا كَلَّمَهٗ بادشاہ نے ان سے

گفتگو کی، قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ آپؑ نے بادشاہ سے بہت سی باتیں کیں۔ آپؑ نے بادشاہ کو اس کے خواب کی وہ تمام جزئیات تک بتادیں جو بادشاہ خود بھول چکا تھا۔ پھر بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر بالمشافہ سنی۔ آپؑ نے بعدازاں اسے ملکی خزانے کی حفاظت، عوام کی بہتری اور ملکی معیشت کے استحکام کے لیے ایسے طریقے بتائے جو اللہ کریم کی طرف سے وحی کے ذریعے آپؑ کو معلوم تھے۔ بادشاہ آپؑ کی ذہانت و فطانت اور خصائل وکمالات کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ اس نے کہا آج سے آپؑ بصد عزت واحترام ہمارے پاس ہی قیام فرمائیں گے۔ یقیناً آپؑ وہ ہستی ہیں کہ آپؑ کا اعزاز واحترام کیا جائے۔ آپؑ کی آراء، آپؑ کے مشورے، آپؑ کے ارشادات سارے اس قابل ہیں کہ ان پر پوری طرح غور کیا جائے۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ بادشاہ نے آپؑ کے مفید مشورے سن کر کہا کہ ان کو بروئے کار لانے والا کون ہوگا تو آپؑ نے فرمایا کہ آپ ملکی خزانے کے امور میرے سپرد کردیں۔ میں اس کی حفاظت بھی کروں گا اور اس کے آمدوخرچ میں توازن رکھنے، خزانے کو جائز وسائل سے بڑھانے اور ملکی فلاح کے لیے استعمال کرنے کے طریقہء کار سے واقف بھی ہوں۔ اللہ نے مجھے ان امور سے آگاہ فرمادیا ہے۔ میں تنگی اور خوشحالی ہر طرح کے حالات سے نپٹ سکتا ہوں۔

بادشاہ آپؑ کا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ ایک سال تک وہ آپؑ کی خدمت میں لگا رہا۔ عقیدت کے ساتھ آپؑ کی خدمت میں رہا، بالآخر مسلمان ہوگیا۔ آپؑ کی بیعت کرلی اور سال کے بعد خزانہ ہی نہیں بلکہ تمام امورِ سلطنت آپؑ کے سپرد کردیے۔ تخت وتاج آپؑ کے قدموں میں نچھاور کردیا۔ ایک سال کے بعد اس کا وصال ہوگیا۔ اس کے بعد پوری حکومت یوسفؑ کو مل گئی اور آپؑ مصر کے خودمختار حاکم بن گئے۔

شرعی مسئلہ:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے اِنَّا لَنْ نَّسْتَعْمِلَ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَہٗ (صحیح مسلم)

"ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو۔"

یعنی جو عہدے کا طالب ہو، اسے عہدہ نہ دیا جائے اور ان لوگوں کو دیا جائے جو عہدوں سے دور بھاگتے ہوں۔ جنہیں عہدے کا لالچ نہ ہو۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ جو لوگ عہدے کے طالب ہوں، انہیں اس کا لالچ ہو، ایسے افراد کو عہدہ نہ دیا جائے لیکن جو لوگ اہل ہوں، کام جانتے ہوں، امانت دار ہوں، قومی مسائل کا حل جانتے ہوں تو ایسے لوگ اگر عہدہ طلب کریں کہ وہ قوم کو مسائل سے نکال دیں تو انہیں عہدہ دینا درست ہے بلکہ ایسا کرنا چاہیے۔

حضرت یوسفؑ کا عہدہ طلب کرنا اسی لیے تھا کہ ملک پر ایک مشکل وقت آنے والا تھا اور آپؑ اُن سے نبرد آزما ہونے کے طریقۂ کار سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ ان کے سوا اُس وقت کوئی اور ایسا اہل شخص موجود نہیں۔

حکمت الٰہی:

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ اس طرح ہم نے یوسفؑ کو ملکِ مصر کا مکمل اختیار دے دیا۔ اس پورے ملک پر آپ کا اختیار ایسا تھا کہ جہاں چاہیں، آئیں جائیں، جہاں چاہیں رہیں۔ **نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ** یہ سب ہماری رحمت سے ہوا۔ یہ سب ہماری عطا تھی، بخشش تھی۔ جو مصائب آئے وہ حکمت الٰہی تھی۔ والدِ گرامی سے جدائی ہوئی تو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا۔ کنویں سے نکلے تو قافلے والے غلام بنا کر لے گئے۔ بھائیوں نے بیچ دیا۔ بکتے بکاتے عزیزِ مصر کے گھر آ گئے۔ اس نے بڑی محبت سے محل کے آرام و آسائش میں پرورش کی۔ لیکن تھے تو زرخرید غلام، جب جوان ہوئے تو اس کی بیوی نے تہمت لگائی۔ اللہ کریم نے چھوٹے سے بچے کو گویائی عطا کر کے سارا معاملہ صاف کر دیا۔ لوگوں کی طنز سے بچنے کے لیے بادشاہ نے جیل بھیج دیا، جہاں وہ برسوں رہے۔ جب رہائی کا وقت آیا تو اللہ کریم نے ایسا بندوبست فرمایا کہ وہ سارے الزام صاف ہو گئے۔ بادشاہ کے دل میں اُن کا احترام ڈال دیا۔ بادشاہ کو بھی نورِ ایمان نصیب ہوا۔ ساری سلطنت یوسفؑ کے زیرِ نگیں آ گئی اور آپ مصر کے خود مختار بادشاہ بن گئے۔

فرمایا، ہماری حکمت کو ہم ہی جانتے ہیں کہ کس کام کو کس انداز سے کہاں پایۂ تکمیل کو پہنچانا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ ہم خلوصِ دل سے نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔ نیکی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ بالآخر اپنا نتیجہ لے آتی ہے۔ اس میں کتنے ہی زیر و بم آئیں، کتنے نشیب و فراز آئیں لیکن کامیابی بالآخر نیکی اور خلوص کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ہر نیکی اگرچہ اپنا بدلہ دنیا میں بھی دیتی ہے لیکن ایمان والوں اور متقیوں کے لیے آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔ لوگوں کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جھٹ پٹ نتائج چاہتے ہیں حالانکہ اللہ کریم نے دنیا کا نظام خود ایسا بنایا ہے کہ اسباب پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنا وقت لیتے ہیں پھر ان پر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ نیکی پر بہر حال بھلا نتیجہ ہی مرتب ہوتا ہے۔ اس دنیا کا نظام وقتی عارضی اور لمحاتی ہے۔ حقیقی علم تو آخرت میں ہوگا کہ اعمال پر کیا نتائج مرتب ہوئے۔ انسان کا ادراک وہاں وسیع ہوگا۔ اسے پتا چل جائے گا کہ برائی کی سزا کیا مل رہی ہے اور نیکی کا اجر کتنا عظیم ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، جو دنیا میں اللہ سے ڈرتے تھے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے تھے۔ کتنا عظیم اور مبارک اجر ہے!

سورۃ یوسف رکوع 8 آیات 58 تا 68

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾ قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ

عَنۡهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَىۡءٍ اِلَّا حَاجَةً فِىۡ نَفۡسِ يَعۡقُوۡبَ قَضٰٮهَا‌ ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۸﴾

اور یوسف (علیہ السلام) کے بھائی آئے (غلّہ لینے کی غرض سے) پھر ان کے پاس پہنچے تو انہوں (یوسف علیہ السلام) نے ان کو پہچان لیا اور وہ ان (یوسف علیہ السلام) کو نہ پہچان سکے ﴿۵۸﴾ اور جب انہوں (یوسف علیہ السلام) نے ان کا سامان تیار کر دیا تو فرمایا جو باپ کی طرف سے تمہارا ایک اور بھائی ہے اسے بھی میرے پاس لیتے آنا کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں ماپ بھی پورا پورا دیتا ہوں اور میں مہمانداری بھی سب سے اچھی کرتا ہوں ﴿۵۹﴾ پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لاؤ گے تو تمہیں میرے پاس سے غلّہ نہیں ملے گا اور تم میرے پاس بھی نہیں آ سکو گے ﴿۶۰﴾ انہوں نے کہا ہم اس کے بارے اس کے والد سے تذکرہ کریں گے اور ہم یہ کام ضرور کریں گے ﴿۶۱﴾ اور انہوں (یوسف علیہ السلام) نے اپنے کام کرنے والوں کو حکم دیا کہ ان کی پونجی ان کے اسباب میں (چھپا کر) رکھ دو تا کہ جب یہ اپنے اہل وعیال میں جائیں تو اسے پہچان لیں (پا کر خوش ہوں) تا کہ یہ پھر سے یہاں آئیں ﴿۶۲﴾ پس جب وہ واپس اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے اے ہمارے والد! ہم سے غلّہ روک دیا گیا ہے سو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجیے تا کہ ہم (پھر) غلّہ لا سکیں اور یقیناً ہم ان کی پوری حفاظت کریں گے ﴿۶۳﴾ انہوں (یعقوب علیہ السلام) نے فرمایا کیا میں اس کے بارے میں تمہارا ایسا ہی اعتبار کر لوں جیسے پہلے اس کے بھائی (یوسف علیہ السلام) کے بارے کیا تھا۔ سو اللہ ہی نگہبان ہیں اور وہ سب سے بہتر رحم کرنے والے ہیں ﴿۶۴﴾ اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو (اس میں) ان کو ان کی جمع پونجی (بھی) ملی جو ان کو واپس کر دی گئی تھی۔ کہنے لگے اے ہمارے والد! ہمیں اور کیا چاہیے یہ ہماری پونجی ہے جو ہمیں واپس کر دی گئی ہے اور اب ہم اپنے گھر والوں کے لیے (اور)

غلّہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی خوب حفاظت کریں گے اور (ان کی وجہ سے) ایک اونٹ کا بوجھ غلّہ زیادہ لائیں گے۔ یہ تھوڑا سا غلّہ ہے ﴿۶۵﴾ انہوں نے فرمایا میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کی قسم کھا کر مجھ سے وعدہ نہ کرو کہ تم ضرور اسے لے ہی آؤ گے ہاں اگر تم گھیر ہی لیے جاؤ تو (مجبوری ہے) پس جب وہ (قسم کھا کر) ان سے وعدہ کر چکے تو فرمایا کہ جو قول وقرار ہم کر رہے ہیں اس کا اللہ ضامن ہے ﴿۶۶﴾ اور فرمایا اے میرے بیٹو! (سب کے سب) ایک ہی دروازے سے مت داخل ہونا اور علیحدہ علیحدہ دروازوں سے داخل ہونا اور میں اللہ کے حکم کو تو تم سے نہیں روک سکتا حکم تو بس اللہ کا ہی (چلتا) ہے میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ﴿۶۷﴾ اور جب وہ (شہر میں) داخل ہوئے جہاں سے ان کے والد نے ان کو فرمایا تھا کوئی تدبیر اللہ کے حکم کو ان سے ذرا بھی نہ ٹال سکتی تھی ہاں وہ یعقوب (علیہ السلام) کے دل کی آرزو تھی جو انہوں نے پوری کی اور یقیناً وہ بڑے صاحب علم تھے اس لیے کہ جو ہم نے ان کو علم بخشا تھا ولیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے ﴿۶۸﴾

تفسیر ومعارف

اللہ کا نظام اور اس کی مصلحت:

اللہ جل شانہٗ کا اپنا نظام ہے اور بہت خوبصورت ہے اس میں کوئی سقم نہیں ہے۔ ہر طرح سے، ہر حال میں پورا اور مکمل ہے۔ یوسف علیہ السلام کو جب بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا تو اللہ کریم نے یوسفؑ پر القاء فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، ایک وقت آئے گا کہ تم برسرِ اقتدار آؤ گے اور تمہارے بھائی تمہارے سامنے دستِ سوال دراز کریں گے۔ برسوں بیت گئے۔ مختلف سرد وگرم زمانہ سہہ کر آپ جیل سے رہا ہوئے۔ بادشاہ کے پاس رہے۔ پھر حکومت وسلطنت بھی انہیں مل گئی۔ آپؑ نے بڑی محنت سے کھیت کاشت کروائے، غلّہ جمع کیا، گودام بھرے۔ پھر قحط سالی کا دور شروع ہوا۔

جب قحط کے سال آئے تو آپؑ نے اپنی نگرانی میں غلہ فروخت کرنا شروع کروایا۔ ہر سائل بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا، تحقیق کی جاتی کہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے اور اس کے افرادِ خانہ کتنے ہیں۔ ہر گھر کو ایک اونٹ کا بوجھ فروخت کیا جاتا تھا۔ اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔ ایک تو یہ تھی کہ کوئی دھکم پیل کر کے زیادہ نہ لے جائے جس سے کوئی مستحق محروم رہ جائے۔ دوسری یہ کہ جو زیادہ لے جائے گا وہ آگے مہنگا کر کے بیچنا شروع کر دے گا۔ یوسفؑ نے ایسا اہتمام فرمایا کہ ہر شخص آپؑ کے روبرو پیش کیا جاتا۔ آپؑ اجازت دیتے تو ایک شخص کو ایک بوجھ اونٹ (جو ہمارے وزن کے مطابق چھ یا سات من ہوتا ہے) غلہ فروخت کیا جاتا جو اس کے اپنے گھر کے لیے کافی ہوتا۔

یہی قاعدہ ہے کہ جب بازار میں چیزوں کی کمی ہو، جب کوئی چیز کم ہو جائے یا لوگوں کو دشواری ہو تو حکومت کو چاہیے کہ ان چیزوں پر کنٹرول کرے۔ اور ان کی تقسیم کا عادلانہ نظام بنائے۔ اقرباء پروری نہ کرے، سفارشیوں کو نہ دے بلکہ امیر غریب سب کو برابر تقسیم کرنے کا اہتمام کرے۔ غلہ تو اس وقت دور دور تک نہیں ملتا تھا لہٰذا آپؑ کی بہت شہرت ہوئی۔ یہ بات عام ہوئی کہ شاہِ مصر نے تو گودام بھر رکھے ہیں اور اپنی رعیت کو غلہ دے رہے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے بھائی فلسطین کے ایک شہر کنعان میں رہتے تھے۔ آج بھی اسرائیل میں وہ شہر 'الخلیل' کے نام سے آباد ہے۔ آج اس شہر کو کوئی کنعان نہیں کہتا۔ لیکن 'الخلیل' وہی شہر ہے۔ وہاں تک بھی شہرت پہنچی کہ قحط تو وہاں بھی تھا۔ تو یعقوبؑ نے بیٹوں سے فرمایا کہ سنا ہے بادشاہ بہت نیک انسان ہے، بڑا غریب پرور، بہت کریم ہے۔ پورے ملک کو غلہ فراہم کر رہا ہے۔ ہم بھی اس کی سرحد کے ساتھ ہی ہیں۔ گو ملک دوسرا ہے لیکن مصر کی اور ہماری سرحدیں مل رہی ہیں تو تم بھی جا کر قسمت آزمائی کر لو۔ وہ دس کے دس بھائی اونٹ لے کر چل پڑے۔

اللہ کریم کا اپنا نظام ہے بھائیوں نے تو یوسفؑ کو قتل کرنے کی کتنی ہی کوشش کی لیکن اللہ کریم نے یوسف علیہ السلام کو اس وقت خوشخبری دی جب وہ کنویں میں پھینک دیے گئے تھے کہ ایک روز یہی بھائی آپؑ کے سامنے دستِ سوال دراز کریں گے، اور آپ اس وقت تختِ سلطنت پر متمکن ہوں گے، فرمانروا ہوں گے۔ لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہاں سے پتا چلتا ہے کہ نبیؑ کو جو بات سمجھ آتی ہے وہ سو فیصد درست ہوتی ہے۔ اس میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ جو کشف ولی کو ہوتا ہے وہ کشف صحیح ہوتا ہے لیکن ولی میں وہ استعداد نہیں ہوتی جیسی نبیؑ میں ہوتی ہے۔ اور ولی کو وہ تحفظ بھی حاصل نہیں ہوتا جو نبیؑ کو ہوتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ ولی کشفاً دیکھتا ہے وہ نبیؑ کے کشف پر، نبیؑ کے ارشادات پر پیش کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے مطابق ہو تو صحیح ہے اس کے خلاف ہو تو سمجھنے والے کو غلطی لگی ہے۔ اللہ کریم نے جب یہ بشارت دی تو اس کی تکمیل میں چالیس برس لگ گئے۔ خبر تو بالکل صحیح

تھی اور بہت واضح بھی لیکن اپنے وقت پر پوری ہوئی۔

انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ ساتھیوں سمیت عمرہ کر رہے ہیں۔ صحابہ کرامؓ مکہ چھوڑ کر آئے تھے، مہاجرین بیت اللہ کی زیارت کو ترس رہے تھے، سب نے اصرار کیا کہ جب آپ ﷺ نے خواب دیکھا ہے تو وہ وحیِ الٰہی ہے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے لیکن راستے سے لوٹنا پڑا۔ اہل مکہ سے معاہدہ ہوا کہ عمرے کے لیے اگلے سال آئیں۔ تو دوسرے سال حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ ادا فرمایا۔ آپ ﷺ کا خواب تو سچا تھا لیکن وقت کا اندازہ اور تھا۔ آپ ﷺ پہلے سال تشریف لے گئے تو عمرہ نہ ہو سکا، حدودِ حرم سے واپس آنا پڑا اللہ کے ہر کام میں مصلحتیں ہوتی ہیں۔ اس کی اپنی مصلحتیں تھیں، حضور صلی ﷺ کا تشریف لے جانا، بیعت رضوان سے صحابہؓ کا سرفراز ہونا اور بے شمار انعامات کا ملنا یہ سب کچھ اس کی ایک مزید عطا تھی۔ اللہ کریم کا اپنا نظام ہے اور جو ہوتا ہے، وہ اللہ کریم کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے اوقات وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔

اب یہاں ارشاد تو ہو گیا کہ آپؑ کو اختیار و اقتدار ملے گا اور یہ بھائی دستِ سوال دراز کریں گے کہ آپؑ ان کو یہ باتیں یاد دلائیں گے کہ تم وہی ہو، جنہوں نے میرے ساتھ یہ زیادتی کی تھی۔ **وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ** وہ شاہی دربار میں پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا لیکن وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔ کہاں وہ بچہ جسے انہوں نے غلام بنا کر بیچ ڈالا تھا اور کہاں ایک کڑیل جوان، چالیس پینتالیس سالہ خوبصورت شہنشاہِ مصر۔ ایک وسیع سلطنت کا حکمران، تو نگاہ کون اٹھائے گا اور رخِ انور کو کون دیکھے! وہاں تو ہر کوئی دست بستہ سرنگوں کھڑا تھا۔ تو آپؑ نے پوچھا کہ تم لوگ مجھے اہل مصر میں سے تو نہیں لگتے۔ تمہارا لباس وضع قطع مصر کی تو نہیں ہے۔ یہ غلّہ تو ہم سلطنت میں تقسیم کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا احوال سنایا کہ ہم فلسطین کے شہر کنعان کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں، وہ اللہ کے نبیؑ ہیں اور ہم ان کے صاحبزادے ہیں۔ ہم نبیؑ کے بیٹے ہیں اور انہوں نے ہمیں فرمایا ہے کہ شہنشاہِ مصر بہت کریم ہے۔ اس کے کرم کی شہرت دور دور تک ہے۔ تو تم بھی جاؤ، تمہیں محروم نہیں رکھے گا۔ اس لیے ہم حاضر ہو گئے ہیں۔ آپؑ نے حکم فرمایا کہ ان سب کو ایک ایک اونٹ غلّہ دے دو۔ تو وہ کہنے لگے ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے۔ ہم گیارہ بھائی ہیں اور والد ماجد ہیں۔ آپؑ ہم پر کرم کیجیے۔ اس بھائی کا حصہ بھی دے دیجیے کہ اگر ہم اپنے حصے سے بانٹ کر اسے دیں گے تو ہمیں کم پڑ جائے گا۔ ہمارا ایک اور بھائی بھی ہے جو جنگل میں کھو گیا تھا، پھر وہ ملا نہیں، تو والد گرامی نے اس کی یاد میں رو رو کر آنکھیں اندھی کر لی ہیں۔ بڑے پریشان ہیں۔ اس لیے ہمارے بھائی کو انہوں نے اپنے پاس روک لیا ہے تو آپؑ ہمیں اس کا حصہ بھی دے دیں۔

یوسفؑ نے فرمایا کہ ایسا کرنا قانون کی خلاف ورزی ہے۔

یوسف علیہ السلام نے اس طرح بہانے سے یعقوب علیہ السلام کا سارا احوال بھی سن لیا، بھائی کی خیریت بھی سن لی اور فرمایا یہ تو قانون کے خلاف ہے۔ چونکہ قانون یہ ہے کہ جو یہاں آئے گا، وہ اپنے حصے کا ایک اونٹ غلہ لے جائے گا۔ اگر تمہارا ایک اور بھائی ہے تو تم پھر آجاؤ، اسے بھی ساتھ لے آنا۔ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جب ان کے لیے اونٹوں کا بوجھ تیار ہو گیا اور انہیں غلہ مل گیا تو فرمایا، قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ جو بھائی والد گرامی کے پاس چھوڑ آئے ہو، اسے ساتھ لے کر آؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہم ہر ایک کو پورا پورا بہترین حساب سے عطا کرتے ہیں۔ کسی کا حصہ اسے دینے میں کمی نہیں کرتے اور آنے والوں کی مہمانداری بھی کرتے ہیں۔ یہ چونکہ باہر سے آئے تھے، چنانچہ انہیں شاہی مہمان کے طور پر شاہی مہمان سرائیں ٹھہرایا گیا اور جتنا دو چار دن انہیں رکھنا تھا، ان کی بڑی خدمت کی۔ فرمایا دیکھو! تم سلطنت سے باہر سے آئے تھے پھر بھی ہم نے تمہاری کتنی اچھی میزبانی کی، تمہاری خدمت کی۔ پھر تم میں سے ہر ایک کو جتنا اونٹ کا بوجھ مقرر ہے، اتنا اتنا غلہ دیا۔ اب تم کہتے ہو تمہارا ایک بھائی اور بھی ہے تو پھر اسے ساتھ لے آؤ، اسے بھی غلہ دے دیں گے اور تمہیں بھی۔ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ اور اگر تم اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ تمہارا بھائی ہے ہی نہیں اور تم نے جھوٹ بولا ہے۔ اس غلے کی بجائے اس جھوٹ کے جرم میں سزا پاؤ گے۔ جیل میں بند کر دیے جاؤ گے۔ لہٰذا اگر واقعی تمہارا کوئی اور بھائی بھی ہے تو اسے ساتھ لے آؤ۔ نہیں ہے تو اب دوبارہ نہ آنا، ورنہ گرفتار کیے جاؤ گے۔ اب جو پونجی وہ غلہ خریدنے کے لیے لائے تھے، وہ یعقوب علیہ السلام نے کچھ نقدی دی تھی اور باقی گھر کی بہوؤں کے زیورات ساتھ دیے تھے کہ اس کے عوض غلہ لے آؤ۔ یوسف علیہ السلام کو یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ والد گرامی نے جو میرے بھائیوں کی بیویوں اور بچیوں کے زیورات دیے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے گھر میں یہی سرمایہ تھا۔ انہوں نے سوچا اگر یہ ہم رکھ لیں تو ان کے پاس دوبارہ آنے کے لیے کوئی زادِ راہ، کوئی سرمایہ بھی نہیں ہو گا تو پھر یہ دوبارہ کیسے آسکیں گے؟ نبیؑ کی اولاد ہیں، کچھ تو ان کا معیار ہو گا۔ پھر یہ خالی ہاتھ تو نہیں آئیں گے۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ (٦١) کہنے لگے ہم والد گرامی سے گزارش کریں گے، ان کی منت سماجت کریں گے اور اصرار کریں گے۔ بہت کوشش کریں گے کہ ہم بھائی کو لے آئیں وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ اور ہم بھائی کو لے آئیں گے۔ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (٦٢) یوسف علیہ السلام نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ جو پونجی یہ لائے ہیں اسے ان کے

سامان میں رکھ دو۔ جب اپنا سرمایہ واپس پائیں گے تو انہیں خوشی ہوگی اور واپس جا کر جب اپنا سرمایہ ملے گا تو آخر نبی زادے ہیں۔ شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھیں گے۔ پھر ضرورت مند بھی ہیں اور مزید غلّہ بھی لینا ہوگا۔ جب انہیں سرمایہ ملے گا تو امید ہے ضرور واپس آئیں گے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام یہ سب کچھ وحیٔ الٰہی سے کر رہے تھے۔ ورنہ انہیں والد کے بارے تشویش بھی تھی کہ بھائیوں سے بھی ان کا حال سن چکے تھے کہ برسوں رونے سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئی ہیں، اس لیے انہوں نے بن یامین کو اپنے پاس سہارے کے لیے روک لیا ہے۔ یہ بات بھی یعقوب علیہ السلام پر بڑی شاق گزرنے والی تھی کہ بن یامین بھی جدا ہو جائے۔ لیکن اللہ کی مرضی، وہ ان پر مزید بوجھ ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کے درجات اور بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ اللہ کی مرضی، وہ کس طرح سے اپنے بندوں پر کیسی کیسی آزمائش ڈالنا چاہتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کیا عطا فرماتے ہیں۔ آزمائش بہت بڑی بھی ہو تو اس کی عطا کے مقابلے میں بڑی چھوٹی ہوتی ہے۔ جو وہ عطا کرتے ہیں، وہ اس سے کروڑوں گنا زیادہ ہوتا ہے۔ تو یہ اللہ کی مرضی۔

یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ والد گرامی پر دُکھ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹے گا۔ لیکن اللہ کا حکم تھا۔ آپؑ نے تدبیر کی اور انہیں رخصت کیا۔ فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ پہلی بات انہوں پہنچتے ہی والد گرامی سے یہ کہی۔ اونٹوں کو بٹھایا، بوجھ اتارا، ابھی غلّہ کھول کر نہیں دیکھا، پہلے والد گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنی واپسی کی اطلاع دی، غلّہ ملنے کی اطلاع دی اور بادشاہ کے کرم کے قصے سنائے۔ بادشاہ کی مہمانداری کی بہت تعریف کی۔ کہنے لگے، لیکن ایک بات ہے ہم نے تو بن یامین کا غلّہ بھی مانگا تھا کہ ہمارا خاندان بہت بڑا ہے۔ یہ دس اونٹ غلّہ تو ایک ہفتے کے لیے بھی کافی نہیں۔ پھر مصر اور فلسطین میں بڑا فاصلہ ہے۔ آنے جانے میں بڑا وقت لگ جاتا ہے لیکن بادشاہ نے فرمایا کہ یہاں جو آدمی خود حاضر ہوتا ہے، اس کو ایک اونٹ کا بوجھ غلّہ ملتا ہے، لہٰذا تم دس حاضر ہو تو دس اونٹ لے جاؤ۔ اگر گیارھواں بھائی ہے تو اسے ساتھ لے آؤ۔ اور پھر بادشاہ نے حکم بھی دیا ہے کہ اگر بھائی کو ساتھ نہ لائے تو تمہارا غلّہ بھی بند ہے۔ پھر آنے کی تکلیف نہ کرنا کہ ہم تمہیں جھوٹا خیال کریں گے کہ تمہارا کوئی گیارھواں بھائی نہیں ہے، اگر ہوتا تو تم لے آتے۔ اگر جھوٹ بولا ہے تو تمہیں جھوٹ کی سزا ملے گی۔ پھر یہاں نہ آنا، پکڑے جاؤ گے۔ ہمارا تو غلّہ بھی بند ہو گیا ہے اور یہ تو چند ہفتوں میں ختم ہو جائے گا، پھر کیا کریں گے۔ لہٰذا ہم غلّہ لینے دوبارہ جاتے ہیں، آپ بن یامین کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہم اس کی حفاظت کا حق ادا کریں گے۔ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ ہم دس بھائی ہیں، کڑیل جوان ہیں، ہم بن یامین کو حفاظت سے لے جائیں گے اور محفوظ واپس لے آئیں گے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا تم کڑیل

جوانوں کی حفاظت تو میں پہلے دیکھ چکا۔ تم نے یہی بات کی تھی کہ نَحْنُ عُصْبَةٌ ہم ایک پوری جماعت ہیں۔ پھر یوسفؑ کے معاملے میں تم نے کیا کیا، تمہاری وہ جماعت کہاں گئی اور تمہاری جوانی کی طاقت کس کام آئی؟

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ تم سمجھتے ہو کہ اب میں پھر تمہارے اسی دعوے پر اعتبار کرلوں گا جو تم اس کے بھائی یوسفؑ کے معاملے میں پہلے کر چکے ہو۔ تمہاری جماعت اور تمہاری طاقت تو میں آزما چکا ہوں۔ آزمائے ہوئے کو آزمانا ضروری نہیں۔ ہاں! فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۶۴) میں اللہ کے بھروسے پر ایسا کر سکتا ہوں۔ وہ بہترین حفاظت فرمانے والا ہے اور بہترین رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے بھروسے پر تو بھیج سکتا ہوں۔ تمہارے بھروسے والی بات ختم ہوگئی۔ تم تو آزمائے جا چکے۔ اس لیے تمہیں دوبارہ آزمانے کی کیا ضرورت! اگر بھیجا تو اللہ کریم کے بھروسے پر بھیج دوں گا کہ وہ بہترین رحم کرنے والا ہے۔

یہ لوگ والد گرامی سے باتیں بھی کر رہے تھے، ساتھ ساتھ غلے والی بوریاں بھی کھول رہے تھے۔ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ بوریاں کھولتے کھولتے ایک بوری کھولی تو اس میں ان کا سرمایہ ایک پوٹلی کی شکل میں مل گیا، وہ حیران ہوگئے۔ کہنے لگے قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا والد محترم دیکھیں! بادشاہ کتنا کریم ہے۔ اس نے دس اونٹ غلہ بھی ہمیں عطا کر دیا اور جو سرمایہ آپؑ نے ہمارے ہمراہ کیا تھا، وہ بھی لوٹا دیا ہے۔ دیکھیں! یہ سب بوری سے نکل آئے ہیں۔ نہ صرف ہمارا سرمایہ واپس کیا ہے بلکہ ہماری بہت مہمانداری کی، بہت عزت افزائی کی۔ ہمیں اپنے دربار میں بلوایا، ہم سے باتیں کیں، ہم سے سارے حالات دریافت کیے۔ اب اگر ہم بھائی کو نہیں لے کر جاتے تو بادشاہ کی بات سچی ہوگی اور ہم جھوٹے قرار پائیں گے۔ یہ غلہ تو چند دن میں ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ مہربانی فرمائیں اور بن یامین کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ (۶۵) بادشاہ نے تو آپ کے بارے میں کہا ہے کہ میں انہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا، وہ ضعیف العمر ہیں، ان کی بینائی بھی نہیں رہی، اس لیے ان کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ میں تمہیں زائد دوں گا۔ یہ جو غلّہ ہم لائے ہیں، جلد ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمیں چند دنوں میں روانہ ہو جانا چاہیے۔ یہ غلّہ ختم ہونے سے پہلے دوسرا لے آئیں۔ تو آپؑ مہربانی فرمائیں، بھائی کو ہمارے ساتھ کر دیجیے۔

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری بات تو میں پہلے دیکھ چکا، آزما چکا۔ ہاں! ایک بات ہے قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ کہ تم اللہ کے نام پر میرے ساتھ معاہدہ کرو مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ، اللہ کو گواہ بنا کر میرے ساتھ عہد کرو کہ تم بہر حال میرے بیٹے کو واپس لاؤ گے، سوائے اس کے کہ کوئی ایسی مصیبت آجائے جو تمہارے بس سے باہر ہو۔ تم سب کو ہی قید کر لیا جائے، کوئی تمہارا راستہ

روک لے۔ تو پھر سارے ہی نہ ہوں تو وہ الگ بات ہے، لیکن پہلے کی طرح نہ کرنا کہ تم سب تو خیریت سے گھر آ گئے اور بقول تمہارے، یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا۔ اب ایسے نہ کرنا کہ تم واپس گھر آ جاؤ اور کہو کہ بن یامین قید ہو گیا۔ اس طرح کے بہانے نہیں چلیں گے۔ جہاں تک تمہارا بس چلے گا تم بھائی کو ساتھ لاؤ گے اور اس پر اللہ کو گواہ بناؤ۔ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ، اللہ کی قسم کھا کر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنی پوری طاقت، اپنی پوری قوت، پوری دیانت صرف کرو گے فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ چنانچہ انہوں نے اللہ کی قسم کھا کر عہد کیا کہ ہم ہر طرح سے بن یامین کی حفاظت کریں گے اور اپنے ہمراہ واپس بھی لائیں گے۔ ہاں! اگر کوئی ایسی مصیبت پڑ جائے کہ معاملہ بس سے باہر ہو، ہم خود بھی روک لیے جائیں اور واپس نہ آسکیں تو پھر آپؑ ہمیں معاف کیجیے گا، ورنہ ہم ضرور لائیں گے۔ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ (٦٦) انہوں نے فرمایا ہمارا جو معاہدہ ہوا ہے اس پر اللہ گواہ ہیں۔ اللہ ہی کی ذات قادر ہے کہ وہ اس کو پورا کریں اور تم خیریت سے آ جاؤ۔

اسبابِ ظاہری کی اہمیت:

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا، وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ اے میرے بیٹو! سب ایک ہی دروازے سے داخل مت ہونا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے داخل ہونا۔

یہاں یہ واضح ہوا کہ شریعت کے اندر رہ کر تدبیر کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ خلافِ شریعت تدبیریں کرنا درست نہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ تم گیارہ بھائی، خوبصورت کڑیل جوان ہو اور بادشاہ کا قرب بھی تمہیں نصیب ہوا۔ لوگوں کو پتا ہے کہ بادشاہ نے تم سے بالمشافہ باتیں کیں، تمہیں اپنا شاہی مہمان رکھا۔ گیارہ بندے بھی ایک پوری جماعت ہوتے ہیں۔ تم کسی ایک دروازے سے داخل ہوئے تو شہر میں تمہارے حاسد پیدا ہو جائیں گے۔ اور یہاں بھی جن لوگوں نے سنا، وہ حسد کریں گے۔

پھر نظر بد بھی ہوتی ہے۔ اتنے جوانوں کو دیکھ کر کسی کے دل میں حسد پیدا ہو، اور ان کی نظر بد سے کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچے لہٰذا يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ جب شہر پہنچو تو سارے کا سارا جتھا کسی ایک دروازے سے داخل نہ ہونا وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ مختلف دروازوں سے ایک ایک، دو دو کر کے داخل ہونا اور پھر شہر میں اکٹھے ہو جانا۔ یہ تجویز فرمانے کے بعد فرمایا، وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اگر اللہ کی طرف سے کوئی حادثہ پیش آنے والا ہے تو اسے نہ میں روک سکتا ہوں، نہ تم۔ لیکن حفاظت کے لیے تدبیر کرنا بہر حال اچھی بات ہے۔

نظر بد اور علاج:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے کہ نظر بد نوجوان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں دھکیل سکتی ہے۔ علمائے نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ نظر بد کیا ہے۔ آسان سا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح موسم گرم یا سرد ہوتا ہے اور بندے پر اثرانداز ہوتا ہے، جس طرح غذا سے ہماری صحت متاثر ہوتی ہے ایسے ہی جس کی نظر ہے، اس کے دل کے اندر کا جو حال ہے، اس کے دماغ کی جو سوچ ہے، وہ ایک تخیل ہے کہ کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ کر حسد پیدا ہوتا ہے، یا دماغ میں جو ایک غبار سا آتا ہے تو وہ اس کی نظر کے راستے اس چیز کو متاثر کرتا ہے۔ بعثت عالی کے وقت عرب میں تو یہ بطور فن رائج تھا۔ جس چیز کو دیکھتے، اسے تباہ کر دیتے۔ ایسے لوگ ہر معاشرے میں، ہر زمانے میں ہوتے ہیں اور نظر بد کی مثالیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ عرب تو اس پر سخت محنت کرتے تھے اور نظر لگانے والے کو الگ کمرے میں رکھتے، اسے بھوکا پیاسا رکھتے کہ جب آدمی کا پیٹ نہیں بھرتا تو جو اس کی باطنی قوتیں ہیں، وہ قوی ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہندو جوگی وغیرہ جو شعبدے کرتے ہیں، اس میں بھی یہی اصول کارفرما ہوتا ہے۔ وہ بھوکے پیاسے رہ رہ کر ایسی قوتیں حاصل کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں نے تو ارادتاً ایسا منصوبہ بنایا کہ جن لوگوں کی نظر لگتی تھی، ان کو مہینہ بھر بند رکھا جائے اور اس ریاضت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کر دیا جایا جائے۔ ان کی نظر لگے اور (معاذ اللہ) یہ قصہ ختم ہو جائے، یعنی یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑ جائیں، یا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ وَاِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ (القلم: 51) اللہ کریم فرماتے ہیں، یہ ارادہ کرتے ہیں کہ یہ اپنی بدنگاہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجروح کر دیں۔

یہ انسان کے تخیل کی ایک صلاحیت ہے۔ جب کسی دوسرے کے پاس نعمت دیکھ کر اس کے دل میں ایک حسرت کی ہوک اٹھتی ہے۔ جس طرح موسم کا یا غذا کا اثر ہو جاتا ہے، اسی طرح اس تخیل کا بھی اثر ہو جاتا ہے جو اس چیز کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ نظرِ بد سے بچنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کی اچھی چیز دیکھ کر اس کے لیے برکت کی دعا کی جائے اور کہا جائے ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں نواسوں (حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ) پر یہ کلمات پڑھ کر دم فرماتے تھے۔ اُعِیْذُ بِكَلِمٰتِ اللهِ التَّآمَّةِ مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ وَّهَامَّةٍ وَّ مِنْ كُلِّ عَیْنٍ لَّامَّةٍ۔ میں تمہیں اللہ کے پورے کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں، ہر شیطان کے اثر سے اور ڈسنے والے ہر زہریلے کیڑے

سے اور لگنے والی نظر بد سے۔ (جامع ترمذی۔ سنن ابوداؤد)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تم گیارہ کڑیل جوان ہو، بہترین اونٹ تمہارے پاس ہیں۔ پھر شہر والوں کو یہ پتا ہے، کہ سب آنے والوں کی تحقیق تو بادشاہ کے عمال اور خدام کرتے ہیں، کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو۔ پھر ہر ایک کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ مقرر ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہاری پڑتال تو خود بادشاہ نے کی، تم سے باتیں کیں اور پھر تم پر مہربان ہوئے۔ دو چار دن تمہیں شاہی مہمان بھی رکھا اور پھر تمہیں غلہ بھی عطا کر دیا۔ تو لوگوں میں حسد بھی ہو گا، یہ حسرت بھی آئے گی کہ اتنی دور سے آنے والوں کی بادشاہ نے اتنی عزت کی، تو کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے یا کوئی اور مصیبت نہ آ جائے۔ تو ایسا کرنا کہ متفرق دروازوں سے ایک ایک، دو دو کر کے داخل ہونا۔ پھر فرمایا یہ ایک تدبیر ہے جو میں کر رہا ہوں لیکن اللہ کی طرف سے اگر کوئی مصیبت آنے والی ہو تو میں اسے روک نہیں سکتا وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اگر اللہ کی طرف سے مصیبت آ جائے تو میں اس کو نہیں روک سکتا۔ ہاں! تدبیر کرنے کی اجازت ہے اور میں تدبیر کر رہا ہوں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یقیناً ہوتا تو وہی ہے جس کا فیصلہ اللہ کریم کرتے ہیں۔ کسی کی نظر نیک ہو یا بد، کوئی طاقتور ہو یا کمزور، کوئی حکمران ہو یا مفلس، اللہ کے حکم کو کوئی نہیں روک سکتا۔ جو فیصلہ اس کی بارگاہ سے صادر ہوتا ہے، وہی نافذ ہوتا ہے۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ چنانچہ میں اسی کے بھروسے پر تمہیں بھیج رہا ہوں۔ میرا بھروسہ بھی اسی پر ہے اور جو اس کی طرف سے ہو گا، وہی بہترین ہو گا۔ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ﴿۶۷﴾ وہ واحد لاشریک ہی ایسی ذات ہے جس پر بھروسہ کرنے والے بھروسہ کرتے ہیں۔

تدبیر سُنّت ہے، تقدیر اللہ کی طرف سے ہے:

ارشاد ہوتا ہے وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ جب وہ اسی طرح شہر میں داخل ہوئے، جس طرح ان کے والد گرامی نے انہیں حکم دیا تھا کہ ایک دروازے سے سب نے داخل نہیں ہونا، تو وہ متفرق دروازوں سے بکھر کر داخل ہوئے مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لیکن ان کی یہ تدبیر انہیں اس آنے والی مصیبت سے بچا نہ سکی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی توجہ کا مرکز بن یامین تھا، اب اللہ کریم کا فیصلہ آ گیا کہ بن یامین بھی ان سے دور کر دیا جائے۔ اللہ کے دونوں نبیؑ ہیں، یعقوب علیہ السلام بھی اور یوسف علیہ السلام بھی۔ نہ یوسفؑ کو ان کی خبر تھی، نہ یعقوبؑ کو اُن کی خبر تھی۔ برسوں گزر گئے۔ جب اللہ نے چاہا تو یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے وسیلے سے خبر پہنچا دی، لیکن ابھی یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنا آپ بھائیوں پر ظاہر کرتے اور یہ خوشخبری والد گرامی تک بھی جاتی۔ انہیں نہیں بتایا۔ ان پر ابھی مزید آزمائش آنا تھی اور ان کے درجات مزید بلند ہونے تھے۔ بن یامین کو بھی

ان سے جدا ہونا تھا۔ تو فرمایا، وہ داخل اسی طرح سے ہوئے جیسے ان کے والد گرامی نے حکم دیا تھا۔ لیکن وہ تدبیر انہیں اللہ کا فیصلہ نافذ ہونے سے بچا نہ سکی۔ اِلَّا حَاجَةً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰىهَا ہاں! یعقوب علیہ السلام کے دل میں ایک خیال آیا کہ حفاظت کی تدبیر کرنی چاہیے اور وہ انہوں نے پورا کرلیا۔ اور اللہ نے یہ حق انہیں دیا تھا کہ شرعی حدود کے اندر رہ کر حفاظتی تدابیر کرنا سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔

علمِ لدُنّی:

وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ اور یعقوب علیہ السلام کوئی عام آدمی نہیں تھے، وہ بہت بڑے ذی علم تھے اور آپ کا علم ایسا تھا جو ہم نے انہیں عطا کیا تھا۔ وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ وہ بڑے صاحب علم تھے۔ لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ اس لیے کہ ہم نے انہیں علم دیا تھا۔ جو علم بغیر کسی واسطے کے، بغیر ظاہری دنیوی سبب کے اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے، اسے علمِ لدُنّی کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الکھف میں ارشاد ہے وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا (الکھف:65) کہ ہم نے خضر علیہ السلام کو اپنی جانب سے علم عطا کیا تھا۔ جو بات علمِ لدُنّی کے ذریعے عطا ہوتی ہے، اس میں خطا نہیں ہوتی، اس میں دھوکا نہیں لگتا، اس کے خلاف نہیں ہوتا۔ جو علم اختیاری طور پر ہم دنیا میں سیکھتے ہیں، ان میں بڑے سے بڑے سائنسدان کو، بڑے سے بڑے مؤرخ، ادیب یا شاعر کو غلطی لگ سکتی ہے۔ ادیب پھر اپنے مضامین کی اصلاح کرتا ہے۔ شاعر شعر کہنے کے بعد کئی دفعہ اس میں تبدیلیاں کرتا ہے۔ بڑے بڑے ماہر قانون دان، قوانین بنانے کے بعد ان میں تبدیلیاں کرتے ہیں۔ جب تجربہ کرتے ہیں تو ان میں خامیاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ترامیم پیش کی جاتی ہیں۔ سائنسدان بڑی تحقیق کے بعد کسی چیز کے بارے ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد اس فیصلے کی تردید آجاتی ہے۔ تو دنیوی علوم جو ہم خود کوشش کرکے حاصل کرتے ہیں، ان میں تو غلطی بھی لگ سکتی ہے۔

فرمایا یعقوب علیہ السلام کے علوم میں نہ کوئی غلطی تھی، نہ دھوکا لگنے کا امکان تھا اور وہ بڑے صاحب علم تھے وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ ان کا علم غلطی سے پاک تھا، اس لیے لِّمَا عَلَّمۡنٰهُ کہ وہ علم ہم نے انہیں عطا کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دیکھ لیجیے کہ علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ جو باتیں وہ بتانا چاہتا ہے، بتا دیتا ہے جو نہیں بتانا چاہتا، اس کی ٹن گن نہیں ملتی۔ اتنا عرصہ نہ یوسف علیہ السلام کو پتا چلا کہ والد گرامی کا کیا حال ہے نہ یعقوبؑ کو پتا چلا کہ یوسفؑ کہاں گئے۔ کنویں میں پھینکے گئے یا بک گئے، کہاں ہیں؟ کچھ پتا نہیں چلا۔ آپؑ صاحب علم تھے اور یہ امید ضرور تھی کہ یوسفؑ ضائع نہیں ہوں گے۔ مجھ سے ملیں گے اور حکمران بھی بنیں گے، نبیؑ بھی مبعوث ہوں گے۔ یہ سارا آپؑ کے علم میں تھا۔ لیکن وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوبؑ کو نہیں بتایا، اس کی اپنی مرضی۔ یوسف علیہ السلام کو حکومت

دے دی، ریاست بھی دے دی، بادشاہت دے دی اور بھائیوں کو ان کے سامنے سائل بنا کر کھڑا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور یوسف علیہ السلام کو والد ماجد کی حالت اور بھائی کی موجودگی اور گھر کے سارے حالات کا پتا چل گیا۔ لیکن یعقوب علیہ السلام کو ابھی تک کوئی خبر نہیں ہو سکی۔ حالانکہ وہ بہت بڑے صاحبِ علم تھے اس لیے کہ یہ سارا علم اللہ کریم کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

اطلاع عن الغیب:

انبیاء علیہم السلام کو جو مغیبات ہوتے ہیں، اسے اطلاع عن الغیب کہتے ہیں کہ غیبی امور پر نبیؑ کو مطلع کر دیا جاتا ہے اور نبیؑ کے اتباع میں نبیؑ کے اُمتی کو، کسی صحابیؓ، تابعیؒ، تبع تابعیؒ، کسی ولی کو کشف ہو اور اللہ کی طرف سے کچھ علم عطا ہو، یہ محض اللہ کی عطا ہوتی ہے۔ یہ علم غیب نہیں ہوتا۔

علمِ غیب:

علمِ غیب وہ ہے جو بغیر کسی ذریعے کے جانا جائے اور یہ اللہ کریم کے ساتھ مختص ہے۔ وہ بغیر کسی ذریعے کے خود جانتا ہے، ذاتی طور پر جانتا ہے۔ کوئی مخلوق نہ اس کی ذات میں شریک ہے، نہ صفات میں شریک ہے۔ ذات میں بھی وہ واحد لاشریک ہے اور صفات میں بھی یکتا ہے۔

چنانچہ یہ ایک تدبیر تھی جو یعقوب علیہ السلام کے دل میں تھی، سو انہوں نے کر لی کہ بن یامین کی واپسی ضرور ہو سکے۔ لیکن اب اگر اللہ تعالیٰ بن یامین کو اُن سے جدا کرنا چاہتے ہیں، تو اُن کی مرضی۔ یہ تدبیریں اللہ کے فیصلے کو روک نہیں سکتیں۔ ہاں! تدبیر کرنا اچھی بات ہے۔ یہ بات نہیں کہ یعقوب علیہ السلام کے علم میں کوئی کمی تھی **وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ** یقیناً وہ بہت بڑے صاحبِ علم تھے **لِّمَا عَلَّمْنٰهُ** اس لیے کہ ہم نے انہیں علوم کے خزانے عطا فرمائے تھے **وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ**(۶۸) لیکن لوگوں کی اکثریت ان حقائق سے بے خبر رہتی ہے۔ وہ انبیاء و رسل علیہم السلام کو بھی ایک عام آدمی یا اپنے جیسا آدمی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کو بھی اپنے جیسا یا اپنے سے بھی کمتر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ عوام کو ان چیزوں کا علم نہیں ہوتا، وہ ان باتوں کا ادراک نہیں رکھتے۔

سورۃ یوسف رکوع 9 آیات 69 تا 79

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِىْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِىْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ قَالُوْۤا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِىْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

اور جب یہ لوگ یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے (حقیقی) بھائی کو

اپنے پاس جگہ دی فرمایا یقیناً میں تمہارا بھائی یوسف (علیہ السلام) ہوں، جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں سو اس کا رنج مت کرنا ﴿۶۹﴾ پھر جب انہوں (یوسف علیہ السلام) نے ان کا سامان تیار کر دیا تو پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو! تم تو چور ہو ﴿۷۰﴾ اور وہ ان (تلاش کرنے والوں) کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کون سی چیز گم ہو گئی ہے؟ ﴿۷۱﴾ انہوں نے کہا ہم کو شاہی پیالہ نہیں مل رہا اور جو شخص اس کو لے آئے گا اس کو ایک اونٹ کا بوجھ (غلّہ) ملے گا اور میں اس بات کا ضامن ہوں ﴿۷۲﴾ کہنے لگے اللہ کی قسم بے شک تم خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں اس لیے نہیں آئے کہ خرابی کریں اور نہ ہی ہم چور ہیں ﴿۷۳﴾ انہوں نے کہا اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو اس (چوری) کی سزا کیا ہو گی؟ ﴿۷۴﴾ کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جس شخص کے سامان میں وہ پایا جائے پس وہی اس کا بدلہ قرار دیا جائے، ہم غلط کاروں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں ﴿۷۵﴾ پھر انہوں (یوسف علیہ السلام) نے اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ان کے اسباب سے تلاش شروع کی پھر اپنے بھائی کے اسباب سے اسے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف (علیہ السلام) کے لیے تدبیر کی۔ وہ اپنے بھائی کو بادشاہ (مصر) کے قانون کے مطابق نہیں لے سکتے تھے سوائے اللہ کی مرضی کے۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند فرماتے ہیں اور تمام علم والوں سے بڑھ کر ایک علم والا ہے ﴿۷۶﴾ انہوں (برادرانِ یوسفؑ) نے کہا اگر اس نے چوری کی تو بے شک اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی۔ پس یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اسے ان پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ (دل میں) فرمایا کہ تم (اس معاملہ میں) بہت ہی برے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ بہت بہتر جانتے ہیں ﴿۷۷﴾ وہ کہنے لگے اے عزیز (عزیزِ مصر)! بے شک اس کے والد بہت بوڑھے (بزرگ) ہیں سو اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجیے۔ بے شک ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں ﴿۷۸﴾ انہوں نے فرمایا اللہ کی پناہ! جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے علاوہ کسی اور کو پکڑ لیں، ایسا کریں تو

ہم ضرور بڑے بے انصاف ہوں گے ﴿۷۹﴾

تفسیر و معارف

جب وہ سارے بھائی یوسفؑ کی خدمت میں پہنچے تو آپؑ نے اپنے حقیقی بھائی بن یامین کو اپنے پاس بلایا اور اسے بتایا اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْكَ میں تمہارا بھائی یوسفؑ ہوں۔ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اگر ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی بھی کی ہو تو اس کی پروانہ کرو، اسے بھول جاؤ۔ اب تم میرے پاس پہنچ چکے ہو۔ جب سب کو غلّہ دینے کی باری آئی تو سب کو ایک ایک اونٹ غلّہ دے دیا اور حسب وعدہ ایک زائد بھی دے دیا۔ لیکن جب ان کا سامان تیار ہو گیا تو پانی پینے کا ایک برتن جسے ان کی زبان میں سقایہ کہتے تھے اور جس سے غلّہ ناپ کر دیا جا رہا تھا اور وہ شاہی پیمانہ بہت قیمتی تھا، اسے ملازمین سے کہہ کر بن یامین کے سامان میں رکھوا دیا۔ آپؑ جانتے تھے کہ والد گرامی کی حالت کیسی ہے، وہ کتنے دُکھی ہیں اور رو رو کر پہلے ہی بینائی ضائع کر چکے ہیں، آنکھیں سفید ہو چکی ہیں اور بن یامین کو وہ ساتھ رکھتے ہیں جس سے ان کے دل کو سہارا ملتا ہے۔ اگر یہ سہارا بھی جاتا رہا تو نہ جانے ان کے دل پر کیا گزرے، لیکن جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اللہ کریم ان کے درجات اور بلند کرنا چاہتے تھے۔ مزید آزمائش مقصود تھی تو بحکم الٰہی حضرت یوسفؑ نے یہ سب اہتمام کیا کہ وہ شاہی پیمانہ بن یامین کے سامان میں چھپا دیا گیا۔

چنانچہ جب قافلہ روانہ ہوا اور ان کے بھائی سامان سے لدے اونٹوں کو لے کر نکلے تو اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ تو کسی نے پیچھے سے پکارا اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ کہ اے قافلے والو! تمہارے ذمے تو چوری لگ رہی ہے تم نے چوری کی ہے۔ انہیں یہ بات بہت عجیب لگی۔ اگر یوسفؑ سے زیادتی کی تھی تو گو وہ بھی غلط کیا تھا مگر اس کا محرک باپ کی محبت، نبیؑ کی محبت تھا۔ لیکن چوری کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خاندانِ نبوت کے افراد تھے۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے، ہم بھلا کیوں چوری کریں گے جبکہ بادشاہ نے اتنی عزت دی، غلّہ دیا اور پھر ہماری پونجی و سرمایہ بھی لوٹا دیا قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ وہ پلٹ کر کھڑے ہو گئے اور پوچھا تمہارا کیا کھویا ہے؟ کیا چوری ہوا ہے؟ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ انہوں نے کہا کہ وہ شاہی پیمانہ، جس سے ہم غلّہ ناپ کر دیتے تھے، وہ چوری ہو گیا ہے۔ اور وہ تو بہت قیمتی تھا۔ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ جو بھی اسے لوٹا دے گا، رضا کارانہ طور پر اسے واپس کر دے گا، اسے انعام میں ایک اونٹ بوجھ کا غلّہ مزید دیا جائے گا۔ اور جو اہلکار اس ذمہ داری پر مامور تھا، کہنے لگا کہ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اگر تم یہ پیمانہ واپس کر دو تو تمہیں ایک اونٹ کا بوجھ

غلہ زائد دیا جائے گا۔

شرعی مسئلہ:

یہاں مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ کسی کام پر جو شرعاً جائز ہو، انعام بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور کسی چیز کی ضمانت بھی دی جا سکتی ہے کہ یہ امر یقینی ہے میں اس کی ضمانت دیتا ہوں، جیسے یہاں اس نے کہا وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ﴿۷۲﴾ میں اس بات کا ضامن ہوں کہ تمہیں ایک اونٹ کا بوجھ غلہ زائد ملے گا۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ﴿۷۳﴾ وہ کہنے لگے تم جانتے ہو ہم مجبور ہو کر اپنی ضرورت کے لیے غلہ لینے آئے ہیں، زمین پر فساد برپا کرنے کے لیے نہیں آئے۔ اور ہم خاندانِ نبوت کے افراد ہیں، چور نہیں ہیں۔

فساد فی الارض اور اس کا علاج:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں سے اخذ ہوتا ہے کہ جو برائی کی جاتی ہے، لوگوں کے حقوق غصب کیے جاتے ہیں اس کے نتیجے میں روئے زمین پر فساد پیدا ہوتا ہے۔ فساد کی جگہ امن قائم کرنے کے لیے انصاف فراہم کرنا لازمی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرۃ:179) اے صاحبِ دانش لوگو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، انصاف میں زندگی ہے، عدل میں زندگی ہے۔ عدل کرو گے تو زندگی نصیب ہوگی۔ عدل نہیں کرو گے تو روئے زمین پر فساد ہوگا۔ مرتے بھی رہو گے، مارتے بھی رہو گے۔ ہمارے ہاں دھوکہ دہی، بے ایمانی کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ان باتوں سے فساد فی الارض ہوتا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح وطن عزیز میں قتل عام جاری ہے۔ قاتل یہ نہیں جانتا کہ وہ کس کو کیوں قتل کر رہا ہے؟ اور مقتول یہ نہیں جانتا کہ اس کا قاتل کون ہے اور کیوں اسے قتل کر رہا ہے؟

دہشت گردی کو روکنے کے لیے باتیں تو بہت کی جاتی ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ جب تک انصاف نہیں ہوگا، دہشت گردی نہیں روکی جا سکتی۔ پودے اگتے رہیں اور آپ یہ امید رکھو کہ ان پر پھل نہ آئے، تو یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر پودا ختم کر دیا جائے، انصاف کیا جائے، عدل کا نظام قائم کیا جائے تو امن قائم ہوگا۔

یوسفؑ کے بھائیوں نے بھی یہ اصول بتایا کہ ہم زمین پر فساد پیدا نہیں کرنے آئے کہ کسی کا مال ناجائز طور پر لے لیں، کسی کا حق مار لیں۔ اس کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوتا کہ ایک آدمی کا حق مارا گیا بلکہ زمین پر فساد پھیلتا ہے، امن تباہ ہوتا ہے۔ ہم اس ارادے سے ہرگز نہیں آئے کہ امن تباہ کریں۔ اور ہم خاندانِ نبوت کے افراد ہیں، ہم سے چوری کی توقع نہ کی جائے۔ تو شاہی خادم کہنے لگے قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ﴿۷۴﴾ اگر تم لوگ

جھوٹے ثابت ہو گئے تو سزا کیا ہوگی؟ مصر میں تو اگر چوری معمولی نوعیت کی ہوتی تو سزا تھی کہ چور کو مار پیٹ کر چھوڑ دیتے۔لیکن فلسطین میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور جس کا مال چراتا، پکڑا جانے پر اسے مال کے مالک کے سپرد کر دیا جاتا۔ وہ اس کا غلام بن جاتا۔ آپؑ کے خدام یہ بات جانتے تھے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں سمجھا دیا تھا اور خود حضرت یوسف علیہ السلام یہ کام حکمِ الٰہی سے کر رہے تھے۔ تو خدام ان کے بھائیوں سے کہنے لگے کہ اگر تم سے چوری پکڑی جائے تو ہم اپنے ملک کے قانون کے مطابق سزا نہیں دیں گے بلکہ تمہارے قانون کے مطابق جو سزا ہے وہ دے دیتے ہیں۔ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ انہوں نے کہا اگر کسی کے سامان سے وہ پیالہ پکڑا جائے تو ہماری شریعت کے مطابق وہ شخص آپ کے سپرد کر دیا جائے گا۔ پھر جو آپ چاہیں اس سے سلوک کریں، خدمت لیں یا غلام بنالیں۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (۰) ہماری شریعت میں غلط کاروں کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے۔ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ تو انہوں نے دوسرے بھائیوں کے سامان کی تلاشی سے ابتدا کی اور آخر میں بن یامین کے سامان تک پہنچے ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ تو جو پیالہ انہوں نے خود بن یامین کے سامان میں چھپایا تھا، برآمد کر لیا۔ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یوں ہم نے یوسفؑ کے ذریعے یہ تدبیر کی کہ مصر کے قانون کے مطابق تو معمولی سزا کے بعد چھوڑنا پڑتا، لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کے قانون کے مطابق وہ ان کے حوالے کیے جاتے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ یہ تدبیر یوسفؑ کے لیے ہم نے کی۔ اللہ کریم قادر ہیں، جو چاہیں کریں، لیکن دنیا عالم اسباب ہے اور اس کا نظام خود ذاتِ باری نے بنایا ہے۔ دنیا میں ہر کام اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسباب پر ہی مرتب ہوتا ہے۔ خود اللہ کریم نے بھی ترکِ سبب نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرماتے ہیں، وہ مسبب الاسباب ہیں۔ فرمایا ہم نے یوسفؑ کے لیے یہ تدبیر کی مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ ورنہ مصر کے شاہی قانون کے مطابق وہ بھائی کو روک نہیں سکتے تھے کیونکہ مصر میں چور کو مار پیٹ کی سزا کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم نے انہیں یہ تدبیر سکھائی اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور کام وہی ہوتے ہیں جو اللہ کریم کرنا چاہتے ہیں۔ اسباب کا ایک پردہ ضرور ہوتا ہے اور اکثریت کی نگاہ اسباب پر رہتی ہے۔

یوسفؑ جانتے تھے کہ وہ بھائی کو روک لیں گے اور بھائی سے ملاقات جہاں ان کے لیے بے حد مسرت کا باعث ہوگی، وہاں اس کی جدائی والدِ گرامی پر کتنی گراں گزرے گی۔ جبکہ والدِ گرامی ضعیف العمر ہیں اور بینائی بھی کھو چکے ہیں۔ ایسے میں بن یامین ہی ان کو سہارا دیتا ہے۔ اور والدِ گرامی کو اطلاع بھی نہیں دی جا سکتی جب تک اللہ کریم کی اجازت نہ ہو۔ اللہ کریم بتانا چاہیں تو ہی بتائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا والدِ گرامی کو اطلاع دی، نہ بھائیوں کو بتایا۔ انہوں نے بھائی کو تو روک لیا، فرمایا، نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اللہ کی طرف سے اس کے بندوں پر جو آزمائشیں آتی ہیں وہ

ترقی درجات کے لیے آتی ہیں۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں۔ بن یامین پر الزام آیا تو انہیں بھائی کی محبت بھی نصیب ہوگئی۔ اگر چہ یعقوبؑ سے بن یامین بھی جدا ہو گئے لیکن ان کے درجات بہت بلند ہو گئے۔ اللہ کی بے شمار رحمتوں سے نوازے گئے اور اللہ جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں **وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (٧٦)** اور ہر علم والے سے اوپر کوئی علم والا ہے۔ علم اللہ کریم کی صفت ہے۔ وہ علیم ہے، ہر حال میں ہر شے سے واقف ہے۔ انسانوں کے بارے فرمایا کہ ہم جو علم عطا فرماتے ہیں وہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی ایک شئے عطا کر دیتے ہیں، دوسرے کو کوئی اور شئے عطا کر دیتے ہیں۔ جس کو جو چاہتے ہیں عطا کر دیتے ہیں۔ بھائیوں نے جب دیکھا کہ یہ تو چوری ثابت ہوگئی اور بن یامین کے سامان سے پیالہ نکل آیا ہے تو وہ حیران ہوئے کہ یہ بن یامین نے کیا کیا، کیسے کیا، پیالہ کہاں اور کس وقت چھپایا؟ جبکہ وہ بھی تو وہیں موجود تھے اور غلّہ لے رہے تھے۔ سارے سامان کے تھیلے تو خود انہوں نے مل کر بند کیے اور اونٹوں پر لادے تو آخر بن یامین نے یہ چوری کیسے کی؟ تو بولے **قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ** اگر اس نے چوری کر لی تو کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس سے پہلے اس کا ایک بھائی جو بہت عرصہ پہلے جنگل میں کھو گیا تھا، اس نے بھی چوری کی تھی۔ یہ دونوں ہمارے سوتیلے بھائی ہیں۔

یوسفؑ کی کمسنی کا واقعہ:

مفسرین یہ واقعہ یوں نقل فرماتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام ابھی بہت کمسن تھے، جب اُن کی والدہ کا وصال ہو گیا (جب بن یامین کی ولادت ہوئی تو ان کی والدہ کا وصال ہوا)۔ اس وقت یوسفؑ دو یا اڑھائی برس کے تھے تو یعقوبؑ نے بچوں کو ان کی پھوپھی کے حوالے کر دیا۔ حضرت یعقوبؑ کی بہن نے بچوں کو پالا، دو تین سال تک اپنے پاس رکھا۔ جب بچے کچھ سیانے ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام نے اپنی بہن کو پیغام بھیجا کہ کم از کم یوسفؑ کو ہی واپس بھیج دو۔ مگر پھوپھی کو ان سے بہت پیار ہو گیا تھا تو انہوں نے ایک حیلہ کیا۔ ان کے پاس حضرت اسحاق علیہ السلام کا ایک چھوٹا سا پٹکا تھا جو خاندانی تبرک کے طور پر آ رہا تھا۔ چونکہ قانون یہ تھا کہ جو چوری کرے، وہ مسروقہ مال کے مالک کے سپرد کر دیا جائے۔ پھوپھی نے ان کی کمر سے پٹکا لپیٹ کر اوپر کُرتا پہنا دیا۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو لے جایا جانے لگا تو پھوپھی نے کہا میرا تو پٹکا گم ہو گیا ہے اور یوسفؑ سے برآمد کر لیا۔ جب یعقوبؑ کو پتا چلا تو وہ حیران ہوئے کہ بہن نے یہ کیسی تدبیر کی کہ بجائے اُن سے اصرار کرنے کے کہ یوسفؑ کو ان کے پاس ہی رہنے دیا جائے، ایسا حیلہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی ان کے پیار پر انہیں خوشی بھی ہوئی تو فرمایا، اچھا تم اسے اپنے پاس رکھو جب تک تمہارا جی نہیں بھرتا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد جب ان کا انتقال ہو گیا تو یوسفؑ کو واپس لایا گیا۔ اب بات تو اسی وقت ظاہر ہوگئی تھی جب یعقوبؑ نے سارا کھیل دیکھ کر بہن سے فرمایا، یہ تمہاری محبت ہے، تم اسے چھوڑنا نہیں

چاہتیں۔ پھر پھوپھی کے وصال تک آپؑ ان کے پاس ہی رہے۔ بھائیوں نے وہ طعنہ بھی دے ڈالا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بڑے بھائی نے بھی ایک چوری کی تھی۔ وہ بھی پکڑا گیا تھا اور اسے بھی اُن لوگوں نے روک لیا تھا۔ حالانکہ وہ واقعہ کی حقیقت سے آشنا تھے۔ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ یوسفؑ اس بات کو بھی پی گئے، ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا ورنہ انہیں دُکھ تو بہت ہوا کہ اپنا کردار تو دیکھو! تم لوگوں نے والد کے ساتھ کیا کیا، معصوم بھائی پر کیا ظلم ڈھایا؟ تم خود پارسا بن گئے اور وہ جو پھوپھی نے حیلہ کیا تھا تم اُسے چوری کا نام دیتے ہو! لیکن چونکہ اللہ کا حکم نہیں تھا، ظاہر کرنے کی اجازت نہیں تھی تو آپؑ نے اس بات کو برداشت کرلیا۔ اور دل ہی دل میں کہا قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا اگر کردار دیکھا جائے تو تمہارا کردار بہت بھیانک ہے۔ تم نے اس سے بڑے کئی جرائم کیے ہیں۔ جو سلوک تم نے والدِ گرامی سے کیا ہے، جو سلوک تم نے ننھے بھائی سے کیا ہے، ایسا ظلم تو کوئی بڑے سے بڑا ظالم بھی نہیں کرتا۔ تمہارا کردار بہت ہی برا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۷۷) اور تم جو باتیں کرتے ہو، ان کی حقیقت حال سے اللہ باخبر ہے۔ اللہ کریم جانتا ہے کہ کس نے چوری کی اور کس نے زیادتی کی یا کیا واقعہ تھا؟ سب باتوں کی حقیقت اللہ کریم جانتے ہیں۔ اب بھائی والد گرامی سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ بن یامین کو اپنے ساتھ واپس لائیں گے۔ اب وہ گرفتار ہو گیا تو سب نے بڑی گزارش کی اور سب نے بڑا اصرار کیا قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا کہنے لگے بادشاہ سلامت! اس کا باپ بوڑھا ہے شَیْخًا كَبِیْرًا بہت ضعیف العمر ہے۔ ان کا ایک بیٹا پہلے کھو گیا تھا۔ اس کی جدائی میں انہوں نے رو رو کر آنکھیں سفید کر لی ہیں۔ برسوں بیت گئے مگر آج تک ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ دُکھ اور ملال سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے ہیں۔ وہ بہت تکلیف میں ہیں۔ اگر یہ بھائی بھی جدا ہو گیا تو شاید یہ صدمہ وہ برداشت نہ کر سکیں۔ آپ ایک مہربانی کیجیے اس کے بدلے آپ ہم بھائیوں میں سے جسے چاہیں روک لیں۔ اسے جانے دیں ورنہ اس کے والد کے دل پر کیا گزرے گی۔ فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۷۸) چونکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ آپ بہت احسان کرنے والے ہیں، بہت مہربان اور کرم کرنے والے بادشاہ ہیں۔ آپ مہربانی فرمائیں اور ہم میں سے کسی کو روک لیں اور اس کے ضعیف والد کی خاطر اس کو جانے دیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو حکم الٰہی سے روکا ہوا تھا اور ساری تدبیر وحیٔ الٰہی کے مطابق کی تھی۔ اللہ کریم کی یہی منشا تھی۔ آپؑ کہنے لگے قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اللہ کی پناہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ جس سے چوری ثابت ہو گئی ہے، اس کو چھوڑ کر کسی اور کو پکڑ لیں اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (۷۹) یہ تو بہت ظلم ہو گا اور ہم تو پھر غلط کاروں میں شامل ہو گئے۔ یہ بہت ظلم ہو گا، لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا۔ جس سے چوری پکڑی ہے، وہی گرفتار ہو گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ چوری کوئی کرے اور گرفتار کسی اور کو کیا جائے۔ ایسا کرنا بہت ناانصافی ہو گی۔

سورۃ یوسف رکوع 10 آیات 80 تا 93

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ
قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ
اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾
اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا
عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ
الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ
اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿٨٣﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ
الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا
اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ
اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا
تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ
الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٧﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ
وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿٨٨﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ

اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَ اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴿۹۳﴾

پس جب وہ ان سے ناامید ہو گئے تو الگ بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑے نے کہا، کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کا عہد لیا تھا اور اس سے پہلے یوسف (علیہ السلام) کے معاملہ میں تم کس قدر قصور کر چکے ہو سو میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں جب تک میرے والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لیے کوئی فیصلہ فرما دیں اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں ﴿۸۰﴾ تم لوگ واپس اپنے والد کے پاس جاؤ پس (ان سے جا کر) کہو اے ہمارے ابا جان! بے شک آپ کے بیٹے نے چوری کی (اور گرفتار ہوئے) اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو ہم جانتے ہیں اور ہم غیب کی باتوں کے تو یاد رکھنے والے نہیں ﴿۸۱﴾ اور جس بستی میں ہم ٹھہرے تھے وہاں سے پوچھ لیجیے اور جس قافلے میں ہم آئے ہیں (اس سے دریافت کر لیجیے) اور یقیناً ہم بالکل سچے ہیں ﴿۸۲﴾ وہ فرمانے لگے بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنا لی ہے تو صبر ہی بہتر ہے۔ عجب نہیں کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے بے شک وہ جاننے والے حکمت والے ہیں ﴿۸۳﴾ اور ان سے رخ پھیر لیا اور فرمانے لگے وائے افسوس! یوسف (علیہ السلام) پر اور دُکھ سے (رو رو کر) ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں سو وہ غم سے بھرے ہوئے تھے ﴿۸۴﴾ (بیٹے) کہنے لگے اللہ کی قسم اگر آپ یوسف (علیہ السلام) کو اسی طرح یاد کرتے رہے تو بیمار پڑ جائیں گے یا جان ہی دے دیں گے ﴿۸۵﴾ انہوں نے

فرمایا یقیناً میں تو اپنے رنج وغم کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۸۶﴾ اے میرے بیٹو! جاؤ پس یوسف (علیہ السلام) اوران کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ کی رحمت سے کافر لوگ ہی ناامید ہوا کرتے ہیں ﴿۸۷﴾ پس جب وہ ان (یوسف علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز (عزیزِ مصر)! ہم کو اور ہمارے خاندان کو (قحط کی وجہ سے) بہت تکلیف پہنچ رہی ہے اور ہم یہ تھوڑا سا سرمایا لائے ہیں سو (اس کے بدلے) ہمیں پورا غلہ دے دیجیے اور ہم پر خیرات کیجیے۔ بے شک اللہ خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں ﴿۸۸﴾ انہوں (یوسف علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم کو یاد ہے تم نے یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جب تم نادانی میں مبتلا تھے ﴿۸۹﴾ وہ بولے کیا واقعی آپ ہی یوسف (علیہ السلام) ہیں؟ انہوں نے فرمایا میں یوسف (علیہ السلام) ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ بے شک ہم پر اللہ نے بڑا احسان فرمایا ہے اور جو شخص واقعی اللہ سے ڈرتا ہے اور (گناہوں سے) صبر کرتا ہے تو یقیناً اللہ خلوص سے نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے ﴿۹۰﴾ کہنے لگے اللہ کی قسم یقیناً اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی اور ہم ہی خطاوار تھے۔ ﴿۹۱﴾ انہوں نے فرمایا آج کے دن تم پر کوئی عتاب نہیں، اللہ تمہارا قصور معاف فرمائیں اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں ﴿۹۲﴾ یہ میرا کرتہ لے جاؤ پھر اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو، وہ دیکھنے لگ جائیں گے اور اپنے تمام گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ ﴿۹۳﴾

تفسیر ومعارف

وہ لوگ بہت گھبرائے کہ اب کیا کریں گے؟ اور والد گرامی کو کیا جواب دیں گے؟ فَلَمَّا اسۡتَيۡـَٔسُوۡا مِنۡهُ خَلَصُوۡا نَجِيًّا جب نا اُمید ہو گئے کہ بادشاہ تو ماننے والے نہیں، انہوں نے بن یامین کو اپنے پاس رکھ لیا ہے، تو بھائی بہت پریشان ہو گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی سے بہت پیار سے ملے اور پاس بٹھالیا اور انہیں بتایا کہ میں تمہارا بھائی یوسفؑ ہوں۔ تم سے بچھڑے عرصہ بیت گیا اور تم تو شاید بھول بھی چکے ہوں گے کہ تمہارا کوئی بھائی بھی تھا۔ پھر خوب دل کھول کر باتیں کیں۔ والدِ گرامی کا حال پوچھا، گھر کے حالات معلوم کیے۔ دوسرے سارے بھائی پریشانی میں مبتلا تھے کہ اب کیا کریں۔ جب دربارِ شاہی سے باہر آئے تو مشورہ کرنے لگے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ تو جو اُن میں سے سب سے بڑا بھائی تھا وہ کہنے لگا تمہیں یاد ہے کہ تم نے اللہ کو گواہ بنا کر والدِ گرامی سے کتنا پکا عہد کیا تھا کہ بھائی کو ساتھ لے کر جاؤ گے۔ اور پھر اس سے پہلے یوسفؑ کے معاملے میں جو تم کر چکے ہو، وہ بھی تم جانتے ہو۔ اب کس منہ سے والد گرامی کے پاس جاؤ گے اور ان سے کیا کہو گے؟ اور کہنے لگا فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ (۸۰) کہ جو بھی ہو میں اب یہاں سے کہیں جانے والا نہیں ہوں۔ مجھے تو شرم آتی ہے میں والد کے روبرو نہیں جا سکتا اور جب تک والد حکم نہ دیں میں تو یہیں رہوں گا یا وہ مجھے واپس آنے کی اجازت دیں یا پھر اللہ کریم زندگی موت کا فیصلہ کر دیں، موت ہی آ جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔ بھائیوں سے کہا اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ تم لوگ واپس جاؤ، والد گرامی کی خدمت میں پہنچو فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ اور انہیں بتاؤ کہ ابا جان! آپؑ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور اس چوری میں پکڑا گیا اور اس معاملے میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم اسے دانستہ چھوڑ کر نہیں آئے بلکہ معاملہ ہمارے بس سے باہر ہو گیا تھا وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا اور جو بات ہمارے سامنے ہے، وہی بتا رہے ہیں۔ اب پس پردہ کیا معاملہ یا حقائق ہیں، اس کا ہمیں علم نہیں۔ ظاہر میں جو بات ہمارے سامنے ہوئی ہے، جس کے ہم گواہ ہیں، وہ یہ ہے کہ جب ہم سامان لے کر نکلے، تو بادشاہ کے پیادے پیچھے آ گئے اور کہنے لگے کہ تم لوگ چور ہو۔ ہم نے بہت کہا کہ ہم چور نہیں ہیں تو انہوں نے تلاشی دینے کا مطالبہ کیا۔ جب تلاشی دی گئی تو بن یامین کے سامان میں سے شاہی پیمانہ نکل آیا۔ یہ سب ہمارے سامنے کی بات ہے، اب اس کے پیچھے کیا حقائق ہیں؟ اس سے تو ہم واقف نہیں۔ لیکن یہ بات ہمارے سامنے ہوئی، ہم اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ (۸۱) اور اس کے پیچھے کوئی غیبی امور ہیں، تو وہ اللہ بہتر جانتا ہے، ان پر تو ہمارا بس نہیں چلتا ہے۔ ان کے مقابلے میں تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر آپؑ کو ہماری بات پر یقین نہ آئے تو وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا ہم جن شہروں سے گزرے، جہاں جہاں سے قافلے کا راستہ تھا ان لوگوں سے پوچھ لیجیے! کہ ہمارا اپنے بھائی کے ساتھ سلوک کیسا تھا۔ وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا یا وہ قافلے والے جو یہاں سے ہمارے ساتھ گئے تھے، وہ بھی واپس آ گئے ہیں۔ وہ بھی سارے واقعہ کے چشم

دیدگواہ ہیں، آپؑ ان سے شہادت لے لیجیے کہ اصل واقعہ کیا ہوا۔ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۸۲) وہ بھی یہ گواہی دیں گے کہ جو کچھ ہم عرض کرر ہے ہیں، یہ سارا سچ ہے۔

صبرِ جمیل:

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نے پھر ایک بہانہ گھڑلیا ہے۔ آپؑ اپنے پہلے تجربے کی بنیاد پر فرمارہے تھے کہ پہلے بھی یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا، اس کی موت کا فسانہ تم نے گھڑلیا تھا۔ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یہ کہانی تم نے خود بنائی ہے۔ لیکن اس کا جواب بھی وہی ہے فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ صبر کرنا ہی بہتر ہے، برداشت کرنا ہی مناسب ہے۔ میں یہ دُکھ بھی جھیل جاؤں گا۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا دُکھ بھی جب حد سے بڑھ جاتا ہے، درد جب حد سے گزر جاتا ہے، دوا بن جاتا ہے۔ فرمانے لگے اللہ چاہے تو اُن سب کو اکٹھا میرے پاس واپس لے آئے۔ اگر اس نے مجھ سے ایک ایک کر کے دونوں بیٹے لے لیے ہیں تو مجھے دونوں عطا بھی کردے گا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۸۳) وہ ساری بات جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا بھی ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا کہ یہ مجھ سے جدا ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔ لیکن میں اللہ سے پُر امید ہوں کہ وہ اُن سب کو مجھ سے ملادے گا کہ وہ علم والا بھی ہے، جانتا بھی ہے، دانا تر ہے۔ اس کی حکمت کا کوئی تقاضا ہوگا جو اس نے مجھ سے بیٹے جدا کردیے۔ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ پھر اُن (بیٹوں) سے رخِ مبارک پھیرلیا۔ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ اور ایک سرد آہ کھینچی۔ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ یوسفؑ کے دُکھ میں پہلے ہی آنکھیں سفید ہوچکی تھیں۔

حُزن کیا ہے؟

کسی پیاری ہستی، کسی محبوب کے دُکھ کو حُزن کہتے ہیں یعنی حُزن وہ ڈر ہے جو دوسرے سے متعلق ہے۔ جدائی کا دُکھ ہو یا اُس پیارے پر کوئی تکلیف آجائے، اُس کا دُکھ ہو۔ اپنے ذاتی دُکھ یا ڈر کو حُزن نہیں کہتے۔ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ اُن کے غم میں رو رو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ فَهُوَ كَظِيْمٌ کسی مشک یا چھاگل کو پانی سے بھر کر اس کا منہ مضبوطی سے بند کردینے کو كَظِيْمٌ کہتے ہیں۔ وہ دُکھ سے اسی طرح بھرے ہوئے تھے، ان کے اندر دُکھ ہی دُکھ تھا، غم ہی غم تھا لیکن لب پہ شکوہ نہیں تھا۔ فَهُوَ كَظِيْمٌ (۸۴) سارا دُکھ انہوں نے اپنے اندر سمولیا تھا، لب پر شکوہ نہیں تھا۔ اللہ کے سوا کسی سے اپنے دُکھ کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ جیسے پانی کا مشکیزہ بھر کر اوپر سے منہ باندھ دیتے ہیں تو کوئی قطرہ باہر نہیں آتا، اسی طرح آپؑ کے اندر دُکھ ہی دُکھ تھا لیکن وہ چھلکتا نہیں تھا۔ زبان پر نہیں آتا تھا۔

یہی لفظ حُزن سورۃ التوبہ میں استعمال ہوا ہے، جب حضور اکرم ﷺ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں جلوہ افروز تھے اور صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خدمت میں حاضر تھے۔ حضور اکرم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی گود میں سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے۔ اہل مکہ تلاش کرتے کرتے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غار کا دہانہ چھوٹا تھا اور وہ سامنے ٹہل رہے تھے۔ ان کی پنڈلیاں مجھے صاف دُکھائی دے رہی تھیں۔ تو آپؓ کو حضور ﷺ کی بہت فکر ہو رہی تھی کہ اگر اہل مکہ نے دیکھ لیا تو، وہ آپ ﷺ کے جانی دشمن ہیں، پتا نہیں کیا کر گزریں۔ یہ سوچ کر آپؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ایک قطرہ حضور اکرم ﷺ کے رُخِ انور پر گرا، تو آپ ﷺ نے دلاسہ دیتے ہوئے فرمایا، لَا تَحْزَنْ تم میرا غم نہ کرو، میرے لیے دُکھی نہ ہو۔

معیتِ ذاتی:

اور فرمایا، اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (التوبہ:40) یقیناً اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ سورۃ التوبہ کی اس آیت میں معیتِ باری کا ذکر آیا، تو واضح ہو کہ یہاں معیتِ ذاتی مراد ہے۔ جو انبیأ کرام علیہم السلام میں صرف حضور اکرم ﷺ اور غیر انبیأ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔ پوری نوعِ انسانی میں یہ دو ہستیاں ہیں جو اللہ کی معیتِ ذاتی سے نوازی گئیں۔ فرمایا، اللہ کی ذات اُن دونوں کے ساتھ ہے۔ یہاں اللہ کی کسی صفت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور ان دونوں کی بھی ذوات ہیں۔ کسی صفت کے ساتھ معیت مشروط نہیں کی گئی۔

معیتِ صفاتی:

معیتِ باری تو تمام انبیأ علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے لیکن نبیؑ کی ذات کو اللہ کی صفاتی معیت نصیب ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر سمندر کنارے پہنچے تو حالت یہ تھی کہ آگے سمندر تھا اور تعاقب میں فرعون کا لشکر پہنچنے کو تھا۔ ان کی قوم پکار اٹھی! اب بچنے کا کیا راستہ ہوگا؟ فرعونی تو ہمیں تہہ تیغ کر دیں گے اور ہم ان کی سواریوں تلے روند دیے جائیں گے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (الشعرأ:62) میرے ساتھ میرا ربّ ہے۔ یہ نہیں فرمایا، 'ان معی اللہ'۔ بلکہ اللہ کی صفتِ ربوبیت کا ذکر کیا۔ یعنی ایک طرف نبیؑ کی ذات ہے اور دوسری طرف اللہ کی صفتِ ربوبیت ہے۔ تو انبیأ علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ کو اللہ کی صفاتی معیت حاصل ہوتی ہے اور دائمی ہوتی ہے۔

مومن کے لیے معیت کی شرط:

مومن کو بھی اللہ تعالیٰ کی معیتِ ذاتی حاصل ہوتی ہے لیکن مومن کی صفات کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ اگر وہ شرط نہ رہے تو معیتِ باری بھی نہیں رہتی۔ مثلاً ارشادِ باری ہے، اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (العنکبوت:69) اللہ کی طرف سے معیتِ ذاتی ہے لیکن بندے کی طرف سے صفت کی شرط ہے۔ جب تک محسن رہے گا، اسے معیتِ ذاتی حاصل رہے گی۔ اگر اس کی صفت احسان میں فرق آیا تو معیتِ ذاتی سے محروم ہو جائے گا۔

قَالُوْا تَاللّٰہِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ وہ کہنے لگے، اللہ کی قسم! اگر آپؑ یوسفؑ کو اسی طرح یاد کرتے رہے، روتے رہے اور دُکھی رہے تو آپ بیمار پڑ جائیں گے یا جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ آپؑ ابھی تک اسی قصے کو لیے بیٹھے ہیں، اس غم میں اپنے آپ کو گھلا لیا ہے۔ وہی دُکھ، وہی آنسو، وہی یاد ہے۔ رو رو کر آنکھیں سفید کر لی ہیں۔ اب تو یہی کسر باقی ہے کہ آپؑ پر کوئی بیماری حملہ آور ہو، یا پھر آپؑ کی جان ہی جانِ آفرین کے سپرد ہو جائے۔ تو انہوں نے فرمایا، قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰہِ میں اگر دُکھی ہوں تو اپنا دُکھ صرف اللہ سے بیان کرتا ہوں، تم سے تو شکوہ نہیں کرتا۔ کبھی کسی بندے کے سامنے تو میں نے اپنا دُکھ ظاہر نہیں کیا۔ میرے دُکھ سے تمہیں کیا پریشانی ہے؟ تمہارے کسی کام میں تو رکاوٹ نہیں ڈالی۔ تمہارے معمولاتِ زندگی اسی طرح سے جاری و ساری ہیں۔ میں نے کبھی کسی انسان سے شکوہ نہیں کیا۔ ہاں! میں اپنا دُکھ اپنے پروردگار کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اس کی بارگاہِ عالی میں بیان کرتا ہوں۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰہِ میں اپنے رنج والم کا بیان صرف اپنے اللہ سے کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم تو بھول سکتے ہو لیکن میں تو بہت کچھ جانتا ہوں، میں کیسے بھول جاؤں؟ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۶) مجھے اللہ نے وہ علوم دیے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں۔ مجھے تو اللہ نے بتایا ہے کہ یوسف نبیؑ ہو گا، نبوت سے سرفراز ہو گا، حکمران ہو گا، بادشاہ ہو گا۔ اب مجھے برسوں سے کچھ خبر نہیں کہ وہ کس حال میں ہے؟ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔ موت کی تصدیق ہو جائے تو وہ بھی دُکھ کو ایک حد تک قابلِ برداشت بنا دیتی ہے۔ لیکن جسے یہ یقین ہو کہ اس کا محبوب زندہ ہے اور ایک دن اسے ضرور ملے گا، نبیؑ بنے گا، بادشاہ بھی بنے گا اور اسے خبر نہ ہو کہ وہ کس حال میں ہے تو وہ اسے کیسے بھول سکتا ہے؟ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ میں اللہ کی طرف سے بہت سے حقائق جانتا ہوں مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۸۶) جو تم نہیں جانتے، جو تمہارے علم میں نہیں ہیں۔ یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں اس قدر غمگین اور اداس رہتے کہ ہر وقت روتے رہتے۔ یہاں تک کہ روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ اب جب بن یامین بھی بچھڑ گیا، تو دُکھ مزید بڑھ گیا۔ تب آپؑ نے ایک سرد آہ کھینچی اور کہا، وائے افسوس! یوسف تُو کہاں

ہے؟ محبت کا بھی یہ کیسا انوکھا اور نرالا انداز ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل میں یوسفؑ کی جدائی کا زخم، اتنی مدت گزرنے پر بھی ویسا ہی ہرا ہے۔

ایک سوال:

مفسرین کرام یہاں ایک سوال لکھتے ہیں کہ کیا انبیأ علیہم السلام کو اللہ کے علاوہ بھی کسی سے اتنی محبت ہو سکتی ہے؟ اہل اللہ کو تو صرف اللہ سے محبت ہوتی ہے اور انبیأ علیہم السلام تو سب سے اعلیٰ مرتبے یعنی درجۂ نبوت پر فائز ہوتے ہیں تو کیا اللہ کے سوا کسی سے اتنی محبت کر سکتے ہیں؟

جواب:

علماء جواباً فرماتے ہیں کہ انبیأ علیہم السلام انسان ہوتے ہیں اور اُن میں تمام انسانی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ اس نظامِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے محبت ایک انتہائی اہم اور لازمی جذبہ ہے۔ انسان چیزوں سے بھی محبت کرتا ہے، عہدہ و اقتدار سے بھی محبت کرتا ہے، والدین سے، اولاد سے، دوستوں سے، سب سے محبت کرتا ہے۔ اگر یہ محبت نہ ہوتو نظامِ عالم قائم نہیں رہ سکتا۔ ماں کو محبت نہ ہوتو بچے کی پرورش نہیں ہوسکتی۔ باپ کو محبت نہ ہوتو اولاد کو نہیں پال سکتا اور جہاں باپ اس محبت سے بیگانہ ہو، وہاں بچے خوار ہو جاتے ہیں۔ جہاں اولاد والدین سے محبت نہیں کرتی، وہاں والدین کا بڑھاپا خراب ہو جاتا ہے۔ اگر کام سے، کاروبار سے دلچسپی نہ ہوتو کام درست نہیں ہوتا۔ لہٰذا نظامِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے یہ بے حد ضروری جذبہ ہے اور اللہ نے ہر ایک کو عطا فرمایا ہے۔ لیکن مومنین کی شان یہ ہوتی ہے **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ** (البقرہ:165) وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ دوسری محبتیں منع نہیں ہیں لیکن یہ اتنی شدید نہ ہوں کہ اللہ کی محبت پر غالب آ جائیں۔ سب محبتوں پر اللہ کی محبت غالب ہونی چاہیے۔ انبیأ علیہم السلام میں یہ صفت کامل درجے میں ہوتی ہے۔ اسی لیے جب بیٹوں نے کہا کہ یہ محبت تو آپؑ کی جان تک لے لے گی تو آپؑ نے فرمایا، **اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ** میں اگر شکوہ کرتا ہوں یا درخواست کرتا ہوں یا اپنے دُکھ کا تذکرہ کرتا ہوں تو اپنے اللہ سے ہی کرتا ہوں، کسی انسان سے نہیں کرتا۔ تمہارے ساتھ نہیں کرتا، کسی سے نہیں کرتا۔ اپنا دُکھ میں اللہ سے بیان کرتا ہوں اور جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ اگر مجھے بھی تمہاری طرح یہ یقین ہوتا کہ یوسفؑ نہیں رہے تو شاید میں بھی بھول جاتا، لیکن میں جانتا ہوں کہ انہیں حکومت و سلطنت بھی ملے گی، علم تعبیر کے ماہر بھی ہوں گے، نبوت بھی عطا ہوگی۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ نہ جانے وہ اب کس حال میں ہے، اس پر کیا بیت رہی ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کا وصال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود مبارک میں تھے اور

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اشک ہائے مبارک رواں تھے۔ تو عرض کیا گیا، یا رسول اللہ! آپ رو رہے ہیں؟ تو فرمایا، یہ محبت پدری ہے، یہ باپ کی بیٹے سے محبت ہے۔ یہ فطری چیز ہے۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا، میں تو اللہ سے اپنی گزارشات پیش کرتا ہوں اور اللہ نے مجھے جو باتیں بتادی ہیں، وہ تم نہیں جانتے۔ پھر فرمانے لگے، یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ کہ میرے بچو! جاؤ اور وہیں یوسفؑ اور اُس کے بھائی کو تلاش کرو۔ ممکن ہے جس سلطان کی تم بات کر رہے ہو، وہ یوسفؑ ہی ہوں۔ اللہ نے اُسے بھی تو سلطنت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کے بھائی کو بھی۔ وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں، اللہ قادر ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی رحمت سے کافر نااُمید ہوتا ہے، مومن ناامید نہیں ہوتا۔ چنانچہ بیٹوں نے پھر مصر روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ وہی سرمایہ جو یوسف علیہ السلام نے لوٹا دیا تھا، ساتھ رکھ لیا اور گھر کا مزید سامان اور برتن بھی ساتھ لیے اور روانہ ہوگئے۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَیْهِ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ (۸۸) اللہ کریم کی قدرت ہے کہ جس بھائی کو چند درہم میں فروخت کیا تھا، اور دو، دو درہم کا حصہ پا کر کبھی بہت خوش ہوئے تھے، آج اسی بھائی کے دربار میں سوالی بن کر کھڑے ہیں! تو کہنے لگے، اے عزیزِ مصر! ہم پر تو بہت مصیبت آگئی، قحط سالی کی وجہ سے گھر میں کچھ نہیں بچا۔ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ اس لیے ہم وہ سرمایہ لائے ہیں جو بازار میں چلنے والا کوئی پیسہ، نوٹ یا سکہ نہیں بلکہ دوسری چیزیں، مثلاً گھریلو سامان یا برتن وغیرہ ہیں۔ کیونکہ اب تو گھر میں کچھ بچا ہی نہیں، سوائے استعمال کے برتنوں کے تو ہم وہی اٹھا لائے ہیں۔ بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ یہ ایسی پونجی ہے جو بازار میں چلنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ بہت کریم ہیں، ہمیں غلہ پورا پورا دے دیجیے، اگرچہ ہمارے پاس یہی سرمایہ ہے۔ اس پونجی میں کوئی سکے بھی نہیں ہیں مگر یہی ہماری کل متاع ہے۔ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَا آپؑ ہم پر صدقہ کیجیے، خیرات دیجیے، مہربانی کیجیے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ دیکھیے کہ ماضی میں کیا حال تھا اور اب ان سے صدقہ وخیرات طلب کر رہے ہیں! کہنے لگے، اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ بے شک اللہ خیرات کرنے والوں کو اور صدقہ کرنے والوں کو، جو خلوصِ دل سے طلب رضائے الٰہی کے لیے دوسروں کی مدد کرتے ہیں، بہترین بدلہ عطا فرماتا ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ راز سے پردہ اُٹھ جائے۔ اللہ کریم کو بھی اب یہی منظور تھا کہ اب یوسف علیہ السلام دینی اور دنیوی اعتبار سے عروج وکمال پر پہنچ چکے تھے اور برادرانِ یوسف بھی اپنی عاجزی اور نیاز مندی میں آخری حد تک چلے گئے تھے کہ صدقہ وخیرات طلب کر رہے تھے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا، قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَاَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ (۸۹) آج تو تم بڑا عاجزانہ اور شریفانہ انداز اپنا کر اور بڑے اطاعت گزار بن کر کہہ رہے ہو کہ تم خاندانِ نبوت کے افراد ہو،

حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزند ہو، لیکن کیا تمہیں اپنا وہ سلوک یاد ہے جو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا؟ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا نہیں کیا؟ کتنا ظلم ڈھایا، کتنی زیادتی کی؟ اس وقت تمہیں احساس کیوں نہ رہا کہ تم خاندانِ نبوت کے افراد ہو؟ اس وقت تو بھول گئے کہ تم نبیؑ کی اولاد ہو اور تمہیں ظلم زیب نہیں دیتا۔ اس وقت تو تم جاہل بن گئے، سب کچھ بھول گئے۔ یہ سن کر بھائی بہت حیران ہوئے کیونکہ یہ واقعہ اُن دس بھائیوں کے علاوہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے علم میں تھا اور کسی دوسرے انسان کے علم میں نہیں تھا۔ وہ بہت حیران ہوئے کہ یہ عزیزِ مصر ہے اور یوسفؑ کا واقعہ یاد دلا رہا ہے۔ کہیں یہ یوسفؑ ہی نہ ہو اور ان کا وہ خواب سچ ہو گیا ہو، جس کو سن کر ہمارے دلوں میں اُن کے خلاف حسد پیدا ہوا تھا اور ہم نے کوشش کی تھی کہ ان کا قصہ تمام کیا جائے۔ کہنے لگے، قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ کہیں آپؑ ہی یوسف تو نہیں ہیں؟ ساری بات پھر ذہن میں آئی، جب آنکھ اٹھا کر رخِ انور دیکھا، خدوخال دیکھے تو کہنے لگے، قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ کیا آپ ہی یوسفؑ ہیں؟ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ ہاں! میں ہی یوسف ہوں۔ تو بھائی حیرت میں ڈوب گئے۔

مصائب کی حقیقت:

اللہ قادر ہے! ہر تخریب تباہی نہیں ہوتی بلکہ بعض تخریب ایسی ہوتی ہے جو تعمیر کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ہر مصیبت، محض مصیبت نہیں ہوتی بلکہ بعض مصائب ایسے ہوتے ہیں جو ترقیٔ درجات کا سبب بن جاتے ہیں۔ ہر فرد کے ساتھ اس کی شان، اس کی ذات کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے۔ اگر اللہ کے بندوں پر مصیبتیں آتی ہیں تو ترقیٔ درجات کا سبب بن جاتی ہیں۔ ایک عام خطا کار مسلمان پر اگر مصیبت آتی ہے تو اس کی تلافیٔ مافات کا سبب بن جاتی ہے۔ کچھ گناہ جھڑ جاتے ہیں، کچھ خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، مومن کے پاؤں میں اگر کانٹا بھی چبھ جائے تو اللہ کریم اس کے بے شمار گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ جن لوگوں کا اللہ سے تعلق نہیں ہوتا، ان پر سزا کے طور پر مصیبت آتی ہے اور وہ اس سے دُکھی ہوتے ہیں۔ چونکہ کافر پر جو مصیبت آتی ہے، وہ از قسم عقوبات ہوتی ہے یعنی سزا کا ایک حصہ ہوتی ہے اور وہ صرف جسمانی یا ظاہری تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل میں بھی آگ کے شعلے دہکتے ہیں، اور وہ ظاہراً باطناً دونوں اعتبار سے پریشان ہوتا ہے۔ مومن مصائب میں اُس طرح سے دُکھی نہیں ہوتا، جس طرح کا دُکھ کافر محسوس کرتا ہے۔ تو کافر پر مصیبت از قسم عقوبات ہوتی ہے، مومن پر تلافیٔ مافات کے لیے، اور انبیاء علیہم السلام، صلحاء اور اہل اللہ پر ترقیٔ درجات کے لیے مصائب آتے ہیں۔

فرمایا، تم نے تو سمجھا کنوئیں سے نکال کر غلام بنا کر بیچ دیا، اب یہ عمر بھر بلکتا ہی رہے گا اور یوں ہی عمر تمام ہو

جائے گی لیکن اللہ نے مجھے وہاں سے اٹھا کر مصر کا حکمران بنا دیا۔

تلخیٔ دوراں میں مومن کا رویہ:

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا، قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا مجھ پر اور میرے بھائی پر، ہم سب پر اللہ نے بہت بڑا احسان کیا۔ یہی اہل اللہ کا خاصہ ہے کہ اہل اللہ پر اگر تکالیف بھی آئیں تو وہ اس نتیجے کو یاد رکھتے ہیں جو ان کے بدلے بطورِ انعام انہیں عطا ہوتا ہے۔

اللہ سے نا آشنا لوگوں کا رویہ:

اس کے برعکس، اللہ سے نا آشنا لوگوں پر جب مصائب آتے ہیں تو چونکہ وہ تکلیف میں ہوتے ہیں لہٰذا دُکھ ہی بیان کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ یوسف علیہ السلام نے کس قدر مصائب جھیلے، لیکن آپؑ نے کسی تکلیف کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ فرماتے ہیں، قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اللہ نے مجھ پر بہت احسانات کیے ہیں، کہاں سے مجھے کہاں پہنچا دیا! اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ یقیناً جس کا رشتۂ دل اللہ سے مضبوط ہو یعنی وہ صاحب تقویٰ ہو يَتَّقِ جو ہر کام کرنے سے پہلے اس بات سے ڈرے کہ کہیں ایسا کرنے سے اللہ کریم خفا نہ ہو جائیں، کہیں یہ رشتہ مجروح نہ ہو جائے۔ تقویٰ اللہ کریم سے ایک باطنی اور قلبی رشتہ ہے اور ایک متقی شخص عملی زندگی میں ہر اس کام سے بچتا ہے جو اس رشتے کو کمزور کر دے۔ وہ ہر حال میں، ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرتا ہے۔ دنیوی تعلقات میں بھی جن سے محبت ہوتی ہے، ایک دلی تعلق ہوتا ہے تو کوئی کام کرنے سے پہلے ان کی پسند و ناپسند کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں وہ برا نہ مانیں۔ ایسا تعلق اگر اللہ کریم سے نصیب ہو جائے اور انسان بولنے سے بھی پہلے یہ سوچے کہ اس بات سے اللہ کریم خفا تو نہ ہوں گے۔ ہر کام کرنے سے بھی پہلے سوچے کہ یہ عمل اللہ کریم کی ناراضگی کا سبب تو نہ ہوگا، تو یہی تقویٰ کہلاتا ہے۔

تو فرمایا، جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور صبر اختیار کرتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر خود کو پابند کر لیتے ہیں، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۹۰) تو اللہ کریم ایسے مخلص لوگوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ انہیں اُن کے عمل سے کئی گنا بڑھا کر، کروڑوں گنا زیادہ اجر دیتا ہے۔

کریم ابن الکریم ابن الکریم:

تب بھائی کہنے لگے، قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ (۹۱) اللہ کی قسم! یقیناً اللہ نے آپؑ کو ہم بڑی فضیلت بخشی ہے۔ اللہ نے آپؑ پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس بات کا اللہ گواہ ہے! آپؑ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! آپؑ بالکل حق فرما رہے ہیں۔

جس کی قسم اٹھائی جائے اُس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس معاملے میں وہ گواہ ہے، دلیل ہے۔ اس لیے اللہ کریم کے سوا کسی کی قسم اٹھانا جائز نہیں۔ ہمارے ہاں یہ رواج بن چکا ہے کہ ماں کی قسم، تیرے سر کی قسم، باپ کی قسم وغیرہ اٹھائی جاتی ہیں۔ یہ سب ناجائز اور ناروا ہیں۔ اگر قسم اٹھانی ہے تو اللہ کی اٹھائی جائے کیونکہ وہ ہر حال پر شاہد ہے۔ ہر بات پر گواہ ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا اللہ کی قسم! یقیناً اللہ نے آپؑ کو ہم پر بہت سربلند فرمایا ہے۔ وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ (۹۱) اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے غلط کیا تھا، برائی کی تھی، خطا کی تھی۔ ہم اپنی خطا کا اقرار کرتے ہیں۔ آپؑ کے پاس سلطنت ہے، حکومت ہے، اقتدار و اختیار ہے، بادشاہت ہے۔ ہم بے بس و لاچار آپؑ کی عدالت میں کھڑے ہیں۔ ہم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں۔ آج آپؑ جو چاہیں سزا دیں، جیسا چاہیں ہم سے سلوک کریں۔ ہم سمجھ چکے ہیں کہ ہماری سوچ اور عمل سب غلط تھا اور جو اللہ نے آپؑ کو خواب دکھلایا، وہ حق تھا ، جو پورا ہو گیا۔ آج آپؑ بادشاہ ہیں اور ہم آپؑ کی بارگاہ میں مجرم کی حیثیت میں حاضر ہیں۔ اب یہ آپؑ پر ہے کہ آپؑ ہم سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تمہارا کوئی مواخذہ نہیں۔ آج تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ سب معاف کر دیا کیونکہ زیادتی تم نے میرے ساتھ کی، اب میرا اختیار ہے، اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے اور میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ آج تم سے کوئی حساب نہیں لیا جائے گا۔

اہل مکہ نے تیرہ برسوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر ممکن طریقے سے ایذا پہنچائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کو شدید ایذائیں دیں، بعض کو شہید تک کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بے حد زیادتیاں کیں لیکن جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ سے کیا سلوک کیا؟ عمومی قاعدہ یہ تھا کہ جو فاتح کسی شہر یا قوم کو فتح کرتا، وہ ساری قوم اُس کی غلام تصور ہوتی تھی، قیدی بن جاتی تھی، سارا شہر غلام بن جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ شریف کے سامنے کھڑے ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا، اے مکہ والو! تمہیں یاد ہے تم نے میرے ساتھ کتنی زیادتیاں کیں۔ آج تم مفتوح ہو اور اللہ نے مجھے فاتح بنایا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ تو یک زبان ہو کر سب بولے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریم ہیں، کریم کے بیٹے ہیں۔ کریم ابن الکریم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمیں کرم کی امید ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج میں تمہارے لیے وہی جملہ دہراتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور فرمایا، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَا (بیہقی) تم سب آزاد ہو، میں تم سب کو آزاد کرتا ہوں۔ بجائے سزا کے انعام بخشا، یعنی آزادی جو کسی بھی قوم کا

سب سے قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔ یہ آزادی گو کہ وہ ہار چکے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس لوٹا دی۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا، لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ میں نے خود بھی تمہیں معاف کیا اور میں اللہ کریم سے تمہارے لیے معافی کا طالب ہوں۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ کریم بھی تمہیں معاف فرما دیں۔ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۹۲) اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربانی فرمانے والا ہے۔ میں اس سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ وہ معاف فرما دے، کیونکہ وہ بہت رحم کرنے والا ہے۔

بزرگوں کی مستعمل اشیا کی برکت:

اب ساری بات واضح ہو گئی۔ والد کے احوال بن یامین سے تفصیلاً سن چکے تھے۔ فرمایا، یہ بات اب چھوڑو کہ تمہارے پاس سرمایہ ہے یا نہیں۔ غلّے کی باتیں اب چھوڑو۔ پہلا کام یہ کرو اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا کہ یہ میرا کُرتا لے جاؤ، فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا اسے میرے والد گرامی کے رخِ انور پر پھیرو، اُن کی بصارت ٹھیک ہو جائے گی، نگاہ واپس آ جائے گی۔ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۹۳) اور دوسرا یہ کرو کہ سارے خاندان کو لے کر یہاں آ جاؤ۔ تو مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ بزرگوں کی استعمال شدہ چیزوں میں منجانب اللہ برکت ہوتی ہے، یہ متبرک ہوتے ہیں۔ اس برکت کو اللہ کی طرف سے ہی سمجھنا چاہیے اور یہ جاننا چاہیے کہ یہ اللہ کے مقرب بندے تھے، اللہ نے ان پر رحم فرمایا اور جو تجلیاتِ باری ان کے وجود پر آتی تھیں، اس نے ان کے وجود کے ساتھ مَس ہونے والی چیزوں کو بھی مبارک کر دیا۔ تو تبرکات میں برکت ہوتی ہے لیکن انہیں اللہ کا شریک نہیں بنا لینا چاہیے کہ انہیں سامنے رکھ کر سجدے کرنے شروع کر دیے جائیں اور انہیں چومنا شروع کر دیں۔ یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔

ہاں! برکت حاصل کرنی چاہیے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کُرتے میں اللہ نے برکت رکھی۔ جب بھائیوں نے کہا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے، تب کُرتے سے پتا چلا کہ ایسا نہیں ہوا۔ جب زلیخا نے الزام لگایا، تب بھی کُرتا اُن کی پاکدامنی کا گواہ بنا۔ اور تیسری مرتبہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی بحال ہونے کا سبب بھی اُن کا کُرتا ہی بنا۔

سورۃ یوسف رکوع 11 آیات 94 تا 104

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِیۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّیۡ لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوۡا تَاللّٰہِ اِنَّکَ لَفِیۡ ضَلٰلِکَ الۡقَدِیۡمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِیۡرُ اَلۡقٰىہُ عَلٰی وَجۡهِهٖ فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا ۚ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ ۚۙ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا کُنَّا خٰطِئِیۡنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَکُمۡ رَبِّیۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوۡا عَلٰی یُوۡسُفَ اٰوٰۤی اِلَیۡهِ اَبَوَیۡهِ وَقَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ﴿ؕ۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ وَقَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَجَآءَ بِکُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ وَعَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۟ اَنۡتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا وَّاَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ ۚ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ یَمۡکُرُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَاۤ اَکۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسۡـَٔلُهُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۴﴾

اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے والد فرمانے لگے کہ بے شک مجھے یوسف (علیہ السلام) کی خوشبو آ رہی ہے اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں بہکی باتیں کر رہا ہوں ﴿۹۴﴾ وہ کہنے لگے اللہ کی قسم آپ یقیناً اسی پرانے فضول خیال میں مبتلا ہیں ﴿۹۵﴾ پس جب خوشخبری دینے والا آیا تو اس نے اس (کرتے) کو ان کے منہ پر ڈال دیا سو وہ فوراً ہی دیکھنے لگے۔ فرمایا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ یقیناً میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۹۶﴾ انہوں نے عرض کیا اے ہمارے والد! ہمارے لیے ہمارے گناہ کی بخشش مانگیے، بے شک ہم خطا کار تھے ﴿۹۷﴾ انہوں نے فرمایا عنقریب میں تمہارے لیے اپنے پروردگار (اللہ) سے بخشش طلب کروں گا، بے شک وہ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۹۸﴾ پس جب (یہ سب لوگ) یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور فرمایا مصر میں چلیے، اللہ کو منظور ہو تو (وہاں) امن سے رہیے ﴿۹۹﴾ اور اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر بٹھایا اور سب ان (یوسف علیہ السلام) کے آگے سجدے میں گر گئے اور انہوں نے فرمایا اے میرے ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا۔ بے شک میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا اور یقیناً اس نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ جب مجھے جیل خانے سے نکالا اور آپ کو گاؤں سے یہاں لایا، بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا۔ بے شک میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کرتا ہے، وہ بے شک بڑے علم والا بڑی حکمت والا ہے ﴿۱۰۰﴾ اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے سلطنت کا بڑا حصہ عطا فرمایا اور مجھے خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے والے! آپ ہی دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں۔ مجھ کو فرمانبرداری کی حالت میں (دنیا سے) اٹھایئے اور مجھے خاص نیک بندوں میں شامل

فرمایئے ﴿۱۰۱﴾ یہ (قصہ) غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے آپ کو بتلاتے ہیں اور آپ ان (برادرانِ یوسف علیہ السلام) کے پاس اس وقت موجود نہ تھے، جب انہوں نے اپنا ارادہ پختہ کرلیا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے ﴿۱۰۲﴾ اور بہت سے لوگ خواہ آپ کتنی ہی خواہش کریں ایمان لانے والے نہیں ﴿۱۰۳﴾ اور آپ ان سے اس کا کوئی صلہ بھی نہیں مانگتے یہ (قرآن) تو تمام جہانوں کے لیے صرف ایک نصیحت ہے ﴿۱۰۴﴾

تفسیر ومعارف

علمِ غیب اللہ کریم کا خاصہ ہے:

انبیاء علیہم السلام کے علوم بے پناہ ہوتے ہیں، بے حساب ہوتے ہیں۔ لیکن جو بات اللہ کریم اپنی حکمت سے ان سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں، وہ انبیاء علیہم السلام بھی نہیں جان سکتے۔ یعقوب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے، جنہیں اللہ نے بے پناہ علوم عطا کر رکھے تھے لیکن جدائی کے بعد انہیں یوسف علیہ السلام کے احوال کی کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ انہیں یہ پتا تھا کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں اور چونکہ خوابِ یوسف بھی وحیٔ الٰہی تھا کہ آپ کو حکومت وسلطنت بھی ملے گی۔ لہٰذا یعقوب علیہ السلام کو یقین تھا کہ یہ سب ہوگا۔ مگر یوسف علیہ السلام کہاں اور کس حال میں ہیں، وہ نہیں جانتے تھے۔ اب جب وقت آیا تو جونہی قافلہ مصر سے نکلا وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ جب وہ لوگ قافلہ بن کر، یوسف کا کُرتا لے کر مصر سے نکلے۔ قَالَ اَبُوْهُمْ یعقوب علیہ السلام جو اپنے گھر میں تشریف فرما تھے، فرمانے لگے، اِنِّیْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ۝ اگر تم میرا مذاق نہ بناؤ اور اس بات کو غلط نہ سمجھو تو آج مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔ مولانا رومیؒ نے اسے خوبصورت انداز میں منظوم کیا ہے۔

کسے پرسید آں گم کردہ فرزند
کہ اے روشن گہر پیر خرد مند

کسی نے حضرت یعقوبؑ سے پوچھا جو بہت بزرگ، روشن دماغ، دانشمند تھے اور جو اپنا بیٹا کھو چکے تھے۔

ز مصرش بوئے پیراہن
چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

کہ مصر سے یوسفؑ کا کُرتا نکلا اور آپؑ نے کنعان میں یوسفؑ کی خوشبو محسوس کر لی۔ مگر جب وہ آپؑ کے شہر کنعان کے کنویں میں پڑے رہے تو آپؑ کو کیوں خبر نہ ہوسکی کہ یوسفؑ کنویں میں ہے؟ مصر تو بہت فاصلے پر ہے جبکہ کنواں تو آپؑ کے شہر کے ساتھ والے جنگل میں تھا۔ یہاں آپؑ کو خبر نہ آئی اور مصر سے اُن کے کُرتے کی خوشبو آپؑ نے سونگھ لی۔

بگفت حالِ ما برقِ جہاں است
دمِ پیدا دمِ دیگر نہاں است

انہوں نے فرمایا، ہمارے مشاہدات ایسے ہوتے ہیں جس طرح آسمان پر بجلی چمکتی ہے تو روئے زمین کو روشن کر دیتی ہے، اور نہیں چمکتی تو گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ کوئی چیز اگر اللہ بتانا چاہتے ہیں تو وہ واضح ہو جاتی ہے، اور جس پر پردہ رکھنا چاہتے ہیں اس کی ہمیں سمجھ نہیں آتی۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

اور فرمایا، کبھی تو اللہ کے عرشوں سے بھی اوپر عالمِ امر ہماری زد میں ہوتا ہے اور کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ہمیں اپنے پاؤں کی پشت بھی نظر نہیں آتی۔ جو ہر ایک کے سامنے ہوتی ہے، وہ بھی ہماری نظر سے گم ہو جاتی ہے۔

تو یہ اعلام من اللہ ہوتا ہے۔ جو چیز وہ بتانا چاہتا ہے، وہ واضح ہو جاتی ہے اور جو اللہ نہیں بتانا چاہتا، وہ سمجھ نہیں آتی۔ گویا علمِ غیب اللہ کریم کا خاصہ ہے اور اللہ کریم کے علاوہ کسی کو غیب میں دخل نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو بے پناہ مغیبات پر اطلاع دی جاتی ہے لیکن وہ اطلاع عن الغیب ہوتی ہے، یعنی غیب پر خبر کر دی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی شان اور اس کی اپنی عظمت ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ جب یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے تو جو لوگ پاس تھے، وہ کہنے لگے کہ آپ کو یوسف کے اس پرانے خیال نے نہیں چھوڑا۔ یہ آپ کے دل میں ویسا ہی تازہ ہے۔ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ جب قافلہ پہنچا اور وہ خوشخبری دینے والا شخص جس کے پاس یوسفؑ کا کُرتا تھا، وہ حضرت یعقوبؑ کے پاس پہنچا۔ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا وہ کُرتا حضرت یعقوب علیہ السلام کے رخِ انور پر ڈالا تو اُن کی بینائی بحال ہوگئی۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ مجھے یہ علم تھا کہ میرا بیٹا سلطان ہوگا، اللہ کا

نبی ہوگا، حکمران ہوگا۔ لیکن اس دوران اس پر کیا بیت رہی ہے؟ اس سے میں لاعلم تھا۔

محتاط کلام، انبیاء علیہم السلام کی شان:

تب بھائیوں نے دست بستہ عرض کی، قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ (۹۷) والدِ گرامی! ہم نے غلطی کی تھی، ہم قصوروار ہیں، ہم نے بہت بڑا جرم کیا تھا۔ اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ آپؑ ہمارا گناہ معاف کردیجیے۔ ہم آپؑ کے بھی گناہگار ہیں، یوسفؑ کے بھی گناہگار ہیں۔ آپؑ ہماری خطا معاف کردیجیے۔ ہم نے بہت بڑی خطا کی تھی۔ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ فرمایا، میں جلد اپنے پروردگار سے تمہارے لیے معافی چاہوں گا۔

یوسف علیہ السلام نے تو فوراً فرمادیا، لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ! آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا لیکن یعقوب علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا، بلکہ انہوں نے فرمایا، میں اللہ سے جلد تمہارے لیے معافی چاہوں گا۔ چونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملے میں بھائیوں نے یوسف علیہ السلام سے زیادتی کی تھی تو یوسف علیہ السلام نے فوراً معاف فرمادیا۔ لیکن یعقوب علیہ السلام نے معاف نہیں فرمایا، بلکہ سوچا کہ زیادتی تو یوسفؑ کے ساتھ ہوئی، یوسفؑ سے بات کر کے یہ معافی ہوگی۔ اس نے معاف کیا تو میں بھی تمہارے لیے دعا کروں گا۔ اتنی احتیاط ہوتی ہے انبیاء علیہم السلام کے کلام فرمانے میں۔

بھائیوں نے تمام اہل خانہ سے کہا، چھوڑو یہ کچے مکان اور کچے برتن، اور سب لوگ مصر جانے کی تیاری کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے کنبے کے افراد کی کل تعداد نوے اور سو کے درمیان تھی جو مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۹۹) پھر یہ سب مصر میں آباد رہے۔ یوسف علیہ السلام کے بعد پھر فرعونوں کا دور آیا جنہوں نے انہیں غلام بنالیا اور ان پر بے پناہ مظالم توڑے۔ تا آنکہ کہ موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے، وہ انہیں لے کر نکلے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تو بنی اسرائیل کی تعداد ساڑھے سات لاکھ تھی۔ یعنی جو سو (100) افراد گئے تھے، وہ ساڑھے سات لاکھ ہوچکے تھے۔ حالانکہ فرعونیوں نے بے شمار قتل کیے، بے حد مظالم ڈھائے۔

جب اہل خانہ مصر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام شہر سے باہر استقبال کے لیے تشریف لائے۔ والدین کا استقبال کیا، بھائیوں کو ساتھ لیا۔ فرمایا، وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ آپ شہر میں داخل ہوں، آپ مصر میں چلیے۔ یہ ملک آپ کا خادم ہے، آپ کے لیے ہے۔ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ اللہ نے چاہا تو یہاں آپ کے لیے امن ہی امن ہے، سلامتی ہی سلامتی ہے، کسی طرح کا دکھ یا تکلیف نہیں ہوگی۔ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَي الْعَرْشِ آپؑ نے اپنے والدین، بھائیوں اور

اہل خاندان کو بہت بڑے تخت پر جگہ دی، جس پر آپؑ خود جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا اور سب یوسفؑ کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ یوسف علیہ السلام نے عرض کیا، ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے۔ میرا وہ خواب سچ ہو گیا کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا میرے پروردگار نے میرا خواب سچ کر دِکھایا۔

تعبیر ظاہر ہونے کے وقت کا تعین:

کشف، الہام، القا، یا خواب ہو تو ممکن ہے کہ جیسا کسی نے دیکھا ہو ویسا ہی ہو جائے لیکن کب ہو، وقت کا تعین کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ اللہ کے علم میں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے چھ یا سات سال کی عمر میں خواب دیکھا اور وہ اس وقت پورا ہوا جب یوسف علیہ السلام پچاس برس کے ہونے والے تھے۔ اس سارے عرصے میں آپؑ کتنے ہی نشیب و فراز سے گزرے۔

سجدۂ تعظیمی:

سجدۂ تعظیمی جو بادشاہوں کو کیا جاتا تھا اور جو سجدہ ہم صلوٰۃ میں ادا کرتے ہیں، دو الگ شئے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے پیش ہو کر جھک کر، بادشاہ کو جو ادب واحترام پیش کیا جاتا ہے، اسے سجدہ کہہ دیا جاتا ہے۔ جن ممالک میں بادشاہت ہو، وہاں ہر شخص دربار میں اسی طرح جھک کر ہاتھ باندھ کر آداب کرتا ہے، اسی کو سجدہ کہا گیا ہے۔ لیکن سجدے کی وہ صورت جو ہم صلوٰۃ میں اختیار کرتے ہیں کہ دونوں ہاتھ بھی، پیشانی بھی زمین کو چھوئے، ناک بھی زمین کو چھوئے، اللہ کی بڑائی بیان کی جائے۔ یہ سجدہ کسی بھی شریعت میں اللہ کے علاوہ کسی کے لیے کرنا جائز نہیں تھا اور نہ ہے۔ ہاں! تعظیم کرنا، کسی کی عظمت کا اقرار کرنا، اس کے سامنے جھک جانا ہی سجدہ کہلاتا تھا۔ ایسا ہی سجدہ آدم علیہ السلام کو کروایا گیا اور وہی سجدہ سلاطین کو بھی کیا جاتا تھا، اور آج بھی کرتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں۔ لیکن آج بھی بادشاہوں کو سر جھکا کر تعظیم دی جاتی ہے۔

تو فرمایا، وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ اللہ کے بندے ہمیشہ ہر حال میں شکر گزار ہوتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، اللہ کے احسانات ہی شمار کرتے جا رہے ہیں۔ کسی دُکھ کا ذکر نہیں فرما رہے۔ فرمانے لگے اللہ کا کتنا احسان ہے کہ مجھے جیل سے رہائی دلائی اور میرے ماں باپ کو، بھائیوں کو دیہات سے اٹھا کر مصر جیسے عظیم شہر میں لے آئے اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فتنہ فساد ڈالا۔ وہ میری مخالفت میں بہت دور نکل گئے، لیکن اللہ نے کرم فرمایا

کہ وہ ساری تلخیاں بھلا کر ہم بھائی پھر اکٹھے ہو گئے، ہم ایک جان ہو گئے۔ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ بے شک میرا پروردگار جو چاہتا ہے، اس کی بہت خوبصورت تدبیر کرتا ہے۔ بہت اچھے طریقے اور نپے تلے انداز سے چیزوں کو وہاں تک پہنچا دیتا ہے اِنَّہٗ ہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ (۱۰۰) بے شک وہ جاننے والا بھی ہے اور دانا تر بھی ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ کام اپنے مقرر اور متعین وقت پر ہوں لیکن جو چاہتا ہے اسے بڑے خوبصورت انداز سے انجام تک پہنچا دیتا ہے۔

پھر اللہ کریم سے مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں، رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡکِ اے اللہ! تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے سلطنت اور ملک کی حکومت عطا کی۔ اس کا مطلب ہے کہ نیک لوگوں کے پاس اقتدار و اختیار ہونا ممنوع نہیں ہے۔ یہ جو مروجہ سوچ ہے کہ نیک لوگوں کو صرف مسجد میں رہنا چاہیے، اللہ اللہ کریں، قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ انہیں بھلا سیاست سے کیا لینا دینا، انہیں ملک کی تقدیر سے کیا غرض؟ یہ انتہائی غلط سوچ ہے اور ایسا سوچنا حماقت ہے۔ اگر نیک لوگ ان کاموں سے الگ ہو جائیں اور ملک صرف بدکاروں کے ہاتھ آ جائے تو یہی حشر ہوتا ہے۔ ہر میدان میں اللہ کے بندوں کا وجود ہی باعث برکت ہوتا ہے۔

اللہ کے نبی علیہ السلام اللہ کی عطا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرماتے ہیں، وَعَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ اللہ! تیرا احسان ہے کہ مجھے علم تعبیر سے نوازا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا فرماتے ہوئے کہتے ہیں، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۟ اَنۡتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ اے ارض و سماء کے بنانے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا دوست ہے، تو ہی میرا کارساز ہے، تیرے ہی کرم سے سارے کام ہو رہے ہیں۔ دنیا میں تو نے مجھے حکومت و سلطنت دی، نبوت کے عالی مقام سے سرفراز فرمایا۔ اب مجھ پر یہ مہربانی بھی فرما کہ مجھے تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا اسی حالت میں، اسی ایمان میں، اسی اسلام میں موت دینا وَاَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ (۱۰۱) اور آخرت میں مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل رکھنا۔

نبوت وہبی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ لیکن جب عطا ہوتی ہے تو نبیؑ کی ذات کا وصف بن جاتی ہے، سلب نہیں کی جاتی، واپس نہیں لی جاتی۔ اس کے باوجود اللہ کے نبی علیہ السلام دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اسی حالتِ ایمان میں دنیا سے اٹھانا اور اپنے نیک بندوں میں شامل کرنا۔

ہم آج اگر اپنا حال دیکھیں تو ہم ہمیشہ دنیا کے شکوے کرتے رہتے ہیں۔ اپنی دعاؤں میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمیں مرنا بھی ہے، موت سے ہمکنار ہونا ہے۔ اللہ ہمیں دین پر، اسلام پر، مسلمانوں کے ساتھ موت نصیب فرمائے اور آخرت میں ہمیں نیک لوگوں کا ساتھ نصیب ہو۔ (آمین!) اور یہ کہنا تب ہی زیب دیتا ہے کہ بندہ دنیا میں

نیکی کا ساتھ دے تو آخرت میں بھی نیکوں کا ساتھ طلب کرسکتا ہے۔ لیکن دنیا میں اگر ہم بدکاروں سے چمٹے رہیں تو یہ عجیب بات ہے کہ ہم آخرت میں نیکوں کا ساتھ ملنے کی امید رکھیں۔ جو ہم میں اکثریت کا حال ہے کہ زندگی میں جو جی چاہے کرتے رہیں، مرنے کے بعد لوگ شہید کہنا شروع کر دیں۔ ساری زندگی اللہ کا نام لینا گوارا نہیں کرتے، نہ نماز آتی ہے نہ وضو کرنے کا طریقہ آتا ہے۔ ساری زندگی بدکاروں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں اور جب مرجاتے ہیں تو لیبل لگ جاتا ہے کہ شہید ہو گئے۔ مرنے کے بعد تو ہر کوئی مانے گا، شہادت دے گا کہ اللہ ہے، آخرت ہے، لیکن اگر زندگی میں نہیں مانا تو محض لیبل لگانے سے بات نہیں بنتی۔ زندگی میں شہید ہونا چاہیے۔ اپنی ان خواہشات کو شہید کرنا چاہیے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہیں۔ اپنے نفس کے اُن مطالبات کو شہید کرنا چاہیے پھر خود کو بھی شہادت نصیب ہو جاتی ہے۔

فرمایا، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ اے میرے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ غیب کی باتیں ہیں جو کوئی نہیں جانتا تھا۔ یوسف علیہ السلام کو گزرے صدیاں بیت چکی ہیں۔ مفصل قصہ کہیں بیان نہیں ہوا۔ پہلی کتابوں میں تحریف کر دی گئی اور لوگوں نے اپنی مرضی سے کمی بیشی کر دی۔ یوں اصل حقائق پوشیدہ ہو گئے۔ ہم نے بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتا دیں یعنی یہ مغیبات تھے، ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے آگاہ فرما دیا۔ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ﴿۱۰۲﴾ جب یعقوب (علیہ السلام) کے بیٹے، یوسف علیہ السلام کو قتل کرنے کے مشورے کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ باتیں پہلے گزر چکی ہیں۔

فیصلے کا اختیار:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ(۱۰۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مسلمان ہو جائے لیکن ایسا کیسے ممکن ہے؟ لوگوں کے پاس اختیار ہے، میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چاہنے سے تو نہیں ہوگا۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد کوئی جہنم میں نہ جائے۔ آج بھی نبوت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے اور آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی چاہتے ہیں۔ آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا تو یہی ہے کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہوں۔ اب یہ لوگوں کا فیصلہ ہے کہ وہ کس کے دامن سے جا لپٹتے ہیں۔ اللہ نے انہیں اختیار دیا ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پھر اتنے کرم کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عالم یہ ہے وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا کوئی معاوضہ نہیں طلب کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے کچھ نہیں چاہتے، کچھ بھی نہیں لیتے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۴﴾ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں یہ تو پورے جہانوں کے لیے نصیحت ہے، خیر خواہی ہے، بھلائی ہے۔

سورۃ یوسف رکوع 12 آیات 105 تا 111

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے ﴿۱۰۵﴾ اور ان کے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر وہ (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں ﴿۱۰۶﴾ تو کیا یہ اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر اللہ کا عذاب نازل ہو کر ان کو ڈھانپ لے یا ان پر اچانک قیامت آ جائے اور

ان کو خبر بھی نہ ہو ﴿۱۰۷﴾ فرما دیجیے میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر (دلیل و برہان سے) میں بھی اور میرے پیرو بھی۔ اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے جتنے (رسول) بھیجے ہیں سب آدمی ہی تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے تو کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں سو دیکھ لیتے جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا۔ اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہت بہتر ہے جو پرہیز گار ہیں پس کیا تم سمجھتے نہیں ﴿۱۰۹﴾ یہاں تک کہ جب پیغمبرؑ (ان سے) مایوس ہو گئے اور انہوں (کفار) نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا تو ان (انبیاء علیہم السلام) کے پاس ہماری مدد آ گئی پھر جسے ہم نے چاہا بچا دیا اور ہمارا عذاب (اترنے کے بعد) گناہگاروں سے پھرا نہیں کرتا ﴿۱۱۰﴾ یقیناً ان کے قصے میں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے یہ (قرآن) ایسی بات نہیں جو (اپنی طرف سے) بنالی گئی ہو لیکن جو (کتابیں) اس سے پہلے ہیں ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر بات کی تفصیل بتانے والا اور ایمان والوں کے لیے ذریعۂ ہدایت اور رحمت ہے ﴿۱۱۱﴾

تفسیر و معارف

ہدایت پانا آسان ہے:

وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ يَمُرُّوۡنَ عَلَيۡهَا وَهُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُوۡنَ اللہ کی عظمت کی بے شمار نشانیاں ہیں جن سے ہر شخص کو دن رات سابقہ رہتا ہے۔ لیکن لوگ اس کی پروانہیں کرتے، ان نشانیوں سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم الشان گزشتہ قصہ عین حق کے مطابق بیان فرما دیا، اس کی جزئیات تک بیان کر دیں تو یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ بلکہ اللہ کی کائنات میں، زمینوں آسمانوں میں کتنے عجائبات ہیں جن کو ہر جاہل و عالم، نیک و بد روزمرہ دیکھتے ہیں۔ تحقیقات کرنے والے چاند ستاروں پر کمندیں

ڈالتے ہیں۔ نظامِ کائنات کی باریکیوں کو دیکھتے ہیں تو اللہ کی عظمت کی ان نشانیوں کو دیکھ کر وہ کیوں اس نتیجے پر نہیں پہنچتے کہ اس سارے نظام کو بنانے والا، چلانے والا ایک اللہ ہی ہے۔

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ(۱۰۶) بلکہ اکثریت کا عالم یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے بجائے اس کے بے شمار شریک گھڑ لیتے ہیں۔ جس چیز میں کوئی عجیب بات نظر آئے، اسی کو سجدے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ تو مخلوق ہے۔ اس میں یہ عجیب صفت کس نے پیدا کی، وہ کون ہے جس نے اِسے بنایا؟

فَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ(۱۰۷) کیا یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اچانک اللہ کا عذاب آجائے اور انہیں تباہ کر دے، پھر انہیں توبہ کی فرصت بھی نہ ملے۔ قیامت قائم ہو جائے گی تو عمل کا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ پھر تو جزا کا دور شروع ہو جائے گا۔ پھر ماناتو کیا مانا!

قرآن کا ہر حکم عقل سلیم کے مطابق:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ(۱۰۸) فرمایا، یہ میرا راستہ ہے، شریعت اسلامیہ کا ہر حکم ہر اعتبار سے صحیح ترین راستہ ہے۔ اسلام کے احکام کو دنیوی اعتبار سے دیکھیں یا تاریخی اعتبار سے، مُنَزَّل من اللہ کتاب کی حیثیت سے دیکھیں یا عقلی دلائل سے تجزیہ کر لیں، شریعت کا ہر حکم متوازن، معتدل اور وقت کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ اس میں نہ صرف نظامِ حیات کے تمام شعبوں کا احاطہ ہے بلکہ دوستی دشمنی، صلح و جنگ، سیاست و حکومت، سے لے کر نکاح و طلاق، والدین و اولاد سے سلوک، افراد، معاشرہ سے معاملات تک تمام کام کرنے کے طریقے ایسے ہیں کہ ہر طبقہ کے لیے موزوں اور بہترین ہیں۔ تمام شرعی احکام کا منتہائے نظر یہ ہے کہ بندے کو اللہ سے ملا دیں۔ یعنی دنیا کا جو کام بھی وہ کرے، وہ درست ہو، سلیقے سے ہو، اور اس کے نتیجے میں وصالِ الٰہی از خود ملے۔

بدعت اللہ سے دوری:

اگر کوئی اسلام کے نام پر بدعتیں شروع کر دے تو اس نے راستہ بدل لیا۔ لُغوی معنوں میں بدعت سے مراد ہے نیا کام شروع کرنا۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد وہ کام ہے جس کی اصل عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہؓ اور سلف صالحین کے ہاں نہ ملتی ہو، اور ایسے ایجادِ بندہ کام کو باعث ثواب مانا جائے۔ وہ کوئی کام بھی ہو مثلاً اس زمانے میں چائے نہ تھی، اب لازماً پی جاتی ہے جو ایک مباح عمل ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ چائے پینا باعث ثواب ہے تو یہ عمل بدعت ہو جائے گا۔ یعنی ایسا کام جس کی اصل عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں نہ ہو، جس کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہ دیا ہو،

کوئی دلیل سلف صالحین سے نہ ملتی ہو، اسے ثواب کہنے سے وہ کام بدعت بن جاتا ہے۔ کسی مباح عمل کو مباح کہنے سے نہیں، جائز کہنے سے نہیں، باعث ثواب کہنے سے بدعت بن جاتا ہے۔

آج تو اتنی باتیں گھڑی جا چکی ہیں اور پھر انہیں باعث ثواب سمجھا جاتا ہے۔ جیسے مخصوص رات کو حلوہ پکانا جبکہ اس کی اصل شریعت میں نہیں ہے۔ ایسی رات تو عہدِ نبوی میں بھی آتی تھی، دورِ صحابہؓ میں بھی آتی تھی، تو کیا عہدِ نبوی ﷺ میں یہ سب کچھ ہوتا تھا، کیا عہدِ صحابہؓ میں ایسا ہوا؟ یہ تو کھانا پینا ہے، اسے کسی رات سے مخصوص کر کے عبادت سمجھنا بدعت ہے۔ ہر رات نوافل پڑھنا ثواب ہے، لیکن اپنی طرف سے خاص طریقے مقرر کر کے، خاص راتیں مخصوص کر کے اسے باعث ثواب سمجھنا بدعت ہے۔ اصول یہ ہے کہ جس کام کی اصل شریعت میں ہے، وہ درست ہے اور جس کام کی اصل شریعت میں نہیں اور اسے دین کا حصہ بنا کر، اس پر عذاب و ثواب کا عقیدہ رکھا جائے تو یہ بدعت ہے۔

حضور ﷺ فرما رہے ہیں، ھٰذِہٖ سَبِیۡلِیۡۤ یہ میرا راستہ ہے جو بالکل سیدھا اور واضح ہے۔ میرے راستے کا ہر کام بندے کو اللہ سے ملا دیتا ہے۔ بندہ راستے میں کہیں نہیں رکتا لیکن بدعات راستہ روک دیتی ہیں۔ کفر و شرک تو ہے ہی گمراہی، وہ تو اُلٹا چلنے کا نام ہے۔ لیکن بدعت ایسی گمراہی ہے کہ اللہ سے دوری ہی اس کا نتیجہ ہے۔

فرمایا، عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ ہم اندھا دھند حکم نہیں دیتے، ہر حکم عقل سلیم کے عین مطابق ہوتا ہے۔ دنیوی اعتبار سے بھی موزوں اور اخروی اعتبار سے سرخروئی کا باعث ہوتا ہے، جو انسانی شعور، صالح مزاج اور عقل کا تقاضا ہے، وہی اسلام کا حکم ہے۔

معلوم ہوا کہ جو لوگ اس موزوں ترین راستے کو چھوڑ کر، رواجات کی پیروی میں لگ جاتے ہیں، بدعات و خرافات کا راستہ اپنا لیتے ہیں، وہ آپ ﷺ کے راستے پر نہیں ہیں۔ آپ ﷺ کا راستہ سیدھا، صاف، واضح، اللہ سے ملانے والا، واصل باللہ کرنے والا ہے۔ وَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (۱۰۸) اللہ پاک ہے، بلند تر ہے اور میں ہرگز بدعات، خرافات، رسومات میں کھو کر شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ جو کوئی بھی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے، اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

انبیاء علیہم السلام بشر ہوتے ہیں:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰی مشرکین کہتے تھے کہ آپ (ﷺ) کے تو بیوی بچے ہیں، آپ (ﷺ) تو شہروں میں رہتے بستے ہیں، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے

ہیں، ایک انسان کی زندگی گزارتے ہیں۔ تو فرمایا، ذرا ان سے پوچھیں جو انبیاؑ علیہم السلام پہلے آتے رہے، کیا وہ انسان نہیں تھے؟ پہلے بھی تو مرد ہی تھے، جن پر ہم نے وحی کی۔ وہ لوگوں میں رہنے بسنے والے تھے، شہروں، دیہاتوں میں عام لوگوں کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

یہاں لفظ رِجَالاً استعمال ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جتنے نبیؑ بھی تھے، وہ مرد تھے۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی عورت کبھی نبی نہیں ہوئی یعنی سر براہی کرنا، فیصلے کرنا یہ خواتین کا کام نہیں، یہ مردوں کا منصب ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اگر بعد میں کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ کریم فرماتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو ہوگا وہ بھی مرد ہوگا لیکن یہاں بعد کی بات نہیں ہے۔

فرمایا۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کیا تم لوگوں نے زمین پر پھر کر نہیں دیکھا کہ تم سے پہلے جو قومیں گزریں ان کا کیا انجام ہوا۔ روئے زمین کے تاریخی آثار دیکھ کر تم اندازہ نہیں لگاتے کہ کیسی بڑی بڑی ہستیوں کا نشان نہیں ملتا۔ کتنے ایسے محلات تھے جن کے کھنڈر بھی نہیں ملتے۔ کتنے ایسے محلات ہیں جو محفوظ ہیں، سیر گاہیں بنے ہوئے ہیں، لیکن ان کی رونقیں کہاں ہیں؟ کہاں گیا وہ شاہی دبدبہ، طاقت کا گھمنڈ، شہرت کا غلغلہ، مخملی پردے اور غلاف! کچھ بھی تو نہیں تو تمہیں سمجھ نہیں آتی کہ تم سے پہلے جو لوگ دنیا میں آئے، جنہوں نے انبیاؑ علیہم السلام سے مقابلے کیے، وہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں آ کر تباہ ہو گئے۔ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰۹) کیا تم میں اتنی عقل بھی نہیں کہ یہ سمجھ سکو کہ آخرت کا گھر ہمیشہ کا گھر ہے۔ وہ گھر صرف اہلِ تقویٰ اور نیک لوگوں کا گھر ہے۔ برائی کر کے کوئی آخرت میں کامیابی نہیں پا سکتا۔ اور نیکی تو صرف اتباعِ رسالت کا نام ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ فرمایا، انبیاؑ کرامؑ پر بھی مشکل وقت آئے، قوموں نے بہت تنگ کیا، مقابلے پر آ گئیں حتیٰ کہ انبیاؑ علیہم السلام بھی یہ سوچنے لگے کہ یہ لوگ اتنے بپھر چکے ہیں کہ ہماری بات نہیں سنیں گے، یہ ہمیں نقصان پہنچانے پر تُل چکے ہیں، تو اس حالت میں ہماری مدد انبیاؑ علیہم السلام کے پاس پہنچ گئی۔ جن کو ہم چاہتے تھے، ہم نے انہیں محفوظ رکھا۔ ہم نے انبیاؑ علیہم السلام کو محفوظ رکھا اور جو انبیاؑ علیہم السلام کی مخالفت کرتے تھے، ان پر عذاب نازل فرما کر تباہ کر دیا۔ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۱۰) اور مجرموں سے ہمارا عذاب ہٹایا نہیں جا سکتا۔

اللہ کے عذاب سے خلاصی:

دہشت گردی تو عذابِ الٰہی ہے، جس میں پوری قوم مبتلا ہے۔ ہر کوئی چاہتا ہے کہ یہ ختم ہو جائے، لیکن یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ عذابِ الٰہی تو ہم پر اس لیے وارد ہو چکا ہے کہ ہم جرم کرتے ہیں اور جرم چھوڑنے کی بات نہیں کرتے۔ سود کھاتے ہیں اور سود چھوڑنے کی بات نہیں کرتے۔ دہشت گردی سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں، لیکن بدکاری اور شراب خوری کے اڈے بند نہیں کرنا چاہتے۔ جس درخت پر عذاب کا پھل آ رہا ہے، اس کی جڑوں کو پانی بھی دے رہے ہیں اور اس کی حفاظت بھی کر رہے ہیں تو اس پر پھل تو آئے گا۔ یہاں بھی یہی قانون بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ کے عذاب سے جان چھڑانی ہے تو جرم چھوڑ دو، دیانت دار ہو جاؤ، عقیدہ درست کرلو، ناپ تول پورا کرو، حلال کھاؤ، حرام سے بچو۔ نکاح کرو، فحاشی چھوڑ دو، جرم چھوڑ دو گے تو سزا معاف ہو جائے گی۔ لیکن جو جرم پر ڈٹے رہتے ہیں، ان پر سے عذاب الٰہی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۱۱) اہلِ بصیرت کے لیے تو ان قصوں میں بہت ہی عبرت کا سامان ہے۔ قرآنِ کریم ایسا کلام نہیں جو کسی نے اپنے پاس سے بنالیا ہو۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں، جو کسی نے خود گھڑلی ہو۔ پہلی کتابیں بھی اِس کی تصدیق کرتی ہیں اور قرآن بھی اُن کی تصدیق کرتا ہے۔ آج تک جتنے صحیفے، جتنی کتابیں اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں، سب کی تصدیق کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم زندگی کے تمام اُمور کو مفصل بیان کرتا ہے۔ جینے سے مرنے تک پوری زندگی کی تفصیل بیان کرتا ہے اور اس میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف بتا دیتا ہے کہ یہ کرنا ہے اور یوں کرنا ہے۔ بلکہ یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ کس طرح کرنے سے اللہ کی رحمت ملتی ہے اور کون سا عمل اللہ سے دُور لے جاتا ہے۔ یقیناً قرآن حکیم ایمان والوں کے لیے ذریعۂ ہدایت اور رحمت ہے۔

سورۃ الرعد رکوع 1 آیات 1 تا 7

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ① اَللّٰهُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّكُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ② وَهُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ وَجَعَلَ فِیۡهَا رَوَاسِیَ وَاَنۡهٰرًا ؕ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیۡهَا زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَكَّرُوۡنَ ③ وَفِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّزَرۡعٌ وَّنَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّغَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَنُفَضِّلُ بَعۡضَهَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ④ وَاِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِهِمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ⑤ وَیَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ وَقَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلۡمِهِمۡ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ⑥ وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ اٰیَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ⑦

الٓمّٓرٰ ۔ یہ کتاب (الہٰی) کی آیات ہیں اور جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے بالکل سچ ہے ولیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۱﴾ اللہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے اونچا کھڑا کر دیا (جیسا کہ) تم دیکھ رہے ہو پھر عرش پر قائم ہوا اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا۔ ہر ایک، ایک مقررہ معیاد تک گردش کر رہا ہے وہی (اللہ) ہر ایک کام کی تدبیر فرماتا ہے (اور) دلائل کو تفصیل سے بیان فرماتا ہے تاکہ تم اپنے پروردگار کے پاس جانے پر یقین کرو ﴿۲﴾ اور وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا فرمائے اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسمیں پیدا فرمائیں، ڈھانک دیتا ہے رات سے دن (کی روشنی) کو، بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے بہت سے دلائل موجود ہیں ﴿۳﴾ اور زمین میں کئی طرح کے کھیت ہیں پاس پاس اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں بعضے تو ایسے ہیں کہ ایک تنے سے اوپر جا کر دو تنے ہو جاتے ہیں اور بعضے نہیں ہوتے (باوجودیکہ) سب کو ایک پانی دیا جاتا ہے اور ہم بعض (پھلوں) کو بعض پر کھانے میں (لذت میں) فضیلت بخشتے ہیں۔ بے شک ان امور میں (بھی) سمجھداروں کے لیے دلائل (موجود) ہیں ﴿۴﴾ اور اگر آپ کو تعجب ہوا تو (واقعی) ان کا یہ کہنا عجیب ہے کہ جب ہم (مر کر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے منکر ہوئے اور ایسے ہی لوگوں کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہ لوگ دوزخ کے رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۵﴾ اور یہ لوگ آپ سے عافیت (بھلائی) سے پہلے مصیبت (برائی) کا تقاضا (مطالبہ) کرتے ہیں اور یقیناً ان سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے اور بے شک آپ کا پروردگار لوگوں کو باوجود ان کی ناانصافیوں کے معاف فرمانے والا ہے اور یقیناً آپ کا پروردگار سخت سزا دیتا ہے ﴿۶﴾ اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر (وہ) معجزہ (جو وہ چاہتے ہیں)

ان کے رب کی طرف سے کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ بے شک آپ (انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے راہنما ہوا کرتا ہے ﴿۷﴾

تفسیر ومعارف

سورۃ الرعد ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ سورۃ یوسف کے آخر میں توحید باری، اوصافِ باری، عظمت الٰہی کا جو بیان ہے، اسی کا تسلسل ہے۔ اس میں بجلی کی کڑک کا ذکر ہے کہ وہ بھی اللہ کی عظمت کا ایک نشان ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "الرعد" رکھا گیا۔

الٓمّٓرٰ حروفِ مقطعات ہیں جن کے معنی اللہ کریم جانتے ہیں، یا اللہ کے رسول ﷺ کو اللہ نے بتائے ہیں۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ ایک ایسی کتاب کی آیات ہیں جو آپ ﷺ کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئیں۔ یہ عام کتاب نہیں ہے، نہ کسی انسان کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ کلامِ باری ہے جو اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر نازل ہوا اور اس کی صفت اَلْحَقّ ہے۔ اس کا حرف حرف سچ ہے۔ یہ اتنی جامع ہے کہ اس میں گزشتہ اقوام کے واقعات سے لے کر آئندہ زمانوں تک کے لیے راہنمائی کا سامان ہے۔ زمین وآسمان، ستاروں اور سیاروں سے لے کر تحت الثریٰ تک کائناتِ بسیط کے احوال پر بحث کرتی ہے اور اس کی ارشاد کردہ تمام معلومات حرف بہ حرف سچ ہیں، کوئی خبر غلط ثابت نہیں ہوسکتی۔

جب یہ کتاب نازل ہوئی تو آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے کا زمانہ تھا۔ اس وقت قرآنِ حکیم نے سورج اور چاند کے بارے جو حقائق ارشاد فرمائے، سائنس اپنی ساری ترقی کے باوجود صدیوں کی تحقیق کے بعد بمشکل آج ان حقائق تک پہنچی جو قرآن نے اس زمانے میں بیان کردیے، ورنہ اس وقت تو سائنس زمین کو ساکن سمجھتی تھی۔ انسانی وجود، انسانی نفسیات، انسانی کردار اور اس کے نتائج کے بارے قرآن کے پیش کردہ حقائق کبھی جھٹلائے نہیں جاسکے۔ صدیوں بعد آنے والے محققین کی تحقیق نے کسی کو غلط ثابت نہیں کیا بلکہ تمام تجربات ومشاہدات کے بعد بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو قرآن نے پیش کیا، وہ صحیح تھا۔

حقائق تو اپنی جگہ مسلّم ہیں وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱) لیکن ہر دور میں لوگوں کی اکثریت اس سے محروم رہتی ہے۔ قرآنِ حکیم کی برکات میں کبھی کمی نہیں آتی، کمی انسانی مزاج میں آجاتی ہے۔ اللہ کریم نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ خیر وشر میں سے جس راستے کا چاہے انتخاب کرلے۔ اب یہ ہر فرد کا ذاتی فیصلہ ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتا

ہے۔قرآنِ حکیم نے دونوں راستوں اوران کے انجام کوواضح کردیا ہے۔درست عقیدہ،یقینِ آخرت،حشر میں حساب کتاب کا یقین،اعمال کے نتیجے میں ثواب،بداعمالی پر عذاب،ان تمام حقائق کوکھول کھول کر بیان کردیا ہے۔یہ بھی واضح کردیا ہے کہ دُنیا میں جس قسم کا کردار ہوگا اس کا جہاں اخروی نتیجہ مرتب ہوگا،وہاں اس کا اثر دنیوی زندگی کو بھی متاثر کرے گا۔اگر کسی کا رزق حلال نہیں۔وہ سود لیتا ہے،چوری،رشوت اور ناجائز وسائل سے حاصل کرتا ہے تو اخروی اثر کے علاوہ دُنیا میں اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ حقائق قبول کرنے کی استعداد نہیں رہتی۔وہ اللہ کے کلام کا انکار کر بیٹھتا ہے۔حرام کھانے سے اس کا شعور مندمل ہوجاتا ہے،جھوٹ بولنے سے،سچ کہنے،اور سچ سننے کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔لوگوں کی اکثریت چونکہ صرف دُنیا کی طرف ہی مائل ہوجاتی ہے توان میں دُنیا کی محبت اتنی سرایت کرجاتی ہے کہ ان کی ہوس پوری ہی نہیں ہوتی۔وہ ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹتے رہتے ہیں۔جاہ وحشمت اور اقتدار وحکمرانی کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں۔اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایمان کی استعداد ضائع کردی جاتی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا لوگوں کی اکثریت اللہ کے کلام پر یقین نہیں رکھتی،ایمان نہیں لاتی،حالانکہ اللہ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی دیوار وستون کے لوگوں کے سروں پر تان رکھا ہے۔سائنسدانوں کی تحقیق کا میدان انسانی حواس کی حد تک ہے۔اسی لیے انہوں نے کہا،جہاں تک انسانی نگاہ کام کرتی ہے،وہ دیکھ سکتا ہے،جہاں سے قوتِ باصرہ کام کرنا چھوڑ دے،وہاں چیزیں نظر نہیں آتیں۔تو حد نگاہ کے بعد جو نیلگوں سی روشنی ہے،وہ اسی کو آسمان کہتے ہیں۔لیکن پھر بھی انکار نہیں کرتے۔کہتے ہیں ہوسکتا ہے اس سے آگے بھی آسمان ہی ہو۔حق یہ ہے کہ اپنے سارے عجائبات،سورج،چاند،ستاروں سمیت آسمان پورے کرۂ ارض کو محیط ہے۔ اللہ کریم آسمان کو اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر پیش فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمان کو بغیر کسی ستون اور سہارے کے بلند کر رکھا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ پھراس نے عرشِ عظیم کو معاملاتِ دُنیا کے فیصلوں کا مرکز بنادیا۔استویٰ کے لفظی معنی کسی جگہ کو مقرر کرلینے،قائم ہونے کے ہیں۔اللہ کریم کی ذات خالق ہے،محدود ہونا مخلوق کی صفت ہے۔تمام مخلوقات کی ایک ابتدا ہے،ایک انتہا ہے۔چھوٹے سے چھوٹا وجود ہو یا بڑے سے بڑا۔رائی ہے یا پہاڑ۔اس کی ابتدا بھی ہے،انتہا بھی۔اس کی بلندی بھی ہے،پستی بھی۔سب کچھ اس میں موجود ہے لیکن اللہ کی ذات ان تمام باتوں سے بالاتر ہے۔وہ خالق و مالک ہے۔وہ ویسا ہے جیسا اس کی شان ہے۔ہم اس کے لیے کوئی حدود مقرر نہیں کرسکتے۔جو حدود ہم مقرر کریں گے،وہ انسانی عقل کے مطابق ہوگی۔تو عقل تو خود مخلوق ہے۔مخلوق کی حدود میں جو کچھ آئے گا،وہ

بھی مخلوق ہی ہوگا۔ خالق اس سے بالاتر ہے۔

مفسرین کرام نے اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا یہی مفہوم لکھا ہے کہ اللہ کریم نے عرشِ الٰہی کو تمام تدبیراتِ دُنیا کا مرکز بنا دیا ہے۔ بعض فرقوں نے کہا ہے کہ عرش پر کرسی ہے اور کرسی پر اللہ کریم تشریف فرما ہیں (معاذ اللہ)۔ اگر یہ مانا جائے تو ذاتِ الٰہی کے لیے جسم ثابت ہوگا، حدود ثابت ہوں گی کہ ایک کرسی میں سما جائے۔ بڑی سے بڑی کرسی بھی ہو، پھر بھی اس کی حدود تو ہوں گی۔ اور اللہ وہ ذات ہے جو حدود سے بالاتر ہے۔ وہ ان سے ماوراء ہے۔ وہ ہر لمحہ، ہر آن، ہر جگہ موجود ہے۔ ہر شئے کو ذاتی علم سے جانتا ہے۔ اس نے عرش کو زمین کا قبلہ بنا دیا، جسے آج کی زبان میں سیکرٹیریٹ کہہ لیں، جہاں سارے فیصلے ہوتے ہیں، جہاں سے سارا نظام چلتا ہے اور نظامِ عالم کی تدبیر کی جاتی ہے۔

اللہ کریم نے زمین کو اپنی تخلیقات سے سجا کر اور بے پناہ مخلوق بنا کر زمین والوں کو یہ اختیار نہیں دے دیا کہ جو چاہیں کریں۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ کریم کرتے ہیں، اور فیصلے عرش پر ہوتے ہیں۔ دُنیا میں کوئی عظیم سے عظیم تر فرد بھی اُس وقت موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے، جب اس کے لیے عرش پر موت کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ جب اللہ کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو طاقتور ترین لوگ بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔ اپنی قوت و طاقت کے باوجود وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں تو بس اتنا ہی کرتے ہیں، جتنی اللہ کریم ان کو ہمت دیتا ہے۔ نیکی کرتے ہیں یا برائی، اللہ کی دی ہوئی طاقت کو استعمال کر کے کرتے ہیں۔ اس نے انسان کو فیصلہ کرنے کی اجازت خود دے رکھی ہے۔ وہ فرماتا ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ بے شک ہم نے اسے راہ بھی دکھا دی۔ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:3) چاہے تو شکر کا راستہ اختیار کرے، یا ناشکری کا۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ جب تک اللہ کریم چاہتے ہیں، یہ اپنے مقررہ راستوں پر گردش کرتے رہیں گے۔ آپ ان کے راستے بدلے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔ صدیوں سے جس راستے پر چل رہے ہیں اور جب تک اللہ نے چاہا، یہ چلتے رہیں گے۔ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ایک وقت آئے گا جب یہ بھی جھڑ جائیں گے۔ یہ اس کا فیصلہ ہے اور اس کی مرضی ہے۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ہر چھوٹے بڑے کام کا حکم اللہ ہی دیتا ہے اور اس کی تدبیر بھی وہی کرتا ہے۔ بارش کے ارب ہا قطرے برستے ہیں، ہر قطرہ وہیں پہنچتا ہے جہاں اس نے مقرر فرمایا ہوا ہے۔ بارش کا نظام بے ترتیب نہیں ہے کہ اندھا دھند برس جائے، جہاں چاہے برس جائے۔ ہر قطرہ مقررہ جگہ اور مقررہ وقت پر برسنے کا پابند ہے۔ یقیناً اللہ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔

کوئی کام بے نتیجہ نہیں:

اللہ کریم کے نظام کا ایک نتیجہ ہے۔ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ یہ باتیں کتنی تفصیل سے آپ کو بتادی گئی ہیں، ان سب کو دیکھ کر، غور کر کے انسان کو یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس جانے پر یقین کرلے کہ اتنا عظیم الشان اور اتنا مربوط نظام جس کے ایک سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے تک کو ایک ترتیب کا پابند کردیا گیا ہے، اس کا ایک مالک ہے جو اسے ایک انجام تک پہنچائے گا۔

کوئی پتا بغیر پروگرام کے نہیں پھوٹتا، بغیر پروگرام کے نہیں جھڑتا۔ گھاس کا کوئی تنکا وقت سے پہلے نہیں اُگتا، نہ اُگنے میں مقررہ وقت سے تاخیر کرتا ہے۔ اس وسیع کائنات کو بنا کر انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، ساری مخلوق اس کی خدمت پر لگا کر اسے اپنی ذات وصفات پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ احکام عطا فرمائے تاکہ وہ پاکیزہ زندگی گزارے اور اخروی سعادت حاصل کرے۔ یہ سارا نظام بتا رہا ہے کہ اگر انسان نافرمانی کرے گا تو اس کا برا انجام بھی ہوگا۔ اگر فرمانبرداری کرے گا تو اس کا اچھا نتیجہ بھی نکلے گا۔ اگر اچھائی اور برائی دونوں بے نتیجہ رہیں تو اس نظام کے بنانے کا کیا فائدہ؟ اس نظام کے بنانے کا کیا حاصل، جس کا کوئی نتیجہ ہی نہ ہو۔

ایک انسان بھی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بناتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ماچس کی ایک تیلی بھی آگ جلانے کے لیے بنائی جاتی ہے، محض شغل کے لیے نہیں۔ قادرِ مطلق نے اتنی وسیع کائنات بنادی تو اس کا بھی کوئی حاصل ہوگا، کوئی نتیجہ ہوگا! بنانے والے نے بتایا کہ جو میری اطاعت کریں گے، دامن صاف لائیں گے، ان پر احسان کروں گا، انعامات سے نوازوں گا۔ جو میری نافرمانی کریں گے انہیں سزا ملے گی۔ فرمایا، لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۲) قرآنِ حکیم میں یہ سارا تجزیہ اس لیے کیا گیا ہے کہ بندے کو سمجھ آجائے کہ یہ سب کچھ بے نتیجہ نہیں۔ ہم نے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ وہاں عقائد سے لے کر کردار تک تمام امور کا فیصلہ ہوگا۔

قدرتِ الٰہی کی نشانیوں سے عظمتِ الٰہی کا ادراک:

فرمایا، وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے زمین کو پھیلا دیا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ زمین تو بیضوی ہے، انڈے کی شکل جیسی ہے۔ بیضہ کی تمام اطراف گولائی میں ہوتی ہیں۔ اسے کہیں بھی رکھیں، اس کا ایک حصہ اوپر ہوگا، دوسرا نیچے۔ لیکن اوپر والا حصہ بھی سیدھا نہیں ہوگا، اور نہ نیچے والا، دونوں طرف ابھار ہوگا۔ اللہ کی قدرتِ کاملہ ہے کہ زمین کو بیضوی بنانے کے باوجود بچھا رکھا ہے۔ زمین کے گرد پورا چکر لگالیں، آپ کو زمین گول

دکھائی دے گی۔ زمین پر اتریں تو وہ بچھی ہوئی ملے گی۔ یہ معمولی بات نہیں۔ دُنیا میں سفر کرنے والوں کے احوال دیکھ لیں۔ آج جو لوگ وطن عزیز سے امریکہ جاتے ہیں، راستے میں برطانیہ سے ہو کر جاتے ہیں۔ جو مغربی امریکہ جاتے ہیں وہ جاپان جاتے ہیں، اور اُدھر سے ہو کر جاتے ہیں کہ انہیں اس طرح امریکہ نزدیک پڑتا ہے۔ یہ سفر کرنے والے سب دیکھتے ہیں کہ زمین تو گول ہے لیکن کہیں بھی جب زمین پر اترتے ہیں تو اسے پھیلا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہ معمہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک چیز کا وجود گول ہے لیکن وہ کہیں سے بھی گول نہیں ہے۔ اس پر چلتے ہوئے نہ کوئی ڈگمگاتا ہے، نہ گولائی کے باعث کوئی گرتا ہے۔ اللہ کریم نے اسے اس طرح بنایا ہے کہ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

وَجَعَلَ فِيۡهَا رَوَاسِىَ اس پر بڑے بڑے پہاڑ کھڑے کر دیے اور اس انداز اور حکمت سے کھڑے کیے کہ انہوں نے زمین کو ڈولنے سے بچا رکھا ہے۔ میخوں کی طرح زمین میں گاڑ رکھے ہیں۔ کہیں پہاڑ ہیں اور کہیں چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں۔ ساری زمین کا ایسا توازن قائم کر رکھا ہے کہ وہ ڈولتی نہیں۔ بچھونے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ وَاَنۡهٰرًا اور اس میں دریا جاری کر دیے۔ اس کی قدرت ہے کہ اسی پانی کو سمندروں سے اٹھا کر بادل بناتا ہے۔ ان سے بارش برساتا ہے۔ لیکن اسی بارش سے کہیں قطرے برس رہے ہیں، کہیں اولے پڑ رہے ہیں، کہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف بن کر گر رہے ہیں۔ وہ پہاڑ کروڑوں ٹن برف سروں پر اٹھا کر کھڑے ہیں۔ پھر وہ بارش پانی بن کر آہستہ آہستہ ان کی دراڑوں سے رستی رہتی ہے، نیچے پہنچ کر چشمے بنتے ہیں۔ چشمے، دریا بن جاتے ہیں۔ پوری روئے زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ قدرت کا یہ نظام صدیوں سے چل رہا ہے اور جب تک اللہ نے کائنات کو رکھنا ہے جاری رہے گا۔ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيۡهَا زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ اس میں اللہ نے بے پناہ پھل پیدا فرمائے۔ زمین کے سینے کو ان سے ڈھانپ دیا۔ ان میں انسان کی غذا بھی ہے، اور دوا بھی۔ اللہ کریم نے پھل دار درختوں کو بھی جوڑا جوڑا بنایا۔ نر درخت کا زردانہ کبھی اڑ کر مادہ درخت پر گرتا ہے، کبھی مکھیوں کے پاؤں سے لگ کر پہنچ جاتا ہے، کبھی پرندوں کے پاؤں سے لگ کر مادہ درخت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا سلسلہ پھل دار درختوں میں بھی جاری کر رکھا ہے۔ ان کو بھی جوڑا جوڑا بنا رکھا ہے۔

يُغۡشِى الَّيۡلَ النَّهَارَ اسی طرح دن کی روشنی پر رات کا پردہ ڈال دیتا ہے۔ وہ خالق ہے، اسے معلوم ہے کہ انسان دن بھر کام کاج کرتا رہتا ہے تو رات کو اس کے اعضاء بے دم ہو جاتے ہیں، اس لیے اس نے رات بنائی ہے کہ جسم کے اعضاء میں جو کمزوری آ گئی ہے، سونے سے ان کی تعمیر نو ہو جائے۔ رات کو تھکن سے چور ہو کر لیٹتا ہے تو صبح تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے۔ اس نے دن کی روشنی کو رات کی تاریکی سے ڈھانپ دیا ہے۔ اگر صرف رات ہی رہتی تو

مشکل ہوتی اور صرف دن ہی رہتا تو بھی مشکل ہوتا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۳) جو لوگ تفکر کرتے ہیں، ان کے لیے اس میں عظمتِ الٰہی کی بڑی بڑی دلیلیں موجود ہیں۔ ان دلائل سے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیسا قادر اور مدبرُ الامر ہے اور اس نے کس طرح ہر چیز کو ایک ترتیب سے نظام میں پرو رکھا ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ اس نے زمین کے ایک قطعے میں مختلف خصوصیات رکھ دی ہیں۔ زمین کی گود سے کہیں تیل نکل رہا ہے، کسی حصے سے سونا اگل رہا ہے، کہیں سے چاندی برآمد ہو رہی ہے اور کہیں سے جواہرات۔ زمین ایک ہی ہے لیکن اس کے مختلف ٹکڑوں میں مختلف خصوصیات ہیں۔ یہ سونا چاندی، جواہرات، پھل پھول کیسے بنتے ہیں؟ اسی زمین میں ان سب کے اجزاء پنہاں ہیں۔ وہ جب ایک خاص نسبت سے جڑتے ہیں تو سونا بن جاتا ہے، دوسری نسبت سے جڑتے ہیں تو چاندی بن جاتی ہے، تیسری نسبت سے جڑتے ہیں تو ہیرا بن جاتا ہے۔ کون ہے جو ان نسبتوں کو جوڑتا ہے، کس نے زمین کے اندر مختلف خصوصیات جمع کر رکھی ہیں! کاشتکار جانتے ہیں کہ کس زمین میں کون سی فصل بہتر نشوونما پائے گی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ بارش ایک ہی ہے، ایک ہی زمین پر برستی ہے لیکن روئیدگی مختلف ہوتی ہے۔ ایک زمین مونگ پھلی کے لیے موزوں ہوتی ہے اور دوسری گندم کے لیے۔ ایک قطعۂ زمین میں دالیں اچھی اُگتی ہیں اور دوسرے قطعے میں باجرہ اچھا ہوتا ہے۔ یہ سب حادثاتی طور پر نہیں ہوتا۔ یہ محض اتفاقات نہیں ہیں۔ یہ اس کی قدرتِ کاملہ ہے۔ وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ کسی ٹکڑا زمین میں انگور پھلتا پھولتا ہے وَزَرْعٌ اور دوسرے میں فصلیں پھلتی پھولتی ہیں وَنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ کہیں کھجوروں کے درخت کھڑے ہیں جن میں سے بعض کا ایک ہی تنا ہے اور بعض دو تنوں والے ہیں۔ ہر ایک پر پھل آتا ہے۔ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ باوجود اس کے کہ سب کو ایک ہی پانی دیا جاتا ہے، سب کے ذائقے جدا ہیں، سب کی تاثیر الگ ہے۔ فرمایا، صرف ذائقہ ہی مختلف نہیں وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ بلکہ کھانے میں کسی کی لذت کسی سے بڑھ کر ہے۔ ہر پھل کی لذت اپنی ہے، خوشبو اپنی ہے جبکہ سب کو ایک ہی پانی ملتا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴) جن لوگوں میں کچھ عقل باقی ہوگی، جن کی خرد کچھ کام کر گئی، ان کے لیے عظمتِ الٰہی کے بڑے دلائل ہیں۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو اس سب کو بنانے والی ہے اور پورے کنٹرول کے ساتھ اسے چلا رہی ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ فرمایا، انہوں نے آپ کو اپنی باتوں سے حیران کر دیا۔ واقعی ان کا قول عجیب ہے۔ یہ کہتے ہیں اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا پھر ہم دوبارہ نئی مخلوق بن کر

کھڑے ہو جائیں گے؟ ان جاہلوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ زمین پر بے پناہ گھاس اُگتی ہے اور خشک ہو کر مٹی بن جاتی ہے، کیا وہ دوبارہ نہیں اُگتی، ایک ایک درخت پر ہزاروں پتے ہوتے ہیں، خزاں آتی ہے تو خشک ہو کر جھڑ جاتے ہیں، مٹی میں مل جاتے ہیں۔ کیا اس درخت پر دوبارہ پتے نہیں اُگتے؟ زمین میں بیج ڈالتے ہیں، کھیتیاں اگتی ہیں، فصل برداشت کر لیتے ہیں، پھر اس زمین پر نئی فصل کاشت کرتے ہیں، کیا وہ نہیں اُگتی؟ صدیوں سے زمین خزانے اگل رہی ہے، کھیتیاں اگتی ہیں، ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر دوبارہ اگتی ہیں۔ درختوں پر ہر موسم کا پھل آتا ہے۔ موسم ختم ہو جاتا ہے۔ اگلے موسم میں دوبارہ درخت پھل سے لد جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی دنیوی عمر بھی ختم ہو جائے گی، پھر وہ برزخ میں رہے گا۔ جب قیامت قائم ہو گی تو دوبارہ بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔

یہ کیسے لوگ ہیں کہ اپنے سامنے بے حساب چیزوں کو بار بار بنتا، ختم ہوتا اور دوبارہ بنتا دیکھتے ہیں لیکن اپنے دوبارہ زندہ ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ انہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ ان کی پیدائش سے پہلے بھی تو ان کے ذراتِ بدن منتشر ہی تھے۔ ہر پیدا ہونے والے انسان کے اجزاء دُنیا میں کہاں کہاں پھیلے ہوتے ہیں۔ انسان کی غذا و دوا مٹی کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ کہیں سے گندم آتی ہے، کہیں سے چاول، کہیں سے دودھ، کہیں سے مصالحے اور کہیں سے جڑی بوٹیاں۔ یہ سب مٹی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ہر وجود تک وہ غذا پہنچتی ہے جو اُس کا حصہ ہے، جو حصہ ازل میں اللہ نے مقرر کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ اتفاقاً نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ رزق ہے جو ایک ترتیب کے ساتھ ہر شخص تک پہنچتا رہتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ جو غذا والد کھاتا ہے، اس میں سے جو حصہ اس کی اولاد کا ہے، وہ اس کے صلب میں محفوظ ہوتا رہتا ہے۔ صلبِ پدر سے جب رحمِ مادر میں منتقل ہوتا ہے تو جو غذا ماں کھاتی ہے، اس میں سے جو حصہ بچے کے لیے مقرر ہے، اس سے بچے کا وجود بنتا ہے۔ جو ہستی اتنی باریکی سے انسانی اجزاء کی نشوونما کر رہی ہے۔ انسانی اجزاء کو اکٹھا کر رہی ہے، تقسیم کر رہی ہے، اس کی قدرتِ کاملہ کے لیے کوئی دشوار نہیں کہ وہ مر کر مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ بنا کھڑا کرے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی باتوں پر حیران ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں واقعی ایسی ہیں کہ ان پر حیران ہوا جائے۔ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں کہ بے شمار چیزیں ان کے سامنے ہر لحظہ نمودار ہو رہی ہیں، فنا ہو رہی ہیں، پھر بن رہی ہیں تو ایک اپنے وجود کے بارے انہیں یہ تعجب ہے کہ یہ دوبارہ کیسے بنے گا!

حق کو نہ پہچاننے کا سبب:

فرمایا، یہ اس لیے ایسی عجیب باتیں کرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں کفر کی تاریکی ہے۔ کفر ایسی تاریکی ہے کہ حق دیکھنے، حق سننے، حق پہچاننے سے عاری کر دیتی ہے۔ انہیں حق نظر نہیں آتا۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے

ہیں۔ اللہ کریم ارشاد فرمارہا ہے۔ قرآنِ حکیم انہیں دعوتِ حق دے رہا ہے لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی عظمت کا انکار کرتے ہیں وَاُولٰٓئِکَ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِہِمْ اور ان کے گلوں میں بڑے وزنی طوق پڑیں گے۔ جس کے گلے میں منوں وزنی طوق ہو وہ تو جہاں بیٹھا ہو وہیں بندھا رہے گا۔ اسے اٹھا کر کہیں جا نہیں سکے گا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کفر کی مثال ایسے طوق کی ہے جو بندے کو تاریک گوشے میں بٹھائے رکھتا ہے۔ روشنی تک نہیں جانے دیتا۔ اسے روشن دلائل تک جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ فرمایا، انہوں نے اپنے گلے میں بڑے بڑے وزن باندھ لیے ہیں اور اپنی اسی تاریک کوٹھری میں پڑے ہیں، باہر نکل کر دیکھنے کی استعداد ہی نہیں رکھتے۔

دو عالم کی تباہی کا سبب:

دُنیا کی ہر مصیبت اپنی جگہ بہت تکلیف دہ ہے۔ مفلسی، بھوک، بیماری، سب مصائب تکلیف دہ ہیں لیکن یہ سب قابلِ برداشت ہیں۔ کوئی شاید بھوک سے مر جائے، بیماری سے مر جائے لیکن شاید اس کا اگلا جہان روشن ہو۔ شاید بیماری سے مرنے والے کو، قتل ہو جانے والے کو اللہ معاف فرما دے، اگلے جہان کے انعامات سے نواز دے۔ لیکن کفر ایسی لعنت ہے کہ نہ اس دُنیا میں جینے دیتا ہے، نہ اُس دُنیا میں جینے دے گا۔ نہ بندہ مر سکے گا، نہ جی سکے گا۔ فرمایا، وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ان کے افکار، عقائد اور ان کے کردار وزنی طوق بن کر ان کے گلے میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس بوجھ کے باعث اندھیرے گوشے میں پڑے ہیں۔ ھُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ (۵) کفر کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہمیشہ دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ کفر ایسی لعنت ہے کہ عقل کو بھی ماند کر دیتی ہے۔ دل کو بھی تباہ کر دیتی ہے، روح کو بھی برباد کر دیتی ہے اور مر کر بات ختم نہیں ہوتی، آگے بھی ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنا پڑے گا۔ (اللہ پناہ دے) وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبْلَ الْحَسَنَۃِ فرمایا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ اگر اللہ کے سچے نبی ہیں تو ہم پر عذاب لے آیئے۔ یعنی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکات سمیٹنے کے یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قابلِ حیرت بات ہے کہ جب ان پر عذاب آ جائے گا تو یہ جہنم میں جا گریں گے۔ پھر اس مطالبے کا بھلا انہیں کیا فائدہ ہوگا؟ فرعون نے بھی عذاب کو دیکھ کر یہی کہا تھا کہ میں موسیٰؑ کے ربّ پر، بنی اسرائیل کے ربّ پر ایمان لاتا ہوں تو اللہ نے فرمایا، آٰلْئٰنَ وَقَدْ کُنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (الزمر: 59) اب مانتا ہے، اب تو تجھے موت کے فرشتے نظر آ گئے ہیں، اب تو دوزخ تیرے سامنے ہے۔ اب

ایمان لانے کا وقت گزر گیا۔ جب تیرے پاس مہلتِ عمل تھی تو تب تو کافروں کا سردار بنا ہوا تھا۔ تب تُو انکار کرتا تھا، نہیں مانتا تھا۔ آج میں نہیں مانتا۔

ایک حکایت:

کسی گاؤں میں ایک بزرگ تھے۔ فقیر منش آدمی تھے۔ کسی نے انہیں ایک دن ایک بڑے شہر میں دیکھا تو حیرت سے پوچھا، آپ یہاں کیسے؟ کہنے لگے میں بندوں میں اور اللہ کریم میں صلح کرانا چاہتا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ بندوں میں اور اللہ میں پیار محبت ہو جائے۔ پوچھا، تو پھر کچھ حاصل ہوا؟ کہنے لگے، اللہ کریم تو مانتے ہیں، بندے نہیں مانتے۔ کچھ عرصہ بعد اس کا گزر ایک قبرستان سے ہوا۔ دیکھا کہ وہ بزرگ قبرستان میں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہیں۔ لوگوں سے تنگ آ کر شہر چھوڑ کر شہر سے باہر قبرستان میں جھگی ڈال کر وہاں رہنے لگے ہیں۔ پوچھا، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگے، یہاں بھی یہی کوشش کر رہا ہوں کہ بندوں میں اور اللہ کریم میں صلح ہو جائے۔ پوچھنے والے نے پوچھا، تو کیا نتیجہ ہوا؟ کہنے لگے، اب یہ قبروں میں پڑے ہوئے تو مانتے ہیں لیکن اب اللہ کریم نہیں مانتے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں، وہ وقت گزر گیا۔

کفار بھی بجائے آپ ﷺ کی برکات پانے کے، آپ ﷺ سے کہتے ہیں کہ پہلے آپ عذاب لے آئیں پھر ہم مانیں گے۔ پھر ان کے پاس ماننے کی فرصت کہاں ہوگی؟ یہ کیسے بے شعور ہیں، یہ نہیں جانتے کہ عذاب آ گیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے، پھر یہ کیا دیکھیں گے، کیا توبہ کریں گے، پھر برکاتِ نبوت کہاں سے پائیں گے؟ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ایسی مثالوں سے تو انسانی تاریخ بھری پڑی ہے۔ انہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ قوموں نے جب بھی انبیاء کی مخالفت کی ان پر عذاب آئے اور وہ تباہ ہو گئیں۔ کبھی بارش کی جگہ آگ برسی، پتھر برسائے گئے، سیلاب سے غرق ہوئے، طوفان اور چنگھاڑ سے تباہ و برباد کر دیے گئے۔ کون سا عذاب ہے جو واقع نہیں ہوا تو انہیں کیوں سمجھ نہیں آتی؟

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ اللہ پھر بھی کتنا کریم ہے آپ ﷺ کا پروردگار کتنا صاحبِ رحمت ہے کہ اس طرح کے جاہلوں کو بھی پال رہا ہے۔ اپنے نبی ﷺ کے ساتھ انہیں جھگڑا کرتے دیکھ رہا ہے پھر بھی انہیں رزق دیے جا رہا ہے، زندگی اور صحت دیے جا رہا ہے اور مُہلت دیے جا رہا ہے کہ کبھی تو توبہ کر لو۔

قرآنِ حکیم کے ان مبارک الفاظ میں ایک لطیف نکتہ پنہاں ہے۔ وَاِنَّ رَبَّكَ میں حضور ﷺ کو خطاب فرمایا جا رہا ہے "بے شک آپ کا پروردگار" گویا فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کا پروردگار آپ ہی کا ہے۔ کسی دوسرے کو وہ کیفیت نصیب نہیں۔ اسی طرح ہر بندے کا اپنے عقیدے، ایمان اور عمل کے مطابق پروردگار سے اپنا تعلق ہے، جس کے سبب ہر بندے کا اپنا پروردگار ہے۔ اس کے ایمان اور عقیدے کے مطابق۔ پروردگار تو

ایک ہی ہے۔ اس کی ذات میں تو کوئی تغیر و تبدل نہیں ہے۔ البتہ ایمان اور عقیدے کے حساب سے درجات ہیں۔ سب سے اعلیٰ درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے کہ جیسا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ربّ ہے، ویسا کسی کا نہیں۔ جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ربِّ کریم سے تعلق ہے، ویسا کسی کا نہیں۔

فرمایا، آپ کا پروردگار کتنا صاحبِ بخشش ہے کہ لوگ ظلم کرتے ہیں، کفر و شرک کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اعلیٰ عہدے، مال و دولت عطا کرتا ہے۔ زندگی کی مُہلت دیتا ہے کہ توبہ کرلو۔ ایسا رحیم و کریم ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ گار کی توبہ قبول کرلیتا ہے، جب وہ توبہ کرلے۔ یہ نہیں کہتا کہ تمہاری عمر توسو (100) سال ہوگئی ہے اور سو سال تم نے ضائع کردیے، اب چند دن کی زندگی باقی ہے تو توبہ کررہے ہو۔ وہ کریم ایسا نہیں کہتا۔ وہ ایسا مہربان ہے کہ فرماتا ہے، میں نے تمہاری توبہ قبول کرکے پچھلے سو سال کے گناہ معاف کردیے۔ بلاشبہ وہ ایسا مہربان ہے کہ لوگ ظلم کرتے ہیں، وہ درگزر فرماتا ہے۔ لیکن یہ مت بھولو جس کا انجام ظلم پر ہوگا، اس پر غضب بھی بڑا ہوگا وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيۡدُ الۡعِقَابِ(۶) آپ کے پروردگار کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔ اس کی سزائیں بھی بڑی سخت ہیں۔

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ اور کافر تو یہ چاہتے ہیں کہ جو مطالبہ ہم کرتے ہیں، ان کا رب وہی معجزہ ظاہر کردے۔ ہر نبیؑ کا معجزہ انؑ کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے۔ معجزہ کہتے ہی اس فعل کو ہیں جس کی کوئی عقلی توجیح نہ ہو۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات بے پناہ ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآنِ حکیم ہے، لیکن کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معجزات دکھانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں ہی ہر عمل کے اس انجام سے باخبر کردیں جس کا نتیجہ میدانِ حشر میں سامنے آئے گا۔ اس سے بڑا معجزہ کیا ہوگا کہ بندہ یہاں دُنیا میں بیٹھا جو کچھ سوچ رہا ہے، نظریہ و کردار اپنا رہا ہے، اسے اس کا وہ نتیجہ یہیں بتادیا جائے جو تب پتا چلے گا جب میدانِ حشر میں انصاف کی عدالت لگے گی۔ بندے کے نظریے و کردار کا نتیجہ نکلے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ بندے کو آگاہ کردیا جائے کہ جو قدم آج اٹھا رہے ہو، روزِ حشر اس پر کیا پھل لگے گا۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہوگا؟ فرمایا، ان جاہلوں کو یہ پتا نہیں کہ جب کوئی قوم اپنے نبیؑ سے معجزہ طلب کرتی ہے، وہ معجزہ جب ظاہر ہوجائے اور لوگ نہ مانیں تو کیسی تباہی آتی ہے۔ ابوجہل نے مطالبہ کیا تھا کہ اگر چاند دو ٹکڑے ہوجائے تو میں مان لوں گا اور جب ایسا ہوگیا تو اس نے نہیں مانا تو کس ذلت سے مارا گیا، قوم کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ بدر میں تہس نہس ہوگیا۔

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ(۷) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تو یہ ہے کہ آپ انہیں آنے والے خطرات سے آگاہ فرمائیں، اور ہم نے ہر قوم کو انبیاءؑ کی برکات سے نوازا ہے۔ جو یہ برکات نہیں لیتا وہ خود بدنصیب ہے۔ اللہ کریم نے تو ہر خطہءِ زمین پر جہاں جہاں انسان آباد تھے، وہاں انبیاءؑ مبعوث فرمائے اور حق کی آواز پہنچانے کا ہمیشہ پورا اہتمام کیا۔

سورۃ الرعد رکوع 2 آیات 8 تا 18

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝٨ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝٩ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝١٠ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝١١ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝١٢ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۝١٣ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝١٤ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩ ۝١٥ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ

جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ڛ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٧﴾ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ړ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ڏ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾

اللہ کوخبر رہتی ہے جوکسی عورت کوحمل رہتا ہےاور جو کچھ (ماں کے) پیٹ کے اندر کمی اور بیشی ہوتی ہے اور ہر شے اس کے نزدیک ایک اندازے سے (مقرر) ہے ﴿۸﴾ وہ پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے سب سے بڑا (اور) عالی شان ہے ﴿۹﴾ (اس کے نزدیک) برابر ہے تم میں کوئی بات کو چھپائے یا اسے پکار کر کہے (ظاہر کرے) اور جو شخص رات کو کہیں چھپا رہے اور دن (کی روشنی) میں کہیں چلے پھرے ﴿۱۰﴾ اس کے آگے اور پیچھے اُس (اللہ) کے چوکیدار (فرشتے) ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ واقعی اللہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں فرماتے جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر مصیبت کا ارادہ فرمالیتے ہیں تو اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں رہتی اور اُس (اللہ) کے سوا کوئی ان کا مددگار نہیں ہوتا ﴿۱۱﴾ وہی تو ہے جو تم کو بجلی دکھاتا ہے جس میں ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی اور بھاری بادل پیدا فرماتا ہے ﴿۱۲﴾ اور گرجنے والا اس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی تعریف کے ساتھ اور فرشتے (بھی)

اس کے خوف سے۔ اور وہی بجلیاں بھیجتا ہے پھر جس پر چاہتا ہے انہیں گرا (بھی)
دیتا ہے اور وہ اللہ کے بارے جھگڑا کرتے ہیں۔ اور وہ بڑی قوت والا ہے ﴿۱۳﴾
اسی کے لیے پکارنا سچا ہے اور جن کو یہ لوگ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی
درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے مگر جیسے کوئی شخص پانی کی طرف اپنے
دونوں ہاتھ پھیلا دے تا کہ وہ اس کے منہ تک (اڑ کر) آ جائے اور وہ (از خود) اس
(کے منہ) تک آنے والا نہیں اور کافروں کی پکار محض بے کار ہے ﴿۱۴﴾ اور اللہ
کے سامنے ہر کوئی سجدہ کرتا ہے (سر خم کیے ہوئے ہے) جو کوئی آسمانوں میں اور
زمین میں ہے خوشی سے اور مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ
کرتے ہیں) ﴿۱۵﴾ آپ کہیے کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ فرما
دیجیے اللہ ہے (پھر) آپ (یہ) کہیے کہ کیا تم نے اس کے سوا مددگار قرار دے
رکھے ہیں جو خود اپنے نفع ونقصان کا بھی کچھ اختیار نہیں رکھتے فرمائیے کیا اندھا اور
آنکھوں والا برابر ہیں؟ یا اندھیرا اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں؟ یا انہوں نے جو اللہ
کے شریک قرار دے رکھے ہیں تو انہوں نے (کسی چیز کو) پیدا کیا جیسے وہ (اللہ)
پیدا کرتا ہے پھر ان کو پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو؟ فرما دیجیے کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا
کرنے والا ہے اور وہ یکتا (اور) غالب ہے ﴿۱۶﴾ اسی نے آسمان پانی (مینہ)
برسایا پھر اس سے اپنی مقدار کے مطابق نالے بہہ نکلے پھر وہ سیلاب
خس وخاشاک بہا لایا جو اس (پانی) کے اوپر آ رہا اور جن چیزوں کو زیور بنانے کے
لیے یا سامان بنانے کے لیے آگ کے اندر تپاتے ہیں ان میں بھی ایسا ہی میل
(اوپر آ جاتا) ہے اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں سو جو میل
(جھاگ) ہوتا ہے تو وہ ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے
کارآمد ہوتی ہے پس وہ زمین میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتی ہے اسی طرح اللہ
مثالیں بیان فرماتے ہیں ﴿۱۷﴾ جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے حکم کو قبول کیا

ان کی حالت بہت اچھی ہوگی اور جن لوگوں نے اس کو قبول نہ کیا اگر روئے زمین کے سارے خزانے ان کے بس میں ہوں اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی تو وہ نجات کے بدلے دینا چاہیں (تو بھی نجات کہاں) ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے ﴿۱۸﴾

تفسیر و معارف

علمِ الٰہی:

فرمایا، اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۸) اللہ کریم کائنات کے ہر ذرّے سے ذاتی طور پر واقف ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہر چیز ہمہ وقت اللہ کریم کے روبرو ہے۔ انسانوں کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ وہ جو من مانیاں کرتے ہیں تو انہیں کوئی دیکھ نہیں رہا۔ حق تو یہ ہے کہ جب کسی مادہ کو حمل رہ جاتا ہے تو کوئی نہیں جانتا، لیکن اللہ کریم جانتا ہے۔ سب نگاہوں سے اوجھل شکمِ مادر کے اندر جو وجود پرورش پاتا ہے، اس کی ساری تفصیل اس کے علم میں ہے۔ کس طرح وہ پلتا، بڑھتا ہے، کس طرح ذرّہ ذرّہ مل کر وجود بنتا ہے، سب اس کے سامنے ہے۔ وہ خود اسے بناتا ہے۔ اس میں کیا کمی و بیشی ہوتی ہے، کتنے Cells مرتے ہیں، کتنے نئے بنتے ہیں، ہر ایک کو وہ اپنے دستِ قدرت سے بناتا ہے۔ اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔ ہر چیز کا ایک ضابطہ ہے، قاعدہ ہے۔ اس کے مطابق چیزیں بنتی بڑھتی ہیں۔ شکمِ مادر کے اندر کے حالات سے بھی وہ ویسے ہی واقف ہے، جیسے باہر سے۔ لیکن انسان کام کرتے ہوئے اکثر اس غلط فہمی کا شکار رہتا ہے کہ شاید مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا۔

سائنسی تحقیق:

سائنس نے بہت ترقی کی اور ایسی مشینیں بنائیں، یہ جاننے کے لیے کہ شکمِ مادر میں پلنے والا بچہ نر ہے یا مادہ۔ جبکہ یہ بھی ایک اندازہ ہی رہا۔ حالانکہ پیدا ہونے والے کا صرف یہی حال تو نہیں ہوتا کہ وہ نر ہے یا مادہ۔ سائنس یہ اندازہ تو لگا سکتی ہے کہ پیدا ہونے والا بچہ نر ہے یا مادہ، لیکن یہ جاننا کہ اس کی شکل کیسی ہوگی، کردار کیسا ہوگا، اس کی سوچ و فکر کیسی ہوگی، عمر کتنی ہوگی، رزق کتنا پائے گا، رتبہ کیا پائے گا، اس کے ساتھ کیا بیتے گا؟ یہ صرف اللہ کے علم میں ہے، اور اللہ کا علم وسیع تر ہے۔

آج سائنس کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ انسانی وجود میں دس کھرب سیل (Cell) ہیں اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ ہر Cell میں ایک کتاب (DNA) ہے۔ اگر اس کتاب کو کھولا جائے تو اس میں اس کی پوری زندگی کے حالات درج ہیں۔ سائنسدانوں کا دعویٰ ہے کہ اگر وہ کتاب پڑھی جا سکے تو اس میں اس حد تک تفصیل موجود ہے کہ کس عمر میں اس شخص کا پہلا بال سفید ہوگا، کون سا دانت کب گرے گا، کس دانت میں کب درد ہوگا، کب وہ بیمار ہوگا، کب صحت مند ہوگا، کیا قد کاٹھ ہوگا، کتنی عمر پائے گا؟ جس قادرِ مطلق نے ہر Cell میں پوری زندگی کی داستان لکھ کر رکھ دی ہے، وہ خود اس سے کس قدر واقف ہوگا؟ یہ تو اس نے مخلوق کے لیے رکھ دی ہے۔ تو خود جو اس کتاب کا بھی خالق ہے، اس کے علوم کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ ہم ایک Cell کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ بدن میں دس کھرب Cell ہیں۔ تو یہ بدن کا کتنا معمولی سا کوئی ذرہ ہوگا جس میں پوری زندگی کی کتاب لکھ کر اس خالق نے رکھ دی ہے۔ سائنس اس کتاب کو DNA کہتی ہے۔ یہی وہ قاعدہ یا Pattern ہے جس کے مطابق وجود بنتے، بڑھتے ہیں۔ قرآن کریم بھی یہی اطلاع دے رہا ہے کہ اس جنین کی ساری حالت سے اللہ کریم ہر آن واقف ہے اور اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے، جس کے مطابق وہ جنین بھی بنتا، گھٹتا، بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ جو چیزیں ہم غائب سمجھتے ہیں یا ہم سے غائب ہیں، اُن کو بھی وہ ایسے ہی جانتا ہے جیسے ظاہر چیزوں کو جانتا ہے۔ اس کا علم حضوری ہے۔ اس کی بارگاہ میں سب حاضر ہیں۔ اس کے سامنے کوئی غائب نہیں۔ غائب و حاضر کو ایک سا دیکھتا ہے، ایک سا جانتا ہے۔ اور وہ بہت عالی شان، بہت بڑا، بہت عظیم، بے مثل و بے مثال ہے۔ وہ واحد ہے، لاشریک ہے، اس جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ کوئی اس کی عظمت کو نہیں پہنچتا۔

انسان بڑی کوشش کرتا ہے، پس دیوار ہو کر کام کر لیتا ہے۔ تاریکی میں کر لیتا ہے۔ لوگوں سے چھپ کر کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ لیکن اللہ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ فرمایا، سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ کوئی کام تم سر بازار کرو یا زمین کی تہوں میں چھپ کر کرو، اللہ کے لیے برابر ہے۔ وہ سرِ بازار عمل کو بھی ویسا ہی دیکھتا ہے جیسے زیرِ زمین کو یا پوشیدہ عمل کو۔ اللہ کریم سے کسی کا کوئی حال پوشیدہ نہیں، اس کے علم سے غائب نہیں۔ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (۱۰) کوئی راتوں کو چھپ کر چلتا ہے یا دن کی روشنی میں چلتا ہے، علمِ الٰہی میں برابر ہے۔

اسلام اللہ کے روبرو زندگی بسر کرنے کا نام ہے:

ہمیں زندگی اللہ کے روبرو بسر کرنی ہے۔ اللہ کریم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی اس ایک

بات پر کسی کو ایمان نصیب ہو جائے، یقین و اعتبار نصیب ہو جائے تو اس کی اصلاح کے لیے یہ ایک عقیدہ کافی ہے۔ اسے سمجھ آ جائے کہ جو بات کرتا ہوں، اللہ کریم سن رہے ہیں۔ جو سوچتا ہوں، وہ بھی اللہ کریم کے سامنے ہے، جو کر رہا ہوں، وہ بھی اللہ کریم کے سامنے ہے تو یقیناً اس کی اصلاح کے لیے کافی ہے۔ اگر وہ برائی بھی مخلوق سے چھپ کر کرنا پسند کرتا ہے تو اللہ کے سامنے کرنے کی جرأت کیوں کرتا ہے؟ گناہ گار بھی ہو تو اس میں اتنی حیا تو ہوتی ہے کہ کوئی برائی لوگوں کے سامنے نہ کی جائے۔ کوئی چوری کرتا ہے تو وہ بھی یہ اہتمام کرتا ہے کہ لوگوں سے چھپ کر کی جائے۔ چوری ہوتی ہی وہ ہے جو لوگوں سے چھپ کر کی جائے، جو سامنے کی جائے وہ تو سینہ زوری ہوتی ہے۔ تو اپنا بھرم رکھنے کے لیے ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اپنی کمزوریاں یا خامیاں دوسروں سے چھپا کر رکھوں، لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتا۔ تو جب یہ یقین ہو جائے کہ اللہ کریم سے کوئی حال بھی پوشیدہ نہیں تو اصلاحِ احوال نصیب ہو جاتی ہے۔ ہر بندے کو اللہ کے روبرو جینا ہے اور پھر اسی کے سامنے حساب بھی دینا ہے۔

حفاظتِ الٰہیہ:

وہ اتنا کریم ہے کہ اس نے انسانوں کی حفاظت کا ایک عجیب و غریب، دکھائی نہ دینے والا نظام بنا دیا ہے۔ الا ماشاء اللہ! جسے اللہ دل کی نگاہ عطا کر دیں، اس کی نظر پڑ جائے تو یہ اللہ کا احسان ہے ورنہ عام آدمی کو نظر نہیں آتا۔ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اللہ کریم نے ہر فرد کے ساتھ کچھ فرشتے چوکیدار مقرر کر دیے ہیں جو ہر وقت اس کو گھیرے رہتے ہیں، اس کی حفاظت پر متعین ہیں۔ رات دن اس کے ساتھ رہتے ہیں اور اسے مختلف پریشانیوں سے بچاتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پتیؒ اپنی معرکۃ الآرا تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ اگر یہ محافظ فرشتے نہ ہوتے تو انسانوں کو تباہ کرنے کے لیے جنّ ہی کافی تھے۔ شیاطین تو پھر ان سے بھی بڑے ہیں۔ پریشان کرنے کے لیے کافر جنّات ہی کافی تھے۔ انسانوں کی تباہی کے لیے یہی کافی تھے۔ ہر انسان پر اللہ کریم نے محافظ فرشتے مقرر کر دیے۔ وہ انسان اللہ کو مانتا ہے یا نہیں، اطاعت کرتا ہے یا نہیں، مومن ہے یا کافر، لیکن زندہ تب تک ہی رہتا ہے، سلامت تب تک ہی رہتا ہے جب تک اللہ کے فرشتے اس کے وجود کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ فرشتے صرف حفاظت ہی نہیں کرتے بلکہ انسانی وجود کا سارا نظام چلاتے ہیں۔ ہم جو لقمہ منہ میں لیتے ہیں، چباتے ہیں، حلق سے اترتا ہے، پھر کس جزو کو کہاں پہنچنا ہے، کس کا خون بنتا ہے، کن اجزاء سے گوشت بننا ہے؟ کن اجزاء سے ہڈیاں بنتی ہیں، کس نے فضلہ بن کر خارج ہونا ہے۔ یہ سارا نظام، انسانی بدن پر مقرر فرشتے چلاتے ہیں۔ آج کے دور میں جس طرح کمپیوٹرائزڈ مشینیں ہیں، لیکن ان کو بھی آپریٹر (Operator) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کمپیوٹر

(Computer) کو آپریٹر ہی چلاتا ہے، آگے کمپیوٹر مشین کو چلاتا ہے۔ تو انسانی بدن کی مشین پر فرشتے آپریٹر مقرر ہیں۔ جب انسان پر بیماری آتی ہے تو اس حصے پر کام کرنے والے فرشتے کو کام میں کمی یا روک دینے کا حکم ہو جاتا ہے۔ تو وہاں بیماری شروع ہو جاتی ہے۔ جب اُسے کام کرنے کا حکم ہو جاتا ہے تو بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے۔

جنّات:

جنّات کا وجود ناری ہے۔ انسان سے پہلے زمین پر اللہ کریم نے جنّات آباد فرمائے تھے۔ صاحب ''حیاتِ الحیوان'' نے ایک حدیث شریف نقل فرمائی ہے کہ آپ ﷺ نے آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے اس عہد میں یہ فرمایا کہ زمین پر جس قدر انسان بستے ہیں، جنّات کی تعداد اُن سے نوگنا زیادہ ہے۔ چونکہ وہ کئی ہزار سال پہلے سے بستے آرہے ہیں۔ اور فرمایا انسانوں اور جنّات کی مجموعی تعداد سے نوگنا زیادہ تعداد شیاطین کی ہے جو ابلیس کی اولاد میں سے ہیں۔ جنّات چونکہ ناری وجود رکھتے ہیں اس لیے یہ ہوا میں ہی نہیں بلکہ آسمانوں تک پرواز کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ بعثت عالی سے پہلے، جنّات کہتے ہیں کہ ہم نے آسمانوں میں بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوتی تھی، جہاں ہم چلے جاتے اور فرشتوں سے اگر کوئی گن سن پالیتے تو وہ واپس جا کر کاہنوں وغیرہ کو بتاتے۔ جب سے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے ہیں، اب ہمیں اوپر جانے نہیں دیا جاتا۔ جب اوپر جاتے ہیں تو شہابِ ثاقب ہمارے پیچھے لپکتا ہے اور ہمیں مار پڑتی ہے۔ بھاگنا پڑتا ہے۔ یہ سارا واقعہ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ جنّات جب بغاوت کرتے زمین پر قتل و غارت گری کرتے، تو اللہ کریم ان کی سرکوبی کے لیے آسمانوں سے فرشتوں کے لشکر بھیجتے جو باغیوں کو مارتے، سزا دیتے اور دوسروں کو صحیح کرتے۔ پھر ان میں سے نیکوں کو حکمران بنا کے چلے جاتے۔ کچھ عرصہ ٹھیک رہتے پھر بغاوت کرتے۔

ابلیس:

ابلیس بھی جنّات میں سے ایک جنّ تھا۔ ابلیس نے بہت عبادت کی تھی اور مولانا محمد خان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ اُن لشکروں کا سردار ہوتا تھا جو جنّات کی سرکوبی کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ فرشتوں کے ہمراہ آتا، باغی اور بدکار جنوں کو مارتا پیٹتا، سزا دیتا۔ پھر تمام انتظام کر کے چلا جاتا۔

ز راہِ تفاخر بفوجِ ملک
گہے بر زمین بود گہے بر فلک

کہ فرشتوں کے لشکر کے ساتھ بڑے فخر کے ساتھ آتا، پھر کبھی زمین پر ہوتا، کبھی آسمان پر واپس چلا جاتا۔

لیکن جب اطاعت کا حکم ہوا تو اکڑ گیا اور انکار کر دیا، کیونکہ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ: 34) وہ (علمِ الٰہی میں) تھا ہی کافروں میں سے۔ وہ عبادت کرتا رہا اور اس پر درجات مرتب ہوتے رہے۔ لیکن جب انکار کیا، کفر کا ظہور ہوا، تب سزا مرتب ہوئی۔ دُنیوی قانون بھی یہی ہے کہ اگرچہ ہمیں علم ہو کہ یہ بندہ قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس پر ہم اسے پھانسی نہیں دے سکتے۔ جب وہ جرم کرے گا، تب سزا ہوگی۔

سالکین کے لیے لمحہ فکریہ:

اسی طرح بعض سالکین کے دلوں میں خلوص نہیں ہوتا۔ محنت کرتے رہتے ہیں، مراقبات ہوتے رہتے ہیں لیکن جب بھی وہ کمی کوتاہی یا غلطی جو دل میں تھی، عمل میں آتی ہے تو ہر چیز تباہ ہو جاتی ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اس شخص نے تو بیس سال فلاں شیخ کے ساتھ لگائے، یا پندرہ سال کسی کے ساتھ اللہ اللہ کرتا رہا۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ کرتا تو رہا، لیکن اس کے دل میں خلوص نہیں تھا۔ وہ لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے، اپنی پارسائی کے لیے کرتا رہا۔ جب وہ بات ظاہر ہوئی تو ہر چیز صاف ہوگئی۔

جنّات کا تنگ کرنا:

کافر جنّات، ابلیس اور اس کی اولاد تو انسانوں کی ازلی دشمن ہے۔ یہ صرف مومن کی دشمن نہیں، بلکہ بنی آدم کی دشمن ہے۔ انسانوں کو جن پکڑتے ہیں اور یہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر بندے کے ساتھ اللہ کے مقرر کردہ محافظ فرشتے موجود ہیں تو پھر جن کیوں پکڑتے ہیں؟ اس کے کردار کی وجہ سے، اللہ کریم فرشتوں کو منع کر دیتے ہیں کہ یہاں سے اس کی حفاظت نہ کرو۔ جب وہ حفاظت چھوڑ دیتے ہیں تو اُسے جن پکڑ سکتے ہیں۔ اور جتنی تعداد میں جن و شیاطین بستے ہیں تو اگر یہ ایک ایک معمولی شرارت بھی کریں تو انسان تو جی نہیں سکتا۔

علاج:

جنّات سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے توبہ کرنا ہے۔ اگر کسی کو تکلیف ہے تو وہ خلوص دل سے اپنے تمام شعوری و غیر شعوری گناہوں سے توبہ کرے۔ اللہ کریم سے معافی طلب کرے اور اللہ کریم کی اطاعت شروع کر دے۔ حلال کھائے، سچ بولے، فرائض ادا کرے، نماز پڑھے، روزے رکھے تو جنّات چھوڑ جائیں گے۔ محافظ فرشتے پھر سے چوکس ہو جائیں گے۔ اس کا علاج عاملوں سے عملیات کرانا نہیں ہے، یا بزرگوں کے مزارات پر بھاگنا نہیں ہے۔ لوگ پیسے بھی خرچ کرتے ہیں، عاملوں کے پاس دھکے کھاتے رہتے ہیں، بعض لوگ تو عزتیں بھی

گنوا بیٹھتے ہیں تو یہ درست نہیں ہے۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں کہ اللہ کے سامنے توبہ کر لی جائے، اپنی اصلاح کر لی جائے تو اللہ کریم کے محافظ فرشتے جنوں کو بھگا دیں گے۔ جنات ختم ہو جائیں گے۔ ان کی جرأت ہی نہیں ہو گی۔ لیکن اس طرف ہم نہیں آتے۔ شاید آخرت پر یقین میں کمی اس کا سبب ہے۔ ہمیں یہ خیال ہی نہیں کہ کل اللہ کریم کے روبرو حاضر ہو کر جواب بھی دینا ہے۔

اسباب ونتائج:

فطرت کا ایک قانون ہے کہ ہر چیز کسی سبب کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس سبب کو روک دیا جائے تو وہ چیز رک جائے گی۔ جیسے ہر بیماری کا بھی کوئی سبب ہوتا ہے۔ طبیب جب مریض کا علاج کرتا ہے تو بیماری کا سبب تلاش کر کے اسے زائل کرتا ہے۔ نتیجتاً بیماری زائل ہو جاتی ہے۔ اگر سبب تلاش نہ کرے، صرف علامات کا مداوا کرتا رہے تو صحت نہیں بحال ہو گی۔ مثلاً اگر کہیں درد ہے تو ایک طریقۂ علاج میں درد دُور کرنے کی گولی کھلا دی جاتی ہے لیکن درد کا سبب تلاش نہیں کیا جاتا تو جب تک اس دوا کا اثر رہے گا، درد ٹھیک رہے گا۔ جیسے ہی اس کا اثر ختم ہو گا درد پھر شروع ہو جائے گا۔ اطبا ہمیشہ سبب کو تلاش کرتے ہیں، سبب زائل ہو جائے تو صحت بحال ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم ایسے عجیب لوگ ہیں کہ ہم اپنی اصلاح نہیں کرنا چاہتے، نتائج کو بدلنا چاہتے ہیں۔ اپنی غلطیوں سے توبہ کرنا نہیں چاہتے جن کے نتیجے میں حفاظتِ الہیہ ہم سے دور کی گئی اور نتائج بدلنا چاہتے ہیں۔ اب پورے ملک میں فساد ہے، دہشت گردی ہے، قتل وغارت گری ہے۔ اس قتل وغارت گری کا بنیادی سبب بے حیائی ہے۔ جس قوم میں بے حیائی بڑھ جاتی ہے، بدکاری بڑھ جاتی ہے، وہاں قتل وغارت گری شروع ہو جاتی ہے۔ جو قوم حلال نہیں کھاتی، ناجائز وسائل سے کھاتی ہے اس میں لوٹ مار شروع ہو جاتی ہے۔ ہم حلال کھانا نہیں چاہتے، بے دریغ سود کھاتے ہیں، لوٹ کر کھاتے ہیں، جھوٹ بول کر، دوسروں کا حق چھین کر کھاتے ہیں اور کھاتے رہنا چاہتے ہیں۔ اس پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، ان کو بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ حکومت سے لے کر عام آدمی تک، حکمرانوں اور شہریوں تک، سب نتائج بدلنا چاہتے ہیں، اسباب پر توجہ ہی نہیں کرتے۔ اگر ہم توبہ کر لیں اور وہ سبب چھوڑ دیں نتیجہ تو از خود بدل جائے گا۔

مغربی دُنیا کو ایک مہلک بیماری ایڈز نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ ایڈز ایک ایسی بیماری ہے جس میں وجود کی قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے مریض کو زکام بھی ہو جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اہلِ مغرب نے اس بیماری کا سبب تلاش کر لیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب ہم جنس پرستی ہے۔ پھر بھی ہم جنس پرستی کو قانونی جواز بھی دے رکھا ہے۔ اسے نہیں روکتے لیکن ایڈز کو روکنا چاہتے ہیں، پھر کیا آج تک روک سکے ہیں؟ یعنی جب تک سبب

زائل نہیں کریں گے، نتائج کیسے زائل ہوں گے؟

قانونِ فطرت:

اللہ کریم کے حکم سے محافظ فرشتے ہر فرد کی حفاظت پر متعین ہیں۔ رات دن اس کے ساتھ رہتے ہیں، اسے گھیرے رکھتے ہیں اور اسے مختلف پریشانیوں سے بچاتے ہیں۔ یاد رکھیں! یہ تو ہمارا رویہ ہے کہ ہم اسباب نہیں بدلتے، نتائج بدلنا چاہتے ہیں تو اللہ کریم فرماتے ہیں، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ فرمایا، جب تک تم خود نہیں بدلو گے، حالات نہیں بدلیں گے۔ شاعر نے خوب کہا ہے،

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

تمہارا خیال ہے کہ تم برائی کرتے رہو اور اس پر نیکی کا پھل لگتا رہے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ جتنی برائی کرو گے، اتنی تباہی یقیناً آئے گی، اتنی مصیبتیں آئیں گی۔ اگر تم دُنیا و آخرت میں مصیبتوں سے چھٹکارا چاہتے ہو تو برائی چھوڑ دو۔ اللہ کریم نے نیکی اور برائی دونوں راستوں کے بارے بتا دیا ہے اور تمہیں اختیار دیا ہے کہ تم کس کو پسند کرتے ہو۔ تم جس راستے کو اختیار کرو گے، اس کے ثمرات تمہیں ملیں گے۔ اللہ کریم کسی قوم سے زبردستی نہیں کرتے۔ کسی سے کوئی زیادتی نہیں کرتے۔ بندہ جو راستہ خود اختیار کرتا ہے، اللہ اس کا پھل اُسے دیتا ہے۔ اگر برائی پر چلتا چلتا کوئی توبہ کر لیتا ہے اور برائی چھوڑ دیتا ہے تو اللہ کریم اسے نیکی کے راستے پر چلا دیتے ہیں، پھر اس کے نیک نتائج آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگ کہیں کہ ہم بدلنا نہیں چاہتے، البتہ جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، وہ بدل جائے تو وہ نہیں بدل سکتا۔ یہ تبدیلی کی توقع اس طرح رکھنا کہ ہمارے کردار میں تبدیلی نہ آئے اور نتائج بدل جائیں، فرمایا، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ جب تک تم خود نہیں بدلو گے، تمہارے حالات نہیں بدلیں گے۔ اور وہ ایسا کریم ہے کہ اگر ساری قوم بھی برائی پر ڈٹی ہوئی ہو اور نتائج بھگت رہی ہو اور ایک بندہ خلوص سے توبہ کر لے تو اس ساری آگ میں اس ایک کو محفوظ رکھتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اُس کے حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ تو ہم اس انتظار میں کیوں رہتے ہیں کہ حکمران توبہ کریں، ساری قوم توبہ کرے؟ حکمرانوں کو بھی اللہ توفیق دے اور عوام کو بھی توفیق دے، ساری قوم توبہ کرے۔ لیکن ہم خود تو پہلے توبہ کریں، اپنی جان تو بچائیں۔ تبدیلی افراد ہی سے شروع ہوتی ہے! لیکن ہمارے ہاں تبدیلی کے نعرے بھی جو لگائے جاتے ہیں، وہ بھی خلاف اسلام ہی ہوتے ہیں کہ ایک کفر سے نکال کر دوسرے کفر میں لے جائیں گے۔ کیا یہ تبدیلی ہے؟ یہ تبدیلی نہیں ہوتی۔ تبدیلی یہ ہے کہ کفر کو چھوڑ کر دین میں آؤ، برائی کو چھوڑ کر نیکی کی طرف آؤ۔

توبہ اور رجوع اِلی اللہ مصائب کا حل:

فرمایا، وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ‌ ۚ اللہ جب کسی قوم پر کوئی مصیبت بھیجنے کا ارادہ فرمالیتا ہے ، پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ خود ہی روکے تو رک سکتی ہے۔ اس کی طرف سے آئی ہوئی مصیبتوں کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ خود اسی سے رابطہ کرو، توبہ کرو، خود اس سے دُعا کرو، اس کی بارگاہ میں گڑگڑاؤ اور اپنے کردار کو بدلو۔ ورنہ جب اللہ پریشانیاں اور مصیبتیں بھیج دیتا ہے فَلَا مَرَدَّ لَهٗ‌ ۚ تو کسی میں جرأت نہیں ہے کہ اسے روک سکے۔ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّالٍ (۱۱) ایسی قوموں کا اللہ کریم کے سوا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ایسے بدنصیب ہوتے ہیں کہ اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور کوئی ان کا علاج نہیں کرسکتا سو، ان مصیبتوں کا علاج بھی رجوع الی اللہ ہے۔ گزشتہ سے توبہ کرے۔ آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کرے۔ اللہ کریم سے مدد چاہے تو حالات بدل سکتے ہیں۔

قدرت کاملہ کے کرشمے:

فرمایا، هُوَ الَّذِىۡ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۲) وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے سمندروں سے پانی اٹھایا، بادل بنائے اور اپنی حکمتِ بالغہ سے اس میں بجلی بھر دی، آگ بھر دی۔ پانی اور آگ کو ایک بادل میں جمع کر دیا۔ بظاہر سمجھ نہیں آتی۔ اس کی قدرتِ کاملہ ہی بہتر جانتی ہے کہ ہوائی جہاز میں سفر کر کے بھی دیکھا، بادلوں سے بھی گزرے۔ جہاز اترتے چڑھتے بادلوں سے گزرتا ہے لیکن کوئی بجلی نظر نہیں آتی، نہ جہاز کو لگتی ہے۔ کوئی چنگاری نظر نہیں آتی، کوئی چمک نظر نہیں آتی۔ البتہ جب بادل گرجتا ہے، بجلی کڑکتی ہے تو ایک جہاں کو روشن کر دیتی ہے۔ پتا نہیں، اس قادرِ مطلق نے کہاں رکھی ہوتی ہے۔ جہاز بادلوں کے بیچ سے بادلوں کو کاٹتا ہوا جاتا ہے، نہ کوئی بجلی نظر آتی ہے، نہ پانی نظر آتا ہے۔ لیکن وہ ایسا قادر ہے کہ اسی بادل میں اس نے اتنا پانی جمع کر دیا ہے کہ جہاں برستا ہے وہاں جل تھل کر دیتا ہے۔ ہواؤں کے دوش پہ اڑتا پھرتا ہے۔ قطرہ قطرہ برستا ہے تو سیلاب آجاتا ہے، جبکہ ٹنوں پانی بادل میں اڑتا پھرتا ہے اور کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

اللہ ہی ہے جو چمکتی ہوئی بجلی دکھاتا ہے، جس سے ڈرتے بھی ہو اور جس سے تمہیں امیدیں بھی ہوتی ہیں کہ بادل برسے گا، کھیتیاں ہوں گی، پھل اُگیں گے، چشموں میں پانی آئے گا، نہریں رواں ہوں گی، دریاؤں میں پانی آئے گا۔

تم امیدوارِ کرم بھی رہتے ہو اور بجلی کو دیکھ کر ڈرتے بھی ہو، اس سے بھاگتے بھی ہو کہ کہیں تباہ نہ کر دے۔ شہر کو نہ جلا دے، گھر پر نہ گر جائے، فصلوں کو تباہ نہ کر دے۔ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وہ ایسا قادر ہے تمہیں

بجلیاں دکھاتا ہے جن سے تمہیں امید بھی ہوتی ہے اور ڈرتے بھی ہو۔ وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۲) اور کیسے بھاری بھاری بادل پیدا کرتا ہے کروڑوں ٹن پانی ان میں بھر دیتا ہے اور ہوائیں انہیں اڑائے پھرتی ہیں۔ نہ ان کا کوئی وزن ہے، نہ ان میں پانی نظر آتا ہے نہ آگ۔ لیکن جب برستے ہیں تو بے پناہ پانی آ جاتا ہے۔ یہ سب اس کی قدرتِ کاملہ سے ہوتا ہے۔ فرمایا، وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ یہ گرجنے والا بادل بھی اس کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ ''رعد'' اس فرشتے کا بھی نام ہے جو ان بجلیوں کے چمکانے کڑکانے پر مقرر ہے۔ فرمایا، وہ بھی اللہ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ بادل بھی گرج کر، چمک کر، اللہ کی عظمت کی گواہی دیتا ہے۔ وہ یہ بتا رہا ہے کہ اللہ قادر ہے، اس نے ہوا میں پانی بھر دیا، اس میں بجلی بھر دی، نہ پانی بجلی کو متاثر کرتا ہے، نہ بجلی پانی کو۔ ایک ہی بادل میں بستے ہیں لیکن دیکھنے والے کو پتا ہی نہیں چلتا، کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اور بجلی بھی اپنا آپ دکھا کر اللہ کی عظمت بیان کرتی ہے۔ اور وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ اس کے مقرر فرشتے بھی اس کی عظمت سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ اس کی قدرتِ کاملہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ اللہ ہی بجلیاں بھیجتا ہے، جس پر چاہے اس پر بجلی گرا بھی دیتا ہے۔ یہ اس کے ذاتی فیصلے ہیں۔ اور لوگوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ عظمتِ الٰہی سے شک میں پڑے ہوئے ہیں وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ اس کے بارے جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کو ماننے، نہ ماننے کی باتیں کرتے ہیں جبکہ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳) وہ بہت بڑا، قادرِ مطلق اور کمال کی قوت والا ہے۔ تمہارے جھگڑے تو بہت ہی نیچے رہ جاتے ہیں، تم بہت چھوٹی سی مخلوق ہو۔ اس کی ساری مخلوق میں تم ایک جزو ہو۔ اگر تم گننا بھی چاہو تو اللہ کی مخلوق کو گن نہیں سکتے۔ اللہ کی نعمتوں کو گن نہیں سکتے۔ اللہ کے لشکروں کو نہیں گن سکتے۔ ان بے شمار اقسام کی مخلوق میں سے ایک قسم، تم ہو۔ تم ایک چھوٹی سی اکائی ہو اور تمہاری یہ جرأت کہ عظمتِ الٰہی پر باتیں کرتے ہو اور پھر بحث کرتے ہو کہ ہم اللہ کو یوں نہیں مانتے، یوں مانتے ہیں۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ اسے جو پکارتا ہے یا جو اس کی دعوت ہے، دونوں صورتوں میں حق اسی کے لیے ہے۔ کوئی اسے پکارتا ہے تو اس کا پکارنا حق ہے، اس لیے اس کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں جس کو پکارا جائے، جس سے مدد مانگی جائے۔ وہ واحد لاشریک ہے۔ کسی کو دعوتِ اِلی اللہ ملتی ہے تو وہ دعوتِ حق ہے کہ اس کی ذات کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں جسے تلاش کیا جائے۔ اور صرف اس کی دعوت حق ہے کہ اللہ کے نبیؐ اللہ کے بندوں تک یہ دعوت پہنچائیں، نبیؐ کے خادم، نبیؐ کے غلام، تم تک اللہ کی بات پہنچائیں۔ تم اللہ کو پکارو، یہ دعوت بھی حق ہے۔ لیکن افسوس کہ لوگوں کی سوچ کی پرواز بہت کم ہے۔ یہ بہت نیچے رہ جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے آسروں سے چمٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا

كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۚ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ (۱۴) فرمایا، لوگوں کی سوچ بہت ہی نیچے رہ جاتی ہے اور وہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ شعور نہیں رکھتے کہ جنہیں وہ پکار رہے ہیں، وہ ان کی آواز بھی سن نہیں پا رہے۔ خود ان جیسی مخلوق ہیں۔ یہ بیٹھے دل ہی دل میں اسے پکار رہے ہیں جبکہ وہ ان کے دل کی آرزوئیں جاننے سے قاصر ہیں۔ اس لیے کہ وہ خود مخلوق ہیں اور یہ صرف خالق کو سزاوار ہے کہ وہ دلوں کے بھید جانے تو اللہ کے علاوہ جس سے تم مدد چاہتے ہو، وہ تمہاری مدد کیا کرے گا؟ وہ تو خود مخلوق ہے اور مخلوق تو اللہ کی مدد کے بغیر دم نہیں لے سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی بہتے دریا کے سامنے کھڑا ہو اور دور سامنے دریا بہہ رہا ہو اور اس نے ہاتھ پھیلا رکھا ہو کہ اے دریا! میرے منہ میں پانی ڈال دے۔ میری پیاس بجھا دے۔ مجھے چند قطرے پانی کے دے دے۔ عمر بھر بھی اگر پکارتا ہی رہے، کیا دریا کا پانی اس کے منہ میں آ جائے گا؟ دریا پانی سے بھرا ہوا ہے لیکن دریا میں یہ جرأت نہیں کہ وہ پانی انسان کے منہ تک پہنچائے۔ جس طرح قدرت نے بنایا ہے، انسان کو ہاتھ پاؤں دیے ہیں، وہاں تک چل کر جائے، ہاتھ بھر کر پیے تو پی سکتا ہے۔ لیکن اگر دریا کو کوئی معبود برحق سمجھ لے اور غائبانہ پکارنا شروع کر دے، جیسے وادی میں دریا بہہ رہا ہو اور کوئی پہاڑ پر کھڑا ہو کر پکارے کہ اے دریا! مجھ تک پانی پہنچا دے میری پیاس بجھا دے، تو فرمایا، إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ پانی کو پکار رہا ہے کھڑا ہو کر، ہاتھ پھیلائے ہوئے کہ میرے منہ میں آ جا میری پیاس بجھا دے وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وہ پانی اس تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اللہ نے اسے یہ قدرت نہیں دی۔ نہ وہ اس کی پکار سنتا ہے، نہ اس کی آواز سنتا ہے، نہ ہی اس کا مفہوم جانتا ہے۔ اور نہ ہی اس میں طاقت ہے کہ دریا سے اچھلے اور اس کے منہ میں آ جائے۔ اللہ نے اسے یہ طاقت نہیں دی تو جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، ان کی یہی مثال ہے جیسے کوئی دور کھڑا پانی کو پکارے کہ اس کی پیاس بجھا دے۔ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ (۱۴) کافروں کی پکار ضائع جاتی ہے۔ جس طرح کوئی دریا کو پکارے تو اس کی چیخ و پکار ضائع جاتی ہے، اسی طرح ایمان نہ ہو تو دُعائیں محض چیخ و پکار رہ جاتی ہیں۔ وہ مقبول نہیں ہوتیں۔

عظمتِ الٰہی کا اقرار:

اللہ کی ذات اتنی عظیم ہے کہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، وہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اس کی اطاعت اسے کرنی پڑتی ہے۔ جو خوشی سے کر لیتا ہے، وہ تو کرتا ہی ہے۔ لیکن جو خوشی سے نہیں کرتا، کرنی اسے بھی پڑتی ہے۔ جو اللہ کو نہیں مانتے، وہ جب ان پر بیماری بھیج دیتا ہے تو ان کو بیمار ہونا پڑتا ہے، یعنی ماننا پڑتا ہے۔ ان پر جب موت بھیج دیتا ہے تو انہیں مرنا پڑتا ہے۔ مجالِ دم زدن کسی کو بھی نہیں ہے۔ جو مانتے ہیں وہ اپنا اعزاز بنا لیتے

ہیں، خود معزز ہو جاتے ہیں۔ جو نہیں مانتے وہ خود ذلیل و رسوا ہوتے ہیں، حالانکہ ماننا انہیں پڑتا ہے کہ خوراک کا ایک ایک ذرہ وہ عطا کرتا ہے۔ ہاتھوں کو قوت وہ دیتا ہے۔ آنکھوں کو بینائی وہ دیتا ہے، دانتوں کو چبانے کی قوت وہ دیتا ہے، معدے کو کھانا ہضم کرنے کی قوت اس کی عطا کردہ ہے۔ سب کچھ اس کے حکم کے مطابق ہوتا ہے تو وہ اپنے دل سے دماغ سے مان تو رہے ہوتے ہیں لیکن اقرار نہیں کرتے۔ ورنہ ہر چیز اللہ کے سامنے سربسجود ہے۔ خواہ آسمانوں میں ہے یا زمین میں۔ یعنی دائرہ تخلیق میں جو بھی ہے، اسے اللہ کی عظمت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ مرضی سے کرلے یا زبردستی اقرار کرلے۔ کرنا پڑتا ہے۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ ظِلٰلُھُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ(۱۵) حتیٰ کہ صبح شام ہر چیز کا سایہ بھی اس کی عظمت کی گواہی دیتا ہے اور انسان کو سمجھاتا ہے کہ اس کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اللہ چاہے تو سایہ کو دراز کردے اور چاہے تو اسے سمیٹ کر پیروں تک لے آئے۔ ہر چیز کے سائے بھی صبح شام اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ سورج مشرق کو ہوتا ہے تو یہ مغرب کو سایہ کر رہے ہوتے ہیں، اور مغرب کو ہوتا ہے تو یہ مشرق کو سایہ کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر چیز اس کی بارگاہ میں ماننے پر مجبور ہے۔ اس کی مخلوق ہے، مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ البتہ جو پسند سے مانتا ہے اس کا اعزاز ہے، لیکن جو مجبوراً مانتا ہے اسے سزا ملے گی۔

فرمایا، ذرا ان سے پوچھیے تو سہی قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ زمین و آسمانوں کو اور ان میں اتنی بے شمار مخلوق کو پیدا کرنے والا اور انہیں پالنے والا کون ہے؟ ایک ایک ذرّے کو، چلانے والا کون ہے؟ ذرہ تو پھر بھی دکھائی دیتا ہے، Cells تو دکھائی بھی نہیں دیتے تو ایک ایک Cell کو جوڑ کر زمینوں آسمانوں کے جہاں بنا دینے اور ان میں اتنی مخلوق بنا کر اس نظام کو رواں دواں رکھنے والی ذات کون ہے؟ قُلِ اللّٰہُ سب کو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ صرف اللہ ہے۔ اس اقرار کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ تو جب اس سارے نظام کو بنانے والا بھی وہ اکیلا ہے، چلانے والا قادرِ مطلق بھی وہ ہی ہے تو پھر تم نے اس کو چھوڑ کر اور معبود کہاں سے تلاش کر لیے؟ جب اور کوئی بنانے والا بھی نہیں، چلانے والا بھی نہیں تو تمہاری مصیبتیں دور کرنا، اور تمہاری حاجت روائی کرنا، دوسروں کے بس میں کیسے آ گیا؟ وہ سب تو خود مخلوق ہیں، محتاج ہیں تو تم نے اس کے علاوہ اپنے لیے معبود بنا لیے، اپنے لیے معاون و مددگار تلاش کر لیے۔ فرمایا، لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِھِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا مخلوق تو اپنا بھلا برا بھی نہیں کر سکتی، کسی کا کیا کرے گی۔ جو اپنی ذات میں محتاج ہیں، وہ تمہارا کیا کریں گے؟ ساری مخلوق اپنے وجود، اپنی ہستی، اپنے جینے مرنے، پیدا ہونے میں، سانس لینے، کھانے پینے، بھلے برے میں خود اللہ کی محتاج ہے تو تمہارا کیا کرے گی! فرمایا، قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ

پھر آخرت میں جب انصاف ہو گا تو کیا اندھے اور روشن آنکھوں والے برابر ہوں گے؟ جس نے اللہ کی عظمت کو چھوڑ کر مختلف بتوں میں پناہ تلاش کی، وہ تو اندھا ہے۔ جسے اللہ نظر نہیں آتا مخلوق نظر آتی ہے، وہ تو اندھا ہے۔ اور وہ نگاہ والا ہے جس نے اللہ کو پہچانا، مخلوق سے بالاتر ہو کر اس کی اطاعت کی۔ کیا یہ دونوں برابر ہو جائیں گے؟ ہرگز نہیں۔
اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ یا دُنیا میں تم مشاہدہ نہیں کرتے، کیا روشنی اور تاریکی ایک جیسی ہیں؟
اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ فرمایا، یہ جن کو تم اللہ کے سوا اپنا معاون اور مددگار بناتے ہو، کیا انہوں نے بھی کوئی مخلوق پیدا کی ہے کہ تمہیں یہ شبہ ہو کہ اگر وہ خالق ہیں تو ربّ بھی ہوں گے، کیا تمہیں اللہ کے سوا کسی اور کی کوئی تخلیق نظر آئی جو تمہیں دھوکا لگ گیا اور تم اس کے دروازے پر دست سوال دراز کرنے لگے؟ بھلا! مخلوق کیسے کسی کو پیدا کر سکتی ہے! فرما دیجیے، قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ جس چیز کو بھی وجود ملا ہے، اسے اللہ نے دیا ہے۔ جن چیزوں کی تم پوجا کرتے ہو، انہیں اللہ کا شریک بناتے ہو، ان کا اپنا وجود اللہ کی تخلیق کا مرہونِ منت ہے۔
وَهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ (۱۶) وہ یکتا ہے اور تمام مخلوق پر غالب ہے۔ وہ واحد لاشریک ہے، بے مثال ہے اور تمام تر مخلوق پر غالب ہے۔ تو یہ کس قدر شدید جہالت ہے کہ عظمتِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازوں پر بھٹکا جائے!

اہلِ حق کی پیروی:

انبیاء مطاع ہوتے ہیں۔ ان کی اطاعت کی جاتی ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کا پیغام دیتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی پیروی اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام دیتے ہیں۔ کسی عالم، متقی، صالح، پیر مرشد، شیخ کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ بارگاہِ رسالت کے خادم ہوتے ہیں اور پیغامِ رسالت ہی ہم تک پہنچاتے ہیں تو یہ ہم پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ اسی حیثیت میں ان کی اطاعت کی جاتی ہے۔

لیکن اگر یہ بھی اپنی طرف سے حکایات گھڑ کر اور بدعات و رواج اختراع کر کے ہم تک پہنچانے لگیں تو یہ نہ شیخ ہے، نہ پیر بلکہ ڈاکو ہے، راہزن ہے جو لوگوں کے ایمان لوٹ رہا ہے۔ تو کسی بڑی سے بڑی ہستی کا اتباع صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچایا ہے۔ وہ اتباع درحقیقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا ہوتا ہے۔ درمیان میں اللہ اس ہستی کو وسیلہ بنا دیتے ہیں۔ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام ہم تک پہنچاتا ہے، اپنی طرف سے نہیں بناتا سو ہر حال میں اللہ واحد ہے، لاشریک ہے۔ ہر ایک پر قادر ہے۔ سب کا خالق ہے۔ باقی سب اس کی مخلوق ہے۔ اور یہ اس کی شان ہے کہ اس سے معافی مانگی جائے، اس کی بارگاہ میں توبہ کی جائے۔ اس کی اور اس کے حبیب ﷺ کی اطاعت اور اتباع اختیار کیا جائے۔

حق اور باطل:

فرمایا، حق اور باطل کی مثال ایسی ہے اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً جس طرح آسمان سے پانی برستا ہے، بارش برستی ہے، بلندیوں سے پانی آتا ہے فَسَالَتْ اَوْدِیَةٌ بِقَدَرِهَا اور اپنی اپنی مقدار اور حیثیت کے مطابق ندیاں نالے بہہ نکلتے ہیں فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا تو وہ بہنے والا پانی اپنے ساتھ خس و خاشاک بھی بہالاتا ہے۔ جب بارش برستی ہے اور پانی نالوں میں بہتا ہے تو صرف صاف پانی ہی نہیں رہتا، اس میں خس و خاشاک، مٹی، کنکر، اور بھی بہت کچھ بہہ کر آجاتا ہے۔ وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْیَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ایسے ہی جب زیورات بنانے کے لیے سونے چاندی کو آگ میں گلاتے ہیں تو ان پر بھی ایسا میل اوپر آجاتا ہے۔ اس میل کو اتار کر پھینک دیا جاتا ہے اور صاف دھات کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اسی طرح پانی کے ساتھ جو خس و خاشاک آتے ہیں، انہیں بھی نتھار کر الگ کر دیا جاتا ہے اور صاف پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ یہی مثال حق اور باطل کی اللہ کریم بیان فرماتے ہیں کہ باطل خس و خاشاک ہے، وہ میل ہے جو اوپر آجاتا ہے جسے پھینک دیا جاتا ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جو کسی استعمال میں نہیں آتا، جس کا کوئی مصرف نہیں۔ جبکہ صاف ستھرا پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ صاف ستھری دھات کا زیور بنتا ہے۔ اسی طرح جب انسانی کردار میں، اعمال میں خلوص سے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اتباع ہوگا تو وہ مقبول ہوگا۔ لیکن اگر دین میں کوئی رسم و رواج خود شامل کر لیں تو وہ قابلِ قبول نہیں۔ وہ اسی طرح پھینک دینے کے قابل ہیں، جیسے پانی سے خس و خاشاک یا دھات پگھلاتے وقت اوپر آنے والی میل۔ جب اعمال کی جانچ ہوگی تو رسومات و رواجات اور انسان کا بنایا ہوا طرزِ عمل اسی طرح پھینک دیا جائے گا۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔

حق وہ کھرا پن ہے، جس طرح استعمال کے لیے صاف پانی نکال لیا جاتا ہے، ویسے ہی انسان کے اعمال میں جو کھرا پن ہوگا، وہ اس کے کام آئے گا اور اس پر اجر پائے گا۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً انسان کا اپنا طرزِ عمل تو یہ ہے کہ وہ کسی میل کچیل کو پسند نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ میل کچیل، جھاگ کو اتار کر پھینک دیتا ہے۔ تو پھر اعمال میں جو ملاوٹ ہوتی ہے یا خلوص میں کمی ہوتی ہے یا رسومات مل جاتی ہے تو اس کو اللہ کیسے قبول فرمائے گا، اس کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ روئے زمین پر یہ قاعدہ ہے کہ جو چیز انسان کے لیے نافع ہے، مفید ہے، وہ باقی رکھی جاتی ہے۔ جو زائد چیزیں اس میں مل جاتی ہیں، وہ ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ محض پھینک دی جاتی ہیں۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۷) اللہ کریم اسی طرح مثال دے کر بات کو

واضح فرماتے ہیں کہ جب انسانوں میں سے کوئی بھی صاحب خرد گدلے یا خراب پانی کو استعمال میں لانا پسند نہیں کرتا، اور میل کچیل والی، کھوٹ والی دھات کی قیمت نہیں ہوتی، جب تک وہ میل کچیل اس سے الگ نہ کر دیا جائے تو پھر اگر اپنا عقیدہ اور کردار گدلا کر لیں گے تو وہ اصل کو بھی لے ڈوبے گا۔ جب تک اس میں کھرا پن نہ ہو۔

اعمال میں کھرا پن:

اعمال میں کھرا پن یہ ہے کہ اوّل وہ عمل اللہ کا حکم ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس طریقے سے کیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہو۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ کیا جائے۔ ان تینوں پہلوؤں میں سے کسی میں بھی میل کچیل نہیں آنا چاہیے۔ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے حکم کو قبول کیا ان کی حالت بہت اچھی ہوگی۔ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ اور جو لوگ ارشادات باری کو قبول نہیں کرتے، اتباع رسالت کو قبول نہیں کرتے، وہ حق سے دور ہو جاتے ہیں۔

احکامِ الٰہی کو ردّ کرنے کے اسباب:

بعض اوقات بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بہت بڑی بڑی باتوں کو ردّ کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ مثلاً روز مرّہ کے معمولاتِ زندگی میں ہم نے اپنی ایک حیثیت بنا رکھی ہوتی ہے۔ اپنی رائے کو اہمیت دیتے ہیں اور ایک معیار بنا لیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہم احکامِ الٰہی کو صرف اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے بنائے ہوئے معیار کے مقابلے میں غلط لگتے ہیں۔ آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ باپ دادا سے ورثے میں ملی رسومات نہیں چھوڑتے اور سنّت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم رواجات کے اسیر ہو جاتے ہیں اور اتباعِ سنّت ترک کر دیتے ہیں۔ یہ جو رواجات ہیں، یہ وہ گدلا پن ہے جو پانی میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ میل ہے جو سونے جیسی دھات میں شامل ہو کر اسے بھی بے کار کر دیتی ہے۔ تو حق کے مقابلے میں جب اپنی بڑائی منوانے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ خس و خاشاک کی ملاوٹ ہو جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کے احکام قبول نہیں کرتے، اس کا سب سے بڑا سبب محض حصولِ دُنیا ہوتا ہے۔ وہ یا دُنیا کا مال چاہتے ہیں یا اپنی بڑائی، اپنی شہرت چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں بہت بڑا آدمی سمجھیں۔ دُنیا کی دولت اور شہرت ہی ان کا مقصد ہوتی ہے لیکن یہ بیوقوف نہیں سوچتے لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا کہ اگر دُنیا کی ساری دولت ایک شخص کے پاس جمع کر دی جائے۔ دُنیا میں جتنی بھی دولت ہے، اس کی تمام اقسام مال و زر، ہیرے جواہرات، سونا، چاندی، پیسے، سکے سارے ایک ہی شخص کے پاس ہوں اور پھر اتنے ہی اسے اور دے دیے جائیں وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ تو بھی وہ اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتے۔ اس لیے کہ نجات

کا سبب اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ پھر کیوں اپنی بڑائی کے لیے عظمت الٰہی کو چھوڑتے ہو، کیوں دولت کے لیے اطاعت چھوڑتے ہو، اپنی شہرت کے لیے اتباعِ رسالت ﷺ کو کیوں چھوڑتے ہو؟ دنیوی دولت وشہرت کی حیثیت کیا ہے، کیا یہ آخرت میں کام آئے گی، کیا اس پر آخرت کی نجات کا مدار ہے؟ ہرگز نہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ سُوۡٓءُ الۡحِسَابِ ایسے لوگوں پر تو حساب بہت سخت ہو جائے گا۔ بہت مشکل پڑ جائے گی وَمَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ اور انجام کار ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔ جس نے ذاتی مفاد کے لیے، خواہ وہ دولتِ دُنیا ہو، عہدہ ہو، شہرت ہو، دین کو چھوڑا، اس نے دو عالم گنوا دیے۔ کہ دُنیا نے تو جانا ہی جانا ہے اور آخرت کو اس نے پہلے ہی چھوڑ دیا تو اسے بہت سخت حساب دینا پڑے گا اور اس سختی سے گزرنے کے بعد دوزخ میں ٹھکانہ ہوگا۔ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ (۱۸) دوزخ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ اس سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے۔

دین آسان ہے:

یہ بات قابلِ غور ہے کہ کسی بھی کام کو کرنے کا جو صحیح طریقہ ہوتا ہے، وہ آسان بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ دین میں ہر کام کو کرنے کا صحیح طریقہ اللہ کریم نے بتایا ہے لہٰذا اس پر عمل سب سے آسان ہے۔ جنت میں جانا سہل ہے۔ اطاعتِ الٰہی آسان ہے۔ زندگی مشکل تب بنتی ہے جب ہم اپنے طریقے سے کام کرتے ہیں۔ دوزخ بڑی محنت سے، بڑی مصیبت سے کمائی جاتی ہے۔ یہ سب تکلیفیں، بدنامیاں برداشت کر کے سمیٹی جاتی ہے۔ ذرا سوچیے! کہ کون سی برائی آسان ہے؟ چوری، ڈکیتی، ملاوٹ، دھوکا دہی، بے دینی، بدکاری، ان میں کون سا کام آسان ہے؟ ہر کام بہت مشکل ہے اور بہت سے خطرات کا حامل ہے۔ بدنامی ملتی ہے، سزائیں ملتی ہیں جیل میں قید کاٹنی پڑتی ہے، مار کھانی پڑتی ہے۔ تو اتنی مشقت بندہ دوزخ کے لیے کیوں کرتا ہے جبکہ دین کا ہر حکم آسان ہے۔ اس پر عمل آسان ہے۔ عرفِ عام میں کہا جاتا ہے کہ جنت جانا مشکل ہے لیکن یہ بے وقوف لوگوں کا مقولہ ہے۔ جنت کا راستہ سب سے آسان ہے کیونکہ دین کا ہر کام آسان ہے۔ حلال کھانا، سچ بولنا، دیانتداری سے رہنا۔ ان باتوں میں عزت بھی ملتی ہے، آرام بھی ملتا ہے۔ جبکہ ہر برائی کے ساتھ ذلت ورسوائی اور دکھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو برائی بہت مشکل ہے۔

مسائل کا شرعی حل:

ہمارے معاشرے میں اگر دیکھا جائے تو ہماری روزمرہ کی زندگی میں بے شمار ایسے مواقع ہیں جن میں ہم اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی رسومات کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں۔ رسومات نہیں چھوڑتے، سنّت چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک ایسے موقع کو ہی لیجیے کہ جب کوئی فوت ہو جاتا ہے تو قطع نظر اس سے کہ مرنے والے کو صرف اللہ کی رحمت اور بخشش

چاہیے، اس کے وارث اپنے بنائے ہوئے معیار کے مطابق اپنی سی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ بہت اہم مسئلہ بن جاتا ہے کہ آنے والوں کی دعوت کیسی کی گئ اور کیسا کھانا پکایا گیا۔ حالانکہ شرعی طریقہ یہ ہے کہ جس گھر میں کوئی فوت ہو جائے تو ظاہر ہے کہ دور سے بھی مہمان جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے کھانے کا بندوبست بھی کرنا ہوتا ہے۔ پھر اہل خانہ کے لیے بھی کھانے کی ضرورت ہوتی ہے تو شرعی طریقہ یہ ہے کہ کوئی عزیز رشتہ دار، بھائی، چچا وغیرہ اہلِ خانہ اور مہمانوں کے لیے کھانا مہیا کرے۔ میّت کے مال میں سے کھانا نہ دیا جائے۔ میّت کے مال میں سے دیا گیا کھانا حلال نہیں کیونکہ یہ مال وارثوں کا ہے جو ابھی ان میں تقسیم ہونا ہے۔ ان وارثوں کو ابھی ملا نہیں، اور آپ اس میں سے کھانا دے رہے ہیں تو وہ ناجائز ہے حرام ہے۔ ہاں! وارثوں پر تقسیم ہوگا، ہر وارث اپنا حصہ پانے کے بعد اگر اس میں سے کھانا دینا چاہے تو وہ الگ بات ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ میّت ابھی رکھی ہوتی ہے اور اسی پیسے سے کھانے کا اہتمام شروع ہو جاتا ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ:

میری ایک عادت تھی کہ جب بھی ایسی صورتحال کا سامنا ہوتا تو قبرستان پر جنازہ پڑھنے کے بعد اگر قبر کی تیاری میں کچھ پندرہ بیس منٹ کی دیر ہوتی تو میں کچھ بیان کرتا رہتا تاکہ بجائے گپیں ہانکنے کے لوگ کچھ دینی بات ہی سن لیں۔ تو واقعہ کچھ یوں ہے کہ میرے ایک عزیز وفات پا گئے۔ رشتے کے اعتبار سے چچا لگتے تھے۔ جب ان کی تدفین ہو گئی تو ان کے بچوں نے کہا کہ آپ دُعا کرائیں اور اعلان بھی کر دیں کہ سب کھانا کھا کر جائیں۔ تو میں نے اعلان کر دیا کہ بھئی یہ کھانا ہے تو شرعاً حرام، لیکن لواحقین کا اعلان ہے کہ کھا کر جایئے گا۔ بعد میں وہ بہت خفا بھی ہوئے۔ میں نے کہا، بھئی! سیدھی سی بات ہے، جب مال وارثوں کا ہے، انہیں ابھی ملا نہیں۔ آپ اس میں سے بکرے ذبح کر رہے ہیں، حلوے بنا رہے ہیں تو یہ شرعاً حرام ہے۔ پتا نہیں کس کا مال ہے، کون کھا رہا ہے؟ تو تمہاری بات بھی میں نے لوگوں کو بتا دی اور ساتھ اللہ کی بھی بتا دی۔ اب یہ تو مناسب نہیں کہ تمہاری بات تو بتا دوں اور اللہ کی نہ بتاؤں۔ اب مرنے والے کو ہماری شان سے غرض نہیں ہے کہ ہم نے کتنا اچھا کھانا دیا بلکہ اسے تو اللہ کی بخشش کی ضرورت ہے۔ کم از کم وہاں تو ہم اپنی رسومات دَر نہ لائیں اور شرعی قاعدہ استعمال کریں۔ افسوس کہ اب تو جنازے پڑھنے میں بھی اتنی رسومات آ گئی ہیں کہ پتا نہیں وہ جنازہ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر شرعی قاعدے سے جنازہ پڑھا جائے تو لوگ تنقید کرتے ہیں کہ اس کا تو جنازہ ہی خراب ہو گیا۔ یہ کتنی افسوسناک صورتحال ہے!

سورۃ الرعد رکوع 3 آیات 19 تا 26

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَھَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِھِمْ وَاَزْوَاجِھِمْ وَذُرِّیّٰتِھِمْ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْھِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ ﴿۲۴﴾ وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ؕ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ آپ پر جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے حق ہے، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ بے شک نصیحت تو عقل مند لوگ ہی قبول کرتے ہیں ﴿۱۹﴾ جو لوگ اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو توڑتے نہیں ﴿۲۰﴾ اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ جن (رشتوں) کو اللہ

نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور بُرے حساب سے خوف کھاتے ہیں ﴿۲۱﴾ اور جو لوگ اپنے پروردگار کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے (گناہ سے) صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو روزی ہم نے ان کو دی ہے اس میں سے پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور نیکی سے بُرائی کو دور کرتے ہیں ان ہی لوگوں کے لیے عاقبت کا گھر ہے ﴿۲۲﴾ ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جن میں یہ داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو نیکوکار ہوں گے (وہ بھی داخل ہوں گے) اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے آتے ہوں گے ﴿۲۳﴾ (اور کہیں گے) سلامتی ہو تم پر یہ تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے سو آخرت کا گھر کیا خوب (گھر) ہے ﴿۲۴﴾ اور جو لوگ اللہ کے وعدوں کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جن (رشتوں) کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے گھر بھی برا ہے ﴿۲۵﴾ اللہ جس کا چاہتے ہیں رزق زیادہ کر دیتے ہیں اور (جس کا چاہتے ہیں) تنگ کر دیتے ہیں اور یہ (کافر) دُنیا کی زندگی پہ خوش ہو رہے ہیں اور دُنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا سامان ہے ﴿۲۶﴾

تفسیر ومعارف

فرمایا، اَفَمَنۡ یَّعۡلَمُ اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ کَمَنۡ ہُوَ اَعۡمٰی جو لوگ اس حقیقت کو پا لیتے ہیں کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے وہ حق ہے، اور جو کچھ اس سے ٹکراتا ہے وہ باطل ہے، وہی اہلِ بصیرت ہیں۔ حق کی گہرائی کو پانے والے، سمجھنے اور قبول کرنے والے، یقیناً ان جیسے نہیں ہو سکتے، جو اندھے ہیں۔

اندھا پن کیا ہے؟

اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ حق کو نہیں پہچانتے باوجود اس کے کہ اس تک پہنچنے کے بے شمار دلائل موجود ہیں، دراصل اندھے ہیں کہ اپنی بصارت کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ اگر بصارت استعمال کرتے تو انہیں ضرور حق نظر آ جاتا۔ اللہ کریم نے انہیں نگاہ دی ہے لیکن یہ اس سے حق اور باطل میں تمیز نہیں کرتے، دیکھتے نہیں ہیں۔ جیسے ایک شخص جو دیکھ سکتا ہو مگر آنکھوں پر پٹی باندھ لے اور کچھ دیکھ نہ سکے تو اندھا ہی ہوگا تو جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ کریم کی طرف سے آپ ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا حق ہے، وہ ان اندھوں کی طرح تو نہیں ہو سکتا جو یہ نہیں جانتے۔ ان کی بصارت اور بصیرت کا کیا فائدہ؟ وہ تو اندھے ہیں۔

عقلمندی کی دلیل:

فرمایا، اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۱۹) ہمیشہ صاحبِ خرد ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ گویا نصیحت حاصل کرنا اور نیکی کو سمجھنا یہ عقلمندی کی دلیل ہے۔ دانشمند وہ ہے جو ارشاداتِ پیغمبر ﷺ کو قبول کرتا ہے، اُن پر عمل کرتا ہے، اور انہیں اپنا حرزِ جاں بنا لیتا ہے۔ آج تو عقلمند اسے مانا جاتا ہے جو بہت زیادہ دولت جمع کر لے، جھوٹ بول کر، دھوکا دہی سے، چوری سے، جیسے بھی کرے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہو سکتی ہے کہ آخرت تباہ کر لی؟ جب مر جائے گا تو دولت چھوڑ کے چلا جائے گا۔ تو صاحبِ خرد یا دانش مند نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو قبول کرتے ہیں۔

دانشمندوں کی صفات:

دانشمندوں کی صفات کیا ہیں؟ فرمایا، اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ (۲۰) دانشمند وہ ہیں جو عہدِ ازل کو کبھی نہیں بھولے، عظمتِ الٰہی کا اقرار کرتے ہیں، اور ویسا کرتے ہیں جیسا نبی کریم ﷺ منوانا چاہتے ہیں۔ ہم نے ازل میں اللہ کریم سے عہد کیا کہ بے شک آپ ہی ہمارے ربّ ہیں۔ پھر مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے ہی کانوں نے اللہ کی عظمت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اعلان سنا۔ پھر جب کلمہ پڑھا تو بھی اللہ سے ایک عہد کیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں (ﷺ)۔ یعنی یہ حقیقت کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے یہ انسان کو اللہ کے رسول ﷺ سے ہی ملتی ہے۔ یہ کلمہ بھی تو ایک شہادت ہے، ایک عہد ہے تو دانشمند اس عہد کو توڑتے نہیں ہیں،

وہ ایسا ہرگز نہیں کرتے کہ زبان سے تو اللہ کا اقرار، اس کی عظمت کا اقرار کریں اور سجدے غیر اللہ کے دروازوں پر کرتے رہیں، بلکہ دانشمند تو اپنے عہد کو قائم رکھتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ اور جن رشتوں اور جن امور کو اللہ کریم نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں جوڑتے ہیں، توڑتے نہیں۔ وہ رشتے خواہ نسبی ہوں، خواہ دوستی کے ہوں، ان کا حق نبھاتے ہیں۔ خوامخواہ آپس میں رنجشیں اور دشمنیاں نہیں پالتے۔ ایسے ہی ایک رشتہ ہے ایمان اور عمل کا، جسے یہ دانشمند جوڑے رکھتے ہیں۔ یعنی جب ایمان لاتے ہیں تو احکام پر عمل بھی کرتے ہیں۔ عمل ہی تو ایمان کا گواہ ہوتا ہے لہٰذا یہ ایمان اور عمل کو جدا نہیں کرتے۔

اس ضمن میں آج ہم دو طرح سے ابتلاء میں گرفتار ہیں۔ دو طرح سے غلطی کرتے ہیں۔ ایک تو محض ایمان لانے کو ہی کافی سمجھ لیتے ہیں اور عمل نہیں کرتے۔ اس ایمان کا کیا فائدہ جس پر عمل نہ کیا جائے؟

دوسرا رویہ یہ ہے کہ عمل کرنے کے بعد، عبادات کرنے پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اب دُنیا کے تمام مسائل کا حل ہو جانا چاہیے تھا۔ جو چند دن نماز پڑھ لیتا ہے وہ یہ سوچ لیتا ہے کہ اب تو اس کے بیٹے کو ملازمت مل جانی چاہیے تھی۔ یا وہ نماز پڑھنے کے بعد اس بات پر حیران ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کے باوجود اسے بخار کیوں ہو گیا ہے؟ یا نماز پڑھنے کے ساتھ ساتھ دکان میں نقصان ہو رہا ہے۔ تو پھر غور طلب بات یہ ہونی چاہیے کہ دکان کو چلانے میں شاید کوئی غلط طریقہ اختیار کیا ہو اس لیے نقصان ہو رہا ہو۔ یا بخار کی وجہ کوئی بدپرہیزی ہو۔ یا بیٹے کو ملازمت نہ ملنے کی وجہ اس کی نااہلی ہو یا کوئی اور وجہ ہو۔ تو نماز ان کاموں کے لیے تو نہیں ہے۔ نماز تو ہمیں اللہ کی اطاعت کی طرف لے جانے کے لیے ہے۔ عبادت کر کے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اب دُنیا میں وہ ہونا چاہیے جو میں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ عبادت سے مزید بندگی آتی ہے، اور بندہ سمجھ لیتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ کریم چاہتے ہیں۔ تو عقلمند وہ ہیں جو وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ نیکی کرنے کے باوجود اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو گئی ہو۔ شاید میرا خلوص اس پائے کا نہ ہو جس پائے کا خلوص بارگاہِ الٰہی میں مطلوب ہے۔ کہیں عمل میں مجھ سے کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ نیکی کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں۔ یہ ڈر یا خشیتِ الٰہی بھی نیکی ہی سے نصیب ہوتی ہے۔ نیکی کرنے والے، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کا اتباع کرنے والے ہی پھر ڈرتے بھی رہتے ہیں کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ جبکہ برائی کرنے والے بے باک ہو جاتے ہیں، جرم پر، گناہ پر دلیر ہو جاتے ہیں اور برائی کر کے بے فکر رہتے ہیں۔ لیکن دانشمند لوگ نیکی کر کے بھی ڈرتے رہتے ہیں وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (۲۱) اور اس بات سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کہ قیامت کے دن اگر

برائیوں کا حساب گلے پڑ گیا تو کیا ہوگا؟ وہ برے حساب سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔

اہلِ دانش کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وہ اللہ کی رضا کے لیے اپنی خواہشات پر صبر کرتے ہیں، انہیں قربان کرتے ہیں۔ یعنی ایسے کام سے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو، موقع اور استطاعت ہونے کے باوجود خود کو روک لیتے ہیں۔ صبر کا معنی خود کو روک لینا ہے، جس طرح سوار تیز رفتار گھوڑے کو باگ کھینچ کر روک لیتا ہے۔ اسی طرح اہلِ دانش کو گناہ کا موقع بھی ملے، اس کے لیے وسائل بھی ہوں، لیکن وہ اللہ کو راضی رکھنے کے لیے اس کی نافرمانی نہیں کرتے، برائی سے رک جاتے ہیں تو یہ صبر ہے۔۔ اگر اسباب و وسائل نہ ہوں اور بندہ گناہ نہ کرے تو یہ صبر نہیں البتہ گناہ سے بچ جانے کا سبب ضرور ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ غریبی بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ بہت سے گناہ ایسے ہیں جس کی استطاعت ایک غریب آدمی نہیں رکھتا۔ اگر یہ دولت مند ہوتا تو شاید یہ بھی شراب نوشی کرتا، برائی کرتا، کسی اور گناہ میں ملوث ہوتا لیکن غریبی نے گناہ کے اسباب پیدا نہیں ہونے دیے۔ لیکن یہ صبر نہ ہوا، البتہ گناہ سے جرم سے تو بچ گیا۔ غریبی کی یہ برکت تو یقیناً ہے کہ غریب آدمی گناہ کم کرتا ہے جبکہ دولت دُنیا جس کے پیچھے ہم دن رات دوڑتے رہتے ہیں یہ گناہ کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے اور گناہ کے لیے وسائل مہیا کرتی ہے۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اُن کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ عبادات کو قائم کرتے ہیں، مسلسل اور مستقل طور پر ادا کرتے ہیں۔ صلوٰۃ قائم کرنا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک تو ہر عبادت کو اس کی شرائط کے مطابق ادا کرنا، دوسرا یہ کہ اس کی ایسی تشہیر کی جائے کہ دوسرے بھی اس میں شامل ہوں۔ عبادات کو ایسی جرأت سے ادا کیا جائے کہ دوسرے لوگ بھی چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنے کی بجائے پورے جذبے اور فخر سے پڑھیں۔ انہیں بھی نیکی پر فخر ہو، شرمندگی نہیں۔

افسوس! کہ آج ہمارا یہ عالم ہے کہ اوّل تو دفاتر میں کوئی نمازی ملتا نہیں، اور اگر کوئی ہو تو وہ دوسروں سے چھپ کر پڑھتا ہے تاکہ ان کی طعن و تشنیع سے بچ جائے۔ یہ رویہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ کی عبادت اور اطاعت پر اور اس کی رحمت پر مومن کو فخر ہونا چاہیے اور اسے پوری جرأت سے عبادات کے قیام کا سبب بننا چاہیے۔ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً اور اللہ نے انہیں جو قوتیں دی ہیں، اہلِ دانش انہیں پوشیدہ بھی اور علانیہ یعنی ظاہراً بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ہر ایک کو اللہ کریم نے مختلف نعمتیں دی ہیں۔ حاکم کو حکومت دی ہے تو صاحب دانش حکمران اسے اللہ کے حکم کے مطابق چلاتا ہے۔ عالم کو علم عطا کیا ہے تو وہ اللہ کی مخلوق تک اللہ کا پیغام پہنچاتا ہے۔

دولتمند کو دولت دی ہے تو وہ زکوٰۃ دیتا ہے، صدقات دیتا ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ کسی کو قوت دی ہے تو وہ زورِ بازو سے غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ وَاَنْفَقُوْا اور خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا انفاق ہے۔ تو اہلِ دانش اللہ کی دی ہوئی نعمتیں نیکی پھیلانے کے لیے پوشیدہ اور ظاہراً خرچ کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور صفت یہ ہوتی ہے کہ وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اہلِ دانش برائی کو نیکی سے روکتے ہیں۔ برائی کا جواب اگر برائی سے ہی دیا جائے تو برائی مزید پھیلے گی، ظلم کا جواب ظلم سے دیا جائے تو مزید بڑھے گا۔ اللہ کے بندے تو برائی کے مقابلے میں نیکی کرتے ہیں۔ اب اس سے یہ مطلب ہرگز نہ اخذ کیا جائے کہ کوئی قتل کردے، یا چوری کرے، ڈاکہ ڈالے تو اسے چھوڑ دینا نیکی ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ جو جرم کرتا ہے اسے اللہ کے قانون کے مطابق سزا دینا نیکی ہے۔ مجرم کو اللہ کے قانون کے مطابق انصاف مہیا کرنا نیکی ہے، چھوڑ دینا نیکی نہیں۔ ہاں! یہ نیکی ہے کہ کسی مجرم کے شرعی سزا پانے کے بعد اس کے پس ماندگان سے دشمنی نہ کی جائے، انہیں طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بنایا جائے، اور انہیں معاشرے سے کاٹ کر الگ نہ کیا جائے۔ لیکن جو جرم کرتا ہے اس کے ساتھ انصاف کرنا بجائے خود نیکی ہے۔ ہمارا رویہ یہ ہے کہ یا تو ہم مجرم کے ہر جرم سے چشم پوشی کر لیتے ہیں اور اسے برائی کرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ خیر ہے، کرتا رہے۔ اس سے برائی اور پھیلتی ہے۔ یا دوسری طرف قتل کوئی ایک کرتا ہے، مقابلے میں قاتل کی بجائے تین اور بے گناہ مار دیتے ہیں، اس سے برائی مزید پھیلتی ہے۔ کیونکہ برائی کا بدلہ اگر برائی سے دیا جائے گا تو برائی مزید بڑھے گی۔ برائی کا جواب اگر اللہ کے قانون کے مطابق، دین کے مطابق، انصاف سے دیا جائے تو یہ نیکی ہے۔ تو اہلِ دانش برائی کو نیکی سے مات دیتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۲۲) ایسے اہلِ دانش کے لیے ہی آخرت کا گھر ہے۔ ان اوصاف کے حاملین کے لیے ہی اللہ کریم نے جنت بنائی ہے۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وہ اُن باغات میں داخل ہوں گے جو ہمیشہ رہنے والے، بے حد خوبصورت، بے حد خوشبودار، بے پناہ روشن، بے مثل و بے مثال ہیں، جو اللہ نے ان کے لیے بنائے ہیں۔

رشتۂ ایمانی کی برکت:

وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ اور اللہ کریم کے ان مقبول بندوں کے خاندان کے وہ افراد جو ایمان کی سلامتی کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہوئے ہوں گے، خواہ اس کے والدین ہوں، اس کی بیویاں ہوں یا اولاد ہوں، اگر اعمال میں کم ہوں تو بھی اللہ کریم انہیں اپنے مقبول بندے کے ساتھ رکھیں گے۔ اپنے اس مقبول بندے کی خوشی کے لیے اس کے مومن اہلِ خانہ کو بھی وہ اعلیٰ منازل عطا فرمائیں گے جس میں وہ مقرب و مقبول مقیم

ہے۔ اس کی خوشی کے لیے اللہ ان سب کو بھی اس درجے پر پہنچا دیں گے۔ تو اسی طرح ایک ایک اللہ کا بندہ کتنے اہلِ خانہ کو ان عظمتوں پر لے جانے کا سبب بن جائے گا۔ اللہ کتنا کریم ہے کہ فرماتا ہے، اس نے زندگی بھر مجھ سے حیا کی، اب میں اس کی خواہشات کا لحاظ کروں گا، یہ اپنے والدین، اولاد اور بیویوں کو اپنے پاس دیکھ کر خوش ہوگا، گو ان کا یہ مقام، یہ مرتبہ نہیں، میں ان کو اس کے ساتھ رکھوں گا۔ ہاں! یہ یاد رہے کہ مومن اور کافر میں کوئی رشتہ نہیں رہتا۔ کفر ایسی مصیبت ہے کہ کافر اور مومن کا کوئی رشتہ نہیں رہے گا، خواہ والدین ہوں، بیویاں ہوں یا اولاد ہو۔ ہاں! اگر رشتہ ایمانی نصیب ہو تو یہ نعمتیں نصیب ہوں گی۔

خانوادۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خوش نصیبی:

صاحب تفسیر مظہری لکھتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقام و مرتبہ یکتا ہے۔ اس بلندیِ مقام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی ثانی نہیں۔ جو اعلیٰ وارفع ترین مقام آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عطا ہوگا، کسی اور کا تو وہ مرتبہ نہیں لیکن اللہ کریم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آباء کو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اولاد کو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خوشی کے لیے آپ کے ساتھ رکھے گا۔ گو ان کی اپنی منازل آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسی نہیں، مگر اللہ کریم انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ساتھ عطا کریں گے تاکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو راحت ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ہوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذرّیت حسنین کریمین رضی اللہ عنہما، اور صاحبزادیاں رضی اللہ عنہن، صاحبزادے رضی اللہ عنہم، سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دولت کدہ پر ہوں گے۔

اہلِ دانش کامیابی سے اللہ کریم کی جنت میں داخل ہوں گے وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ (۲۳) تو جنت کے ہر دروازے سے فرشتے داخل ہو کر انہیں مبارکباد دیں گے، اُن کی خدمت بجا لائیں گے، اور قدم قدم پر عرض کریں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ سلامتی ہو تم پر کہ تم نے دُنیا میں صبر کر کے اللہ کی اطاعت کی، اور دیکھ لو کہ آخرت کا گھر کتنا خوبصورت، کتنا مزیدار، کتنا دلکش ہے۔

اہلِ دوزخ کی دُنیا میں صفات:

کامیاب لوگوں کے مقابل وہ لوگ ہیں وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ جو اللہ سے وعدے کر کے توڑتے ہیں۔ جنہوں نے دُنیا میں آکر کلمہ حق پڑھا ہی نہیں۔ ازل کو تو انہوں نے بھی میثاق کیا تھا، وعدہ کر کے آئے تھے۔ یا وہ لوگ جنہوں نے دُنیا میں آکر وعدے کی تجدید تو کلمہ پڑھ کر کی مگر زندگی بھر رشوت کھاتے

رہے، جھوٹ بولتے رہے چوری کرتے رہے، دھوکا دیتے رہے۔ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ اور جن چیزوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں توڑتے رہے۔ جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا، انہیں چھوڑتے رہے، جن کاموں سے روکا گیا، وہ کام کرتے رہے۔ تو نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ زمین پر فساد پھیل جاتا ہے۔

فساد فی الارض اور اس کا علاج:

ہر بندے کا برا عمل دُنیا میں فساد پیدا کرتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جنگل میں کسی چڑیا کے انڈے اگر گیدڑ کھا لیتا ہے تو دراصل کسی انسان کے گناہ کا اثر ہوتا ہے۔ یعنی جب ہم برائی کرتے ہیں تو روئے زمین پر کہیں نہ کہیں فساد پیدا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ ہو یا کم، لیکن ہوتا ضرور ہے۔ تو جب لوگ اللہ سے کیے گئے وعدے توڑتے ہیں جبکہ ان کو پختہ کر چکے، اور جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم اللہ نے دیا ہے، توڑ دیتے ہیں وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اور وہ زمین پر فساد کا سبب بنتے ہیں۔ آج معاشرے میں ہر طرف فساد برپا ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ بے گناہ لوگ قتل ہو جاتے ہیں۔ ہر شہر، ہر قریہ، ہر گلی میں خون ہی خون بکھرا ہے۔ حکومتی ادارے دہشت گردی کو روکنے میں لگے ہیں۔ جبکہ اس کا آسان علاج ہے کہ سب سے پہلے توبہ کی جائے اور نیکی پھیلائی جائے۔ اللہ کی عظمت کا شعور عام کیا جائے۔ لیکن اگر کافرانہ نظام کے مطابق حکومت کی جائے، سود کھایا جائے، لوگوں کے حقوق پامال کیے جائیں، رشوتیں لی جائیں تو پھر اس کے نتیجے میں تو بہت بڑا فساد ہوگا۔ اور اس کے ذمہ دار وہ بڑے لوگ ہوں گے، جو اعلیٰ عہدوں پر فائز بڑی بڑی برائیاں کر رہے ہیں۔ عجیب بات ہے! برائی چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے، امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آسان حل یہ ہے کہ گناہ کرنا چھوڑ دو، برائی سے پرہیز کرو، فساد از خود رک جائے گا۔

فرمایا، اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے جو روئے زمین پر فساد کا سبب بنتے ہیں۔ لعنت سے مراد ہے کہ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتے ہیں۔ فساد پھیلانے والے لوگ اللہ کی رحمت سے کلی طور پر محروم کر دیے جاتے ہیں۔ تو جو لوگ رحمت سے محروم کر دیے جاتے ہیں، ان سے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں ہو پاتی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت ہیں، تو جو رحمت سے محروم کر دیا گیا ہو، وہ اتباع کیسے کرے؟ ان لوگوں کی برائی نے انہیں اس نعمت سے محروم کر دیا۔ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۲۴) اور اگر اسی پر خاتمہ ہو جائے تو بہت ہی برے گھر میں ان کا ٹھکانہ ہے، جو بہت تکلیف دہ جگہ ہے۔

رزق مقرر ہے:

انسان بھول جاتا ہے کہ اللہ کریم نے رزق مقرر فرما دیا ہے۔ ایک شخص کھربوں روپے جمع کر بھی لے تو اس کے وجود کا حصہ وہی بنے گا جو منجانب اللہ مقرر ہے۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وہ ایسا بے نیاز ہے کہ جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے، اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ ایسا قادر ہے کہ دولت ہوتے ہوئے کھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ امریکن گاڑی فورڈ کا بہت چرچا تھا۔ فورڈ اس کے بانی کا نام تھا۔ اس کارخانے میں کئی ہزار گاڑیاں بیک وقت تیار کی جاتی تھیں۔ پوری دُنیا میں فورڈ کار، فورڈ ٹرک اور بسیں چلتی تھیں۔ اس کے مالک فورڈ نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جتنی دولت اس کے پاس ہے، شاید کم ہی لوگوں کے پاس ہو، لیکن صحت کی خرابی نے اسے پابند کر دیا ہے کہ وہ صبح شام اُبلے ہوئے چنوں کا پانی پیتا ہے اور تھوڑے سے چنے کھاتا ہے، اس کے علاوہ وہ اور کچھ کھا پی نہیں سکتا۔ یہ اس قادر مطلق کا نظام ہے۔ جو اس نے مقرر کر دیا ہے وہی انسانی وجود کا حصہ بن سکتا ہے۔ باقی جو جمع کیا جاتا ہے، نہ جانے کس لیے کیا جاتا ہے؟ کون کھائے گا، کہاں جائے گا؟ انسان خود تو چھوڑ کر مر جائے گا۔ تو ہر جسم کے لیے رزق کے ذرات گنے ہوئے ہیں، مقرر ہیں، تقسیم شدہ ہیں، اور مرنے تک اس تک پہنچتے رہتے ہیں۔ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لوگ دُنیا کا مال و دولت، عہدہ و اقتدار اور دُنیوی لذتیں دیکھ کر پھسل جاتے ہیں اور بہت خوش ہو جاتے ہیں۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اور دُنیا کی زندگی ہے کیا، اس کی حیثیت کیا ہے؟ فِي الْاٰخِرَةِ آخرت کے مقابلے میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ اِلَّا مَتَاعٌ (٢٦) بہت ہی معمولی، بہت ہی قلیل، کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں ہے۔ اگر آج ہم کسی سے کہیں کہ آپ کا یہ کام میں اسی (80) سال کے بعد کروں گا تو وہ شخص فکر مند ہوگا، کہ بہت لمبا عرصہ ہے، نہ جانے کون ہوگا، کون نہیں؟ تو وہ لوگ جو اسی، اسی سال عمر گزار بیٹھے ہیں وہ جب ماضی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم سکول میں تھے، بھاگتے دوڑتے تھے۔ پل بھر میں وقت بیت گیا۔ لیکن جب مستقبل کی بات کی جائے تو وقت بہت لمبا لگتا ہے۔ ماضی کو دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کل ہی تو ماں باپ کی گود میں کھیلتے تھے، پتا ہی نہیں چلا اور وقت گزر گیا۔ دُنیا کی حیثیت یہی ہے کہ چٹکی بجانے میں گزر جاتی ہے۔ آخرت ابدی ہے، کبھی نہ ختم ہونے والی تو بھلا دُنیا کی زندگی کا آخرت سے کیا مقابلہ؟ مقابلہ ممکن ہی نہیں۔

سورۃ الرعد رکوع 4 آیات 27 تا 37

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

اور کافر کہتے ہیں ان پر (ہمارے فرمائشی معجزوں میں سے) کوئی معجزہ ان کے پروردگار کی طرف سے کیوں نازل نہیں کیا گیا آپ فرما دیجیے کہ بے شک اللہ جس کو چاہتے ہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جو ان کی طرف رجوع کرتا (متوجہ ہوتا) ہے اس کو اپنی طرف راستہ دکھا دیتے ہیں ﴿۲۷﴾ (مراد وہ لوگ ہیں) جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ کے ذکر سے ہی دل اطمینان پاتے ہیں ﴿۲۸﴾ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کے لیے خوش

حالی ہے اور نیک انجام ہے ﴿۲۹﴾ اسی طرح ہم نے آپ کو ایک ایسی امت میں (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے یقیناً جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تا کہ آپ ان کو وہ (کتاب) پڑھ کر سنائیں جو ہم نے آپ پر وحی کے ذریعے بھیجی ہے اور یہ لوگ بڑے رحمت والے (اللہ) کو نہیں مانتے۔ فرما دیجیے کہ وہ میرا پروردگار ہے اس کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ﴿۳۰﴾ اور اگر قرآن ایسا ہوتا کہ اس (کی تاثیر) سے پہاڑ چل پڑتے یا اس سے زمین پھٹ جاتی یا اس کے ساتھ (ذریعہ) مُردوں سے باتیں کرا دی جاتیں (تو بھی یہ نہ مانتے) بلکہ سب باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ تو کیا ایمان والوں کو تسلی نہیں ہوئی کہ اگر اللہ چاہتے تو تمام لوگوں کو ضرور ہدایت فرما دیتے اور کافر تو ہمیشہ ایسے حال میں رہتے ہیں کہ ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے ان پر مصیبت آتی رہتی ہے یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ جائے گا یقیناً اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے ﴿۳۱﴾

تفسیر ومعارف

فرمایا، وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کافر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں تو پھر ہمارے مطالبے کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عجائبات و معجزات صادر کیوں نہیں ہوتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار انہیں کیوں نہیں وہ معجزات عطا کرتا جو ہم چاہتے ہیں؟ دراصل ہدایت پانے کے لیے معجزات شرط نہیں ہیں۔ اگر معجزات سے ہدایت نصیب ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اتنے ہیں کہ کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ عزیز خود ایک معجزہ ہے۔ قرآن کریم سے بڑا معجزہ کیا ہوگا؟ کہ ایک ہستی صحرائے عرب میں جلوہ افروز ہو کر، پوری دُنیا کے لیے، قیامت تک کے لیے، پورا دستورِ زندگی عطا کرے، جس میں کبھی کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے۔ وہ ہستی جس نے کسی استاد یا مدرسے سے استفادہ نہ کیا ہو، وہ ایسی خوبصورت عبارتیں پیش کرے جو حقائق سے لبریز ہوں اور اس جیسی عبارت کوئی دوسرا بنا ہی نہ سکتا ہو، کسی معجزے سے کم نہیں۔ قرآن کریم سے بڑا معجزہ کیا ہوگا! کہ اس میں نہ صرف گزشتہ اقوام کے حالات تفصیل سے بیان ہوئے، بلکہ انسانیت کو پیش آنے

والے آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں بھی ہیں۔ انسان کی تخلیق کی تفصیل موجود ہے اور کائنات کی تخلیق بھی زیرِ بحث ہے۔ جس میں سورج، چاند، ستارے اور سیارے سب کے بارے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس عالم آب وگل ہی کے حالات نہیں، بلکہ عالمِ آخرت کی بھی ساری تفصیل قرآن کریم میں بیان کردی گئی ہے۔ اب اس سے بڑا معجزہ کیا ہوسکتا ہے؟ اسی طرح شق القمر کا معجزہ جس میں چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ شبِ معراج کے واقعات، مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کا سفر، بیت المقدس سے عالم بالا کا سفر۔ مانا کہ کافر عالم بالا کا شعور نہیں رکھتے تھے، لیکن بیت المقدس کا تو رکھتے تھے۔ انہوں نے بیت المقدس کے بارے نبی کریم ﷺ سے بہت سوالات بھی کیے۔ بلکہ آپ ﷺ نے ان کے تجارتی قافلوں کو جنہیں آپ ﷺ نے اثنائے سفر دیکھا تھا، ان کا حال بھی بتایا۔ آپ ﷺ کا ایک بہت بڑا معجزہ کنکریوں کا کلمہ پڑھنا بھی تھا، جو کسی مردے کے کلام کرنے سے بھی بڑا ہے۔ اس لیے کہ مردہ پھر انسانی مردہ تو ہے، زندہ ہوگیا تو بولے گا، لیکن کنکر تو بولا نہیں کرتے۔ اس لیے کنکریوں کا بولنا بہت بڑا معجزہ ہے۔ تو پھر یہ سارے معجزات دیکھ کر یہ مسلمان کیوں نہیں ہوئے؟

ہدایت کا مدار انسان کے ذاتی فیصلے پر ہے:

فرمایا، معجزات سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔ معجزات نبیؑ کی صداقت کی دلیل ہوتے ہیں۔ ایمان لانے کا فیصلہ انسان اپنے دل میں کرتا ہے اور یہی فیصلہ ایمان لانے کا سبب بنتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (الشوریٰ: ۱۳) جو خلوصِ دل سے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، اللہ اسے ہدایت دے دیتا ہے۔ جو نہیں کرتا اسے ہدایت نہیں ملتی۔ اس کے لیے معجزات کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس لیے کہ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ معجزات سے ہدایت نصیب نہیں ہوتی بلکہ ہدایت کا مدار انسان کے ذاتی فیصلے پر ہے۔ اور اسی فیصلے پر اس کی جزا وسزا مقرر ہوتی ہے۔ اگر اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتا تو اللہ اسے گمراہ کردیتے ہیں، یہی اس کی سزا ہے۔ اور جو اللہ کی طرف خلوصِ دل سے متوجہ ہوتا ہے تو يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ اس کی ہدایت کا سامان پیدا فرمادیتا ہے۔ اسے ہدایت عطا فرمادیتا ہے۔

ایمان کا حاصل:

خلوصِ دل سے رجوع اِلی اللہ کرنے والوں کو جب نُورِ ایمان نصیب ہوتا ہے تو اُن کے قلوب اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں۔ پھر دُنیا میں ان کا مقصد صرف اللہ کی یاد کو دل میں اتارنا ہوتا ہے۔ یہی ان کی منزل ہوتی ہے، اسی میں انہیں قرار نصیب ہوتا ہے۔

حتمی فیصلہ:

اللہ کریم فرماتے ہیں، اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ (۲۸) خوب اچھی طرح سے جان لو! صرف اللہ کی یاد سے ہی دِلوں کو قرار آنا ممکن ہے۔ اللہ کے ذکر سے دِلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

دُنیا میں انسانی خواہشات کی کوئی حد نہیں۔ ایک چیز کی خواہش ہوتی ہے، وہ مل جائے تو پھر اس سے آگے کی خواہش شروع ہو جاتی ہے۔ وہ مل جائے، پھر اس سے اعلیٰ کی خواہش دل میں سر اٹھاتی ہے۔ یہ دل کی حسرتیں کہیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ ہاں! اللہ کی یاد دل میں بس جائے تو دل کو قرار آ جاتا ہے، اس لیے کہ اس سے آگے کوئی منزل نہیں ہے۔

ذکر اللہ کیا ہے؟

ذکر اللہ کیا ہے؟ ایمان لانا بھی ذکر اللہ ہے۔ صحیح عقیدہ اختیار کرنا بھی ذکر الٰہی ہے کہ انسان اللہ کی عظمت، اس کی توحید کو، اس کی صفات کو قبول کرتا ہے۔ ان پر یقین کرتا ہے تو یہ بھی ذکر اللہ کا ایک درجہ ہے۔ اس کے بعد وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو ہر حکم کے ساتھ اللہ کی عظمت اور اس کا ذکرِ خیر ہوتا ہے۔ جتنے بھی کام اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت میں کیے جاتے ہیں، سب عملی ذکر ہیں۔ نصیحت کرنا بھی ذکر اللہ ہے۔ کوئی تلاوت کرتا ہے، درود شریف پڑھتا ہے، مختلف تسبیحات پڑھتا ہے تو یہ لسانی ذکر ہے یعنی زبان سے کیا جانے والا ذکر ہے۔

ذکر اللہ کا سب سے اعلیٰ درجہ ذکرِ قلبی ہے۔ حدیث شریف میں اس کی فضیلت ارشاد فرمائی گئی ہے۔ یاد رہے ذکرِ قلبی نبی ﷺ کی برکات کے بغیر نصیب نہیں ہوتا۔ ہم عملی ذکر کر سکتے ہیں، لسانی ذکر کر سکتے ہیں۔ لیکن ساری کوششوں کے باوجود ذکرِ قلبی از خود نصیب نہیں ہوتا، جب تک برکاتِ نبوت ﷺ نصیب نہ ہوں۔ قرآنِ کریم تیئس برس میں نازل ہوتا رہا، احکامِ الٰہی تیئس برس میں مکمل ہوئے۔ نبی ﷺ کی برکات ان کی بعثت کے ساتھ ہی شروع ہو گئیں۔

شرفِ صحابیت:

پہلی وحی کے نزول کے بعد جب نبی اکرم ﷺ حرا سے گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے سارا واقعہ بیان فرمایا تو وہ اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ بن نوفل عیسائیت کے بہت بڑے عالم تھے۔ اُنہوں نے ساری بات سن کر تصدیق کی کہ نبی کریم ﷺ کے پاس آنے والا فرشتہ، اللہ کا وہی فرشتہ

ہے جو پہلے انبیاءؑ کے پاس اللہ کی وحی لاتا رہا ہے۔ اور یہ پیغامِ وحی ہے، جیسے پہلے انبیاءؑ پر وحی آیا کرتی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسی وقت ایمان لے آئیں۔ ورقہ بن نوفل بھی ایمان لے آئے۔ خواتین میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نصیب ہوا اور درجہ صحابیت پر فائز ہوئیں۔ قلبی ذکر کی عظمت، قلب کی وہ کیفیات جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو نصیب ہوئیں، وہ سب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اسی لمحے نصیب ہو گئیں۔ حالانکہ اس وقت تو صرف ایک جملہ تھا، وحی کی ابتدا تھی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (سورۃ العلق: 1) قرآن نازل نہیں ہوا تھا، نماز و روزہ فرض نہیں ہوئے تھے۔ حلال و حرام کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن نُورِ ایمان قبول کرتے ہی صحابیہؓ بن گئیں۔ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ بچوں میں یہ سعادت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو نصیب ہوئی تو آنِ واحد میں شرفِ صحابیت پر فائز ہوئے۔ شرفِ صحابیت یہ ہے کہ کھال سے لے کر نہاں خانہ دل تک وجود کا ہر ذرّہ ذاکر ہو جائے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے، ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر: 23) کہ صحابہؓ کے وجود ذکر اللہ سے منور ہو گئے تھے۔ ذکر کا یہ درجہ پانے کے لیے برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہیے۔ صحابیت کے لیے اتحادِ عالم شرط ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُنیا میں جلوہ افروز ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک جگہ پر یکجا ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ اطہر اس شخص کے وجود پر پڑ جائے یا اس شخص کی نگاہ وجودِ عالی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پڑ جائے تو یہ ایک نگاہ وجود کے ذرّات کو ذاکر کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دُنیا سے پردہ فرما گئے تو شرفِ صحابیت کا عطا ہونا ختم ہو گیا۔ پھر جس نے کسی صحابیؓ کو دیکھا وہ تابعیؒ ہو گیا۔ جب صحابہ کرامؓ کا دورِ مبارک ختم ہوا تو تابعیت ختم ہو گئی۔ البتہ جس نے کسی تابعیؒ کو دیکھا وہ تبع تابعیؒ ہو گیا۔ تبع تابعینؒ کا مبارک عہد ختم ہوا تو ولایت رہ گئی۔ اب ان لوگوں نے تبع تابعینؒ سے وہ برکاتِ نبوت حاصل کیں جو سینہ بہ سینہ صحابہؓ اور تابعینؒ سے آ رہی ہیں، اور ان برکات کو آگے لوگوں کو منتقل کیا۔ یہ ہستیاں مشائخ کہلائیں۔

اسلام میں پیری مریدی کا مقام:

برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تقسیم کرنے والی ہستیاں پیر، شیخ کہلائیں جنہوں نے طالبانِ حق کے سینے منور کیے۔ ان کے دلوں میں برکاتِ نبوت انڈیلیں۔ شیخ کا منصب یہی ہے کہ اپنے متقدمین سے وہ برکاتِ نبوت حاصل کرے اور آگے پہنچائے۔ اگر وہ یہ کام نہیں کر سکتا تو وہ شیخ یا پیر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

بیعت کی اقسام:

اصلاحِ احوال کے لیے جو بیعت کی جاتی ہے اسے بیعت اصلاح کہتے ہیں۔ یہ بیعت اس لیے کی جاتی ہے کہ شریعت پر عمل کیا جائے، اور اس شخص سے کی جا سکتی ہے جو روزمرہ کے معاملات، حلال و حرام، جائز ناجائز سے واقف ہو اور راہنمائی کر سکے۔ دوسری قسم بیعتِ امارت ہے۔ یہ اس شخص سے کی جاتی ہے جسے ملک کا سربراہ بنایا جاتا ہے، یا جسے امیر، یا ذِمّہ دار بنانے کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ آج کے دور میں اس بیعت کو ووٹ دینا بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ ووٹ دینے کا موجودہ طریقہ کار اسلام سے بہت ہٹ کر ہے۔

بیعت کی ایک تیسری قسم ہے موت پر بیعت۔ یہ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بھی کی تھی۔ موت پر بیعت کسی ایسے شخص سے کی جاتی ہے جو آخری دم تک کفر کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے یا پھر ارادہ کر لیتا ہے۔ بیعت کی چوتھی قسم بیعتِ تصوف ہے، جو ایک منفرد بیعت ہے۔ یہ صرف اس شخص سے ہو سکتی ہے جسے بارگاہِ رسالت میں روحانی طور پر رسائی حاصل ہو، اور طالب کو بھی وہاں تک رسائی حاصل کرانے کی استعداد رکھتا ہو۔ اگر وہ خود فنافی الرسول نہ ہو اور نہ ہی طالب کو کرا سکتا ہو تو اس کے ساتھ تصوف کی بیعت جائز نہیں ہے۔

ایک صحابیؓ کا ایمان افروز واقعہ:

ہر صحابیؓ کو براہِ راست برکاتِ نبوت ﷺ نصیب ہوئیں۔ اس کا عالم یہ ہے کہ ایمان قبول کرتے ہی وہ ان بلند منازل پر فائز ہوا کہ اگر سارے جہاں کے انسان بھی اعلیٰ ترین منازل کے حامل اولیاء بن جائیں اور ان کی ولایت جمع کی جائے تو صحابیؓ کی خاکِ پا تک بھی نہیں پہنچتی۔ ساری ولایت تبع تابعین سے نیچے ہی رہ جاتی ہے۔ کتنے صحابہؓ نماز، روزہ فرض ہونے سے پہلے ہی دُنیا سے رخصت ہو گئے، شریعت کے احکام، حلال و حرام کی تعیین سے پہلے پردہ فرما گئے، شرفِ صحابیت کے ساتھ رخصت ہوئے۔ غزوۂ خیبر کا ایک واقعہ اس کی روشن مثال ہے۔ جب مسلمانوں نے خیبر کا محاصرہ کر رکھا تھا، تو کسی یہودی رئیس کا ایک حبشی غلام اس کی بکریاں لے کر قلعے سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ بے شمار لوگوں نے قلعے کو گھیر رکھا ہے اور مسلح ہیں، تلواریں سونت رکھی ہیں، زرہیں پہن رکھیں ہیں۔ وہ سادہ سا آدمی تھا، بہت گھبرایا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے، تو باہر جو لوگ تھے یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اُن میں سے کسی سے اس نے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے کہ صبح جب وہ ریوڑ لے کر نکلنے لگا، تو اندر بھی سب تلوار سونتے کھڑے تھے اور زِرہ پہنے ہوئے تھے، باہر بھی دیکھا ہے تو یہی عالم ہے، کہنے لگا ہم تو بہت امن سے زندگی گزار رہے تھے، یہ سب کیا معاملہ ہے؟ تو صحابیؓ نے بتایا کہ ہمارے ساتھ اللہ کے نبی اور

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اللہ نے انہیں حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اور وہ ایمان کی دعوت دیتے ہیں، جبکہ یہ یہود ایمان کا راستہ روکتے ہیں۔ لہٰذا اللہ کریم نے ان یہود کے خلاف جہاد کا حکم دیا ہے، اور اسی لیے ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر یہاں جہاد کے لیے آئے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ اگر کوئی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مان لے تو کیا ہوتا ہے؟ صحابیؓ نے کہا جو اللہ کو مان لیتا ہے اسے اللہ کی رحمت نصیب ہوتی ہے۔ اس دُنیا میں بھی نصیب ہوتی ہے اور جب دُنیا سے جائے گا تو اللہ کی اعلیٰ ترین جنت میں اسے جگہ ملے گی۔ تو وہ کہنے لگا کہ مجھے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے چلو۔ چنانچہ وہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آئے۔ اس نے خدمتِ عالی میں سوال عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی مان لوں اور مر جاؤں تو کیا مجھے بھی جنت نصیب ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، بے شک ہوگی۔ تو اس نے عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ میرے پاس کچھ بکریاں ہیں جو ایک یہودی کی ہیں، جو میں قلعے سے باہر لایا ہوں، ان کا کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، انہیں قلعے کی طرف ہانک دو، یہ اندر چلی جائیں گی۔ اُس نے کہا کہ یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا، اب مجھے بھی کوئی زِرہ، تلوار دی جائے تا کہ میں بھی جہاد میں شامل ہو جاؤں۔ اس نے وہ بکریاں قلعے کی طرف ہانک دیں، اور اللہ کی شان کہ وہ ساری سیدھی قلعے کے دروازے تک پہنچی، محافظوں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور وہ ساری اندر چلی گئیں، جیسا کہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ وہ خود مجاہدین میں شامل ہو گیا، اور اسی دن شہید ہو گیا۔ نہ اس نے ابھی نماز سیکھی، نہ ہی نماز کا وقت آیا، نہ کوئی سجدہ کیا ہے۔ جب شہداء کے جسد خاکی لائے گئے تو اس کی میّت بھی شامل تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ اس نو مسلم حبشی غلام کی میت ہے، جو ابھی ابھی مسلمان ہوا اور اسی جہاد میں شامل ہو کر شہید ہو گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی طرف تشریف لے گئے، لیکن جب سامنے اس کی میّت نظر آئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نگاہیں نیچی فرما کر خیمۂ اطہر میں تشریف لے گئے۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس کیوں تشریف لے گئے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جونہی وہ سامنے ہوا تو اس کی حور اس کے پاس بیٹھی تھی اس لیے میں واپس آ گیا۔

یہ منازل پانے کے لیے وہ ایک ذرّہ برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چاہیے۔ قلب کو ذکر نصیب ہو جائے، اور قلب وجود کے ذرّات کو ذاکر کر دے تو یہ بہت ہی عظیم دولت ہے۔

ایمان اور عملِ صالح:

فرمایا، اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ایمان لائے اور ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی

کیا۔ قرآنِ کریم میں بکثرت ایمان کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر آتا ہے۔ ایمان کا تقاضا ہی عملِ صالح ہے۔ ایمان نام ہے بات کو مان لینے کا، یقین کر لینے کا۔ اور بات مانی جائے تو معنی یہ ہوتا ہے کہ اس بات پر عمل کیا جائے۔ کسی سے کہا جائے کہ پانی کا گلاس لا دو، وہ کہے کہ آپ کی بات مان لی ہے، قبول ہے، سر آنکھوں پر ہے، لیکن پانی لا کر نہیں دیتا۔ بار ہا کہنے پر بھی ایسے ہی جواب دیتا ہے، مگر پانی لا کر نہیں دیتا تو کیا سمجھا جائے گا کہ اس نے بات مانی ہے؟ ایمان کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ جب ہم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وہ لوگ جنہیں نُورِ ایمان نصیب ہوتا ہے، اور وہ ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتے ہیں طُوۡبٰی لَہُمۡ وَ حُسۡنُ مَاٰبٍ (۲۹) بہت خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ اُن کا انجام بہت خوبصورت ہوگا۔ انہیں مبارک ہو جنہیں دُنیا میں نُورِ ایمان نصیب ہوا، اور پھر اس پر عمل نصیب ہوا۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی یہ زندگی بھی مبارک ہے، موت بھی مبارک ہے، برزخ بھی مبارک ہے۔ میدانِ حشر بھی مبارک ہے اور ان کے لیے دائمی زندگی ہے۔

فرمایا، کَذٰلِکَ اَرۡسَلۡنٰکَ فِیۡۤ اُمَّۃٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہَاۤ اُمَمٌ آپ ﷺ کوئی انوکھے رسول یا نبیؑ مبعوث نہیں ہوئے کہ ان لوگوں کو اتنی حیرت ہو رہی ہے یا یہ پہلی اُمت ہے جس کی طرف آپ ﷺ مبعوث ہوئے ہیں اور اس سے پہلے کوئی نبیؑ نہیں آیا، ایسا تو نہیں ہے۔ یا پھر یہ جانتے نہیں، انہوں نے انبیاءؑ اور رسلؑ کے حالات یا تاریخ نہیں پڑھی؟ آپ ﷺ کو ہم نے ایسی امت میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں۔ اور یہ جانتے ہیں کہ اسی طرح پہلی امتوں کی طرف انبیاءؑ مبعوث ہوتے رہے تھے۔ یہ جانتے ہیں کہ جو لوگ انبیاءؑ کی اطاعت کرتے تھے وہ کامیاب ہو جاتے تھے، اور جو مخالفت کرتے تھے وہ عذابِ الٰہی کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتے تھے۔ بہت سی اُمتیں پہلے گزری ہیں جن میں کچھ کے آثار باقی ہیں اور کچھ کے مٹ چکے ہیں۔ ان امتوں کے بارے میں جو کچھ ان لوگوں نے سن رکھا ہے اس میں کچھ باتیں صحیح، اور کچھ غلط بھی ہیں۔ مگر یہ ان سب کو معلوم ہے کہ بعثتِ نبیؑ کوئی انوکھی بات نہیں، اور آپ ﷺ کا نبی مبعوث ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی انسانوں کی طرف انبیاءؑ تشریف لاتے رہے ہیں۔

آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد:

فرمایا، لِتَتۡلُوَا عَلَیۡہِمُ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ آپ ﷺ کو ہم نے اس لیے مبعوث فرمایا ہے کہ جو بات ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، وہ آپ ان تک پہنچا دیں۔ آپ ﷺ کا منصبِ عالی یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا کلام

وصول کریں اوران لوگوں کو سنا دیں۔ اللہ جل شانہٗ کا کلام سوائے نبیؑ کے کوئی نہیں سن سکتا، نہ وصول کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ غیر نبیؑ میں پاکیزگی اور طہارت اور لطافت کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو نبیؑ میں ہوتا ہے۔ کلامِ الٰہی کو وصول کرنے کے لیے خلوص، نیکی، پاکیزگی کا جو اعلیٰ درجہ چاہیے، وہ صرف نبیؑ میں ہوتا ہے، اس لیے اللہ کا کلام صرف نبیؑ سن سکتا ہے، وصول کرسکتا ہے۔ اور یہ وحی جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے وہ آپ ﷺ ان کو سنا دیجیے۔ تاکہ یہ اللہ کی عظمت کا اقرار کریں، ورنہ یہ تو وَهُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ بِالرَّحۡمٰنِ ایسے جاہل ہیں کہ اللہ کی بے پناہ رحمتوں سے ہر آن مستفید ہونے کے باوجود اس کی عظمت کا انکار کیے بیٹھے ہیں۔ اللہ نے ہر نعمت دے رکھی ہے۔ ان کا اپنا وجود، والدین، اولاد، گھر بار، مال و دولت، عہدے، اس کی عطا ہیں۔ زندگی کے سارے اسباب مسلسل مہیا کیے جارہے ہیں۔ ہر لمحہ سورج کی گرمی پہنچ رہی ہے، چاند کی روشنی پہنچ رہی ہے، ہوا کے جھونکے آرہے ہیں۔ لیکن یہ ایسے نادان ہیں کہ اس کی عظمت کے منکر ہیں تو آپ ﷺ پر وحیٔ الٰہی اس لیے بھیجی جاتی ہے کہ آپ وہ وحیٔ الٰہی انہیں سنا دیں، تاکہ انہیں اللہ کی عظمت کا احساس ہو اور یہ اس پر ایمان لے آئیں۔

اب رہی یہ بات کہ آپ ﷺ کے وحیٔ الٰہی سنانے پر کیا نتائج سامنے آتے ہیں۔ لوگ آپ ﷺ کی بات مانتے ہیں، یا چھوڑ کر چل دیتے ہیں، یا کچھ ان میں سے ایسے بدبخت ہیں کہ وہ مخالفت پر کمربستہ ہوجاتے ہیں، اور آپ ﷺ کی آواز ہی خاموش کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں فرما دیجیے، قُلۡ هُوَ رَبِّيۡ کہ جس طاقت پر تمہیں گھمنڈ ہے، جس زندگی پر تمہیں ناز ہے، یہ سب تمہیں کس نے دیا ہے، جن چیزوں پر تم اکڑتے ہو، وہ سب کچھ کس نے دیا ہے؟ یاد رکھو! وہی ذات میری بھی پروردگار ہے، میری زندگی اور موت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، تم کچھ نہیں کرسکتے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وہ واحد لاشریک ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں، اور کوئی دوسرا ایسا نہیں جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں، جس کی عبادت کی جائے۔ وہ اکیلا ہے، واحد لاشریک ہے۔ جس طاقت پر تمہیں گھمنڈ ہے کہ میرے اتنے بیٹے ہیں، میری اتنی قوم ہے، میرا اتنا لشکر ہے، میرے بازو میں اتنی قوت ہے، تو یاد رکھو! یہ ساری طاقت، یہ سارے اسباب جس نے تمہیں دیے ہیں، میرا پروردگار بھی وہی ہے۔ میری حفاظت بھی وہی کرے گا۔ اگر تم مخالفت پر کمربستہ ہو تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے، اس لیے کہ میرا پروردگار واحد لاشریک ہے اور میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اِلَيۡهِ مَتَابِ (۳۰) اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں اس کی بارگاہ سے حکم حاصل کرکے تمہیں سناتا ہوں، اور تم اگر مخالفت پر آمادہ ہو تو جان لو! کہ میری حمایت کے لیے وہی کافی ہے۔

قرآن کریم سے ہدایت پانے کے لیے انابت شرط ہے:

فرمایا، وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى اگر ان کے مطالبات کے مطابق قرآن کریم کے ساتھ یہ باتیں بھی متعلق کر دی جاتیں کہ اگر آپ ایک آیت پڑھتے تو پہاڑ ایک جگہ سے چل کر دوسری طرف چلا جاتا، یا زمین پھٹ جاتی، یا پھر مردہ بات کرنے لگ جاتا تو پھر بھی ان لوگوں کو ہدایت تب ہی نصیب ہوتی جب یہ رجوع إلی اللہ کرتے۔

اللہ کریم جس کام کا ارادہ ظاہر فرمائیں تو چونکہ وہ ارادۂ الٰہی ہوتا ہے، اس لیے وہ کام ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں اللہ کریم نے فرمادیا کہ اگر ہم اس قرآن میں ایسی طاقت رکھ دیتے کہ اس سے پہاڑ چل پڑتے، اس سے زمین پھٹ جاتی، اس سے مردے بات کرتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ چیزیں قرآن میں موجود ہیں۔ قرآن کریم پڑھنے سے ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن وہ ان کی ہدایت کا سبب نہیں بن سکتا۔ ہدایت انہیں رجوع إلی اللہ ہی سے نصیب ہوگی۔ قرآن اللہ کی شان بیان کرتا ہے۔ اللہ کے اوصاف وصفات بیان کرتا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کا مقام ومرتبہ بیان کرتا ہے۔ دُنیا کی بات کرتا ہے اور آخرت کی بات کرتا ہے، ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ جتنے معجزات قرآن سے وابستہ ہوں وہ اپنی جگہ، لیکن ہدایت اسے ہی نصیب ہوگی جس کے دل میں انابت آئے گی بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا تمام فیصلے اللہ کے لیے ہیں، اور اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اس نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں راستے واضح کر کے انتخاب کا اختیار دیا ہے تو جو نیکی پر چلنے کی آرزو کرے گا، اللہ کریم اس کا ہاتھ تھام لیں گے، اس کی مدد فرمائیں گے، اور جو پیٹھ پھیر کر چلا جائے گا، اسے دھکا ہی لگے گا، وہ گمراہی میں اور آگے چلا جائے گا۔

انسان کا اختیار:

فرمایا، اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا مومنوں کے لیے تو یہی اطمینان کافی ہے کہ اگر اللہ چاہتے تو ساری مخلوق ہدایت اور نیکی پر کاربند ہو جاتی۔ اللہ کریم نے اگر حکماً نیکی پر لگانا ہوتا تو جو مخلوق ایک ایک سانس اس کے حکم سے لیتی ہے۔ جس کے دل کی دھڑکن اس کے حکم کی محتاج ہے، جس کی نگاہ کا ہر زیر و بم اس کے حکم کا محتاج ہے۔ جس کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، جس کے حکم سے بوڑھے ہو جاتے ہیں، اس کے حکم سے ہی صحت مند ہوتے ہیں، اس کے حکم سے ہی بیمار ہوتے ہیں۔ ساری زندگی تو اس کے حکم کے تابع ہے، تو اگر وہ چاہتا کہ سارے انسان نیک ہو جائیں تو کیسے نیک نہ ہوتے؟ یہ اس کی مرضی کہ اس نے یہ فیصلہ کہ

نیکی اختیار کی جائے، یا برائی، انسان کی پسند پر چھوڑ دیا ہے۔ اسے شعور دیا ہے، اسے عقل دی ہے اور اس کے پاس دعوت بھیجی، انبیاءؑ مبعوث فرمائے۔ کتابیں بھیجیں، اب فیصلہ انسان نے کرنا ہے کہ وہ کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ ورنہ اگر اللہ حکماً نیکی کروانا چاہتے تو کس کی مجال تھی کہ وہ انکار کرتا؟

کفر اور مصائب:

فرمایا، وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ کفر ایسی مصیبت ہے کہ کوئی لمحہ خالی نہیں جاتا جب اس پر نت نئی مصیبت نہ آتی ہو۔ یا کافر کی ذات پر نازل ہوتی رہے گی، یا اس کے گھر پر آتی رہے گی، یا اس کی بستی پر نازل ہوتی رہے گی حتیٰ کہ موت کا وقت آجائے۔ کفر ایسی لعنت ہے کہ ایسا انسان کروڑوں کے ڈھیر پر بظاہر بیٹھا نظر آئے، لیکن اس کے دل میں ہزاروں حسرتیں دم توڑ رہی ہوتی ہیں۔ کبھی صحت کی خرابی آجاتی ہے، کبھی اولاد کی پریشانی آجاتی ہے، کبھی معاشرے کی پریشانیاں۔ الغرض! کفر ایسی مصیبت ہے کہ کافر کو سکون نصیب نہیں ہوتا، خواہ اس کے پاس حکومت واقتدار بھی ہو۔ ساری زندگی مصیبت میں رہتا ہے حَتّٰى يَأْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ حتیٰ کہ موت آجائے، اللہ کا وعدہ آجائے اور مدتِ حیات تمام ہو جائے۔ کفر کے ساتھ مصائب لازم وملزوم ہیں، پریشانیاں لازم وملزوم ہیں۔

دعویٰ ایمان کے ساتھ کافرانہ کردار اور مصائب:

اگر دعویٰ ایمان بھی ہو اور کردار کافرانہ اپنا لیا جائے تو بھی مصائب و پریشانیاں آتی ہیں۔ آج کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ ہم دعویٰ ایمان بھی رکھتے ہیں، الحمد للہ! نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، حج وعمرہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن جب کردار کی اصلاح نہیں کرتے، لین دین میں بددیانتی کرتے ہیں، دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں، تو ایک سے بڑھ کر ایک نئی پریشانی نازل ہوتی ہے۔ تو اگر مسلمان کا یہ عالم ہے تو جو ہے ہی کافر، جس کا ہر کام ہی برائی ہے۔ اس کا یہ حال دائمی ہے کیونکہ کافر کوئی کام اللہ کے لیے نہیں کرتا۔

مسلمان اگرچہ گناہگار بھی ہو، کم از کم اللہ کے لیے سجدہ تو کر لیتا ہے۔ کسی وقت کچھ اچھا تو کر لیتا ہے جبکہ کافر بے مہار ہے۔ فرمایا، کافر کو پریشانیاں گھیرے رکھتی ہیں، یہاں تک کہ موت کی وادی میں اتر جائے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۳۱) اور اللہ کریم کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے۔ یہ بھی اللہ کریم کا وعدہ ہے کہ جنہیں ذکرِ قلبی نصیب ہوتا ہے، انہیں اطمینان نصیب ہوتا ہے، اور جو کفر کی طرف جاتے ہیں وہ پریشان رہتے ہیں۔

سورۃ الرعد رکوع 5 آیات 32 تا 37

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٣٤﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿٣٥﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿٣٦﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿٣٧﴾

اور بے شک بہت سے پیغمبروں سے جو آپ سے پہلے ہوئے، تمسخر ہوتے رہے ہیں۔ پس ہم نے کافروں کو مُہلت دی پھر ان کو پکڑ لیا سو (دیکھ لیں) ہمارا عذاب کیسا تھا ﴿۳۲﴾ تو بھلا جو ہستی ہر شخص کے اعمال کی (ہر وقت) نگہبان (باخبر) ہو اور (جو) ان لوگوں نے اللہ کے شریک مقرر کر رکھے ہیں (جن کو کوئی خبر نہیں،

برابر ہو سکتے ہیں؟) فرمائیے کہ ذرا ان کے نام تو لو۔ یا تم اُس (اللہ) کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کو وہ زمین میں (کہیں بھی) نہیں جانتا یا محض ظاہری (جھوٹی) بات کرتے ہو۔ بلکہ کافروں کو ان کے فریب خوبصورت لگتے ہیں اور (اسی وجہ سے) وہ (ہدایت کے) راستے سے روک دیے گئے ہیں اور جس کو اللہ گمراہی میں رکھے سو اس کو کوئی ہدایت پر لانے والا نہیں ﴿۳۳﴾ ان کے لیے دُنیا کی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے اور ان کو اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا بھی نہیں ﴿۳۴﴾ جس جنت کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کے اوصاف یہ ہیں کہ اس کے تابع نہریں بہہ رہی ہیں اور اس کا پھل ہمیشہ رہنے والا ہے اور اس کا سایہ بھی۔ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو پرہیز گار ہیں۔ اور کافروں کا انجام آگ (دوزخ) ہے ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (کتاب) سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل فرمائی گئی ہے اور بعض لوگ (فرقے) ایسے ہیں کہ اس کی کچھ باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ فرما دیجیے کہ بے شک مجھے یہی حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤں میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے ﴿۳۶﴾ اور اسی طرح ہم نے اس (قرآن) کو نازل فرمایا۔ یہ ایک فرمان ہے عربی زبان میں اور اگر آپ (بفرضِ محال) ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں اس کے بعد کہ آپ کے پاس (صحیح) علم پہنچ چکا تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ بچانے والا ﴿۳۷﴾

تفسیر و معارف

انسان کے مزاج کا خاصہ ہے کہ وہ اکثر خود کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھتا ہے۔ اسی لیے معاشرے میں یہ رویہ نظر آتا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو میں کر رہا ہوں، یہ ٹھیک ہے اور جو مجھے منع کر رہا ہے، وہ نا سمجھ ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسا

شخص نہیں ملتا جو اپنی جہالت کو قبول کرے۔ جس سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ میں ہی صحیح کر رہا ہوں دوسرے سب لوگ غلط ہیں۔ حتیٰ کہ یہی وطیرہ انبیاءؑ و رُسل علیہم السلام کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔

ارشادِ باری ہے، وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے بھی انبیاءؑ کا مذاق اڑایا گیا۔ اگرچہ یہ نہ ماننے والوں کی جہالت تھی کہ نہ ماننے کر ان کی دُنیا و آخرت تباہ ہو رہی تھی۔ لیکن وہ انبیاءؑ کا تمسخر اڑا رہے تھے، جاہلانہ اعتراضات کر رہے تھے کہ بھلا کس نے جنت دیکھی ہے، جہنم دیکھا ہے؟ بھلا جو مر گئے وہ کیسے زندہ ہوں گے؟ یہ سب ان کے بنائے ہوئے افسانے ہیں۔ ہم اپنے مال کے مالک ہیں، ہمارے کمانے کے اپنے طریقے ہیں۔ ان سے ہماری آمدن بڑھتی ہے تو یہ ہمارے طریقوں کو بدلنا چاہتے ہیں۔ جب ہم اپنے مال کے خود مالک ہیں تو ہم ان کے کہنے پر زکوٰۃ کیوں دیتے پھریں؟ یہ ہمیں سود سے کیوں منع کرتے ہیں، ہم اس طرح کیوں نہ کمائیں؟ چونکہ منکرین اس طرح انبیاء و رُسل علیہم السلام کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے تھے تو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلجوئی کرتے ہوئے اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے بھی انبیاء و رُسل علیہم السلام کے ساتھ ایسے ہی حالات پیش آتے رہے۔

فَاَمۡلَيۡتُ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میری ذات ہی ایسی کریم ہے کہ میں نے کافروں کو بھی ایک خاص وقت تک مُہلت دی ہے کہ شاید یہ سوچنا گوارا کریں اور سمجھ جائیں کہ جو مہلت ازل سے مقرر ہو چکی ہے وہ مُہلت انہیں دی گئی ہے تاکہ وہ سنبھل جائیں۔ وہ اس مُہلت کا فائدہ اٹھا کر سنبھل جاتے، توبہ کر لیتے تو اللہ کریم ان کی توبہ قبول فرما لیتے لیکن وہ نہ سنبھلے ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ تو پھر پکڑے گئے، اللہ کی گرفت میں آ گئے۔ گزشتہ اقوام کی تاریخ دیکھ لیجیے فَكَيۡفَ كَانَ عِقَابِ (۳۲) جب اللہ کا عذاب آیا تو پھر ان کا کیا حشر ہوا، ان پر کیسی گرفت آئی کہ آج ان کا نام لیوا کوئی نہیں۔ ان کے بڑے بڑے محلات اور قلعے مسمار ہو گئے، شہر ویران ہو گئے، قوموں کا نام و نشان مٹ گیا۔ آج کوئی ان کے گھروں کی نشاندہی کرنے والا بھی نہیں۔ یہ حال تو ان کا دُنیا میں ہے اور آخرت میں ہمیشہ کا خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو گئے۔

قرآن ہر عہد کے لیے ہدایت:

قرآنِ حکیم ہر زمانے کے لیے سامانِ ہدایت رکھتا ہے۔ ہر عہد کے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ ہر فرد اور ہر معاشرے کی ہدایت کا سبب ہے لیکن انسانی مزاج عجیب ہے۔ اپنے عہد کی بات کریں کہ جب ہم قرآنِ حکیم کی ایسی آیات پڑھتے ہیں تو انہیں کفار سے مخصوص کر دیتے ہیں اور خود اپنے کردار کو فراموش کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کریم

کافرانہ کردار کی بات کرتے ہیں، تاکہ خود کو مسلمان کہلوانے والے ایسا کردار اپنانے سے باز رہیں۔ یہ واضح فرماتے ہیں کہ نتائج کردار پر مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کردار ہوتا ہے، ویسا انجام ہوتا ہے۔ جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبیؐ قبول نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ کافر نبیؐ کی نبوت ورسالت کا انکار کر کے کہتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات قابل عمل نہیں، یہ فضول ہے، ہم نہیں مانتے۔ زکوٰۃ دینے سے تو مالی نقصان ہوگا، جہاد میں جانیں برباد ہوں گی وغیرہ تو اللہ کریم ان کے اس عمل کو مذاق اڑانا فرمار ہے ہیں تو جو کلمہ گو ہیں جب وہ کلمہ پڑھ کر کہتے ہیں کہ ہم اطاعت نہیں کریں گے تو ان کا یہ عمل کافروں کے مذاق اڑانے سے زیادہ سنگین استہزا ہے۔ جو کلمہ پڑھ کے فرض صلوٰۃ ادا نہیں کرتا، جو حرام کمانے اور حرام کھانے سے نہیں چوکتا، جو جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتا تو یہ مسلمان کہ یہ دعویٰ بھی ہو کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانتے ہیں لیکن کام اپنی مرضی کے کرتے ہیں تو اللہ معاف کرے یہ شریعت کا اور عظمت رسالت کا مذاق اڑانا ہے۔ ایسے کردار پر وہی نتائج مرتب ہور ہے ہیں جو کفار پر مرتب ہوئے۔

آج ہم مختلف قسم کے عذابوں کی زد میں ہیں۔ کس پہلو سے ہماری زندگی خیر سے گزر رہی ہے؟ معاشی، تعلیمی، گھریلو، خاندانی یا قومی، کون سا پہلو درست ہے؟ کہیں سکون نہیں۔ رات دن قتل ہور ہے ہیں، لوگ مارے جارہے ہیں، لُوٹے جارہے ہیں، اغواء کیے جارہے ہیں۔ حکومتیں بھی ہیں، عدالتیں بھی لیکن کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نہ قانون نافذ ہے نہ انصاف ہور ہا ہے۔ اس سے بڑا عذاب کیا ہوگا! اللہ کسی کو ہوش دے، وہ توبہ کر لے تو وہ قادر ہے کہ ساری بدامنی میں بھی اسے امن وامان سے رکھے۔ اس کے دل کو سکون عطا کرے۔ اس کی جان، مال، آبرو کو محفوظ رکھے۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وہ ہستی جو ہر متنفس کے ہر عمل پر نگہبان ہے اس کی ہر حرکت ہر سکون سے واقف ہے۔ کوئی ذی روح کچھ سوچتا ہے کچھ بولتا ہے یا کچھ کرتا ہے وہ واحد لاشریک ہر چیز پر خود نگہبان ہے ہر چیز کو خود دیکھ رہا ہے، جان رہا ہے۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ پھر یہ ایسے عجیب لوگ ہیں کہ اس کی مخلوق میں سے اس کے شریک مقرر کر لیتے ہیں۔ یہ سوچتے نہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی میں اللہ کی ذات، یا صفات مانی جائیں تو وہ اللہ کا شریک ٹھہرے گا، اور اللہ کے علاوہ سب مخلوق ہے، مخلوق میں الوہیت کہاں سے آگئی؟ فرمایا، میرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے فرمائیے، قُلْ سَمُّوْهُمْ کوئی ہستی ایسی ہے جو اللہ کی ذات میں، یا صفات میں اس کی شریک ہے تو بتاؤ، اس کا نام لو؟ کوئی ہے ہی نہیں، اللہ اکیلا خالق ہے، اکیلا مالک ہے، اکیلا حاکم ہے۔ باقی سب مخلوق ہے۔ مخلوق خالق کے ساتھ کس طرح شریک ہوسکتی ہے؟ فرمایا، اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کیا تم اللہ

کریم کو وہ بات پہنچانا چاہتے ہو جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں؟ کیونکہ مخلوق تو اس نے جتنی پیدا کی، جہاں تک پیدا کی، ہر ذی روح، ہر غیر ذی روح، ہر ذرے اور ہر سیل تک سے وہ خود ذاتی طور پر واقف ہے۔ پوری مخلوق میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ کوئی اس کی ذات میں شریک نہیں۔ کوئی اس کی صفات میں شریک نہیں۔ تم نے شریک کہاں سے ڈھونڈ لیے؟ اور اگر کوئی ہے تو اس کی نشاندہی کرو کہ یہ اللہ کی صفت میں شریک ہے۔ یہ اللہ کی ذات میں شریک ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی! فرمایا، محض اپنی طرف سے نام تراش کر تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ علیم و خبیر کو تو خبر نہیں ہے اور تمہیں خبر ہے۔ تم وہ بات اللہ کو بتانا چاہتے ہو، جبکہ اللہ ہر شئے سے، ہر حال، ہر وقت واقف ہے۔ لہٰذا بالکل ظاہر ہے کہ یہ جھوٹی بات ہے، غلط بات ہے اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مشرکین اور کفار کو اپنی مشرکانہ رسومات اور عقائد بڑے پسند ہیں۔ اس پر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ جب وہ شیطان کی پیروی کرتے ہیں تو وہ شیطانی اعمال اور کفریہ عقائد انہیں بنا سنوار کر، خوبصورت بنا کر دکھاتا ہے۔ پھر وہ صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، اللہ کے پیغمبر ﷺ کا بھی مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم جو بتوں کی پوجا کر رہے ہیں ہم بڑے صحیح راستے پر ہیں، اور یہ اس سے محروم ہیں۔ فرمایا، اس میں کوئی کمال شیطان کا بھی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس بندے کا اللہ سے تعلق ٹوٹ جائے، اطاعت کا رشتہ نہ رہے تو اللہ کی طرف سے اسے رستے سے ہٹا دیا جاتا ہے، اور جو راستے سے ہٹ گیا، گمراہ ہو گیا۔ وہ شیطان کا شکار ہے، وہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ جہاں جی چاہے لے جائے، جیسا جی چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے۔ یہ بہادری شیطان کی نہیں، کمزوری انسان کی ہے۔ جب یہ اللہ اور اللہ کے نبی ﷺ کا دامن چھوڑتا ہے تو شیطان کا شکار ہو جاتا ہے وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ(۳۳) جب اللہ کی طرف سے ان کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے، اللہ سے ایمان کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایمان اور اتباع کا رشتہ نہیں رہتا تو شیطان کا شکار بن جاتے ہیں۔ اللہ کریم انہیں آوارہ کر دیتے ہیں، شیطان شکار کر لیتا ہے۔ اور اللہ جسے ردّ کر دے، جسے چھوڑ دے، پھر اللہ کے علاوہ اسے کوئی بچانے والا بھی نہیں، کوئی اس کی دستگیری کرنے والا یا مدد کرنے والا بھی نہیں۔ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دُنیوی زندگی بھی ان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ یہ ایک ایک سانس دکھ اور تکلیف میں لیتے ہیں کیونکہ جہنم ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ جنت اور جہنم کی حیات ایک حقیقت ہے، ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دُنیا کی زندگی آخرت کی نسبت کمزور ہے، محدود ہے، چندگنی چنی سانسیں ہیں، گنے چنے دن ہیں، گنے چنے سال ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ دُنیا اگرچہ عارضی ہے لیکن اس کا اثر آخرت تک پہنچتا ہے۔ آخرت اور دُنیا میں ازلی و ابدی رشتہ ہے۔ بندہ جو عقیدہ رکھتا ہے اور جو عمل دُنیا میں کرتا ہے اُسی پر آخرت تعمیر ہوتی ہے۔ اگر کوئی کفر کرتا ہے اور

گناہ کرتا ہے تو جہنم بھڑکتی ہے، اس جہنم کا عکس اس کی دُنیوی زندگی میں بھی آتا رہتا ہے۔ ہر لحہ پریشان رہنا، ہر لحہ گالیاں بکتے رہنا، ہر ایک سے ناراض رہنا، ہر کام میں شکوہ کرتے رہنا، یہ کیوں ہو گیا، وہ کیوں ہو گیا؟ یہ نقصان ہو گیا، وہ نفع ہو گیا، ہر وقت شکایت کرتے رہنا، ہر وقت روتے رہنا، ہر ایک سے ناراض رہنا۔ فرمایا، ان کا جینا بھی ان کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ ان کی زندگی بھی عذاب بن جاتی ہے۔ ان کی زندگی میں کوئی لحہ سکون، چین یا آرام کا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اپنے عقیدہ و عمل سے وہ اپنے لیے بھٹی بھڑکا رہے ہیں تو بھٹی بھڑکانے والے کو بھی اس کی تپش دارِ دُنیا میں پہنچتی ہے۔ وہ بھی محفوظ تو نہیں رہتا۔ اگر کوئی بندہ آگ ہی بھڑکا رہا ہے تو خود اس تک اس کی تپش، گرمی بھی اسے پہنچتی رہتی ہے فرمایا، لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا عذاب کی ایک کڑواہٹ ان کی زندگی میں بھی گھل مل جاتی ہے۔ عذاب کی تپش زندگی کو بھسم کر دیتی ہے۔ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ اور پھر جب مریں گے، آخرت میں جائیں گے تو آخرت میں بہت سخت عذاب ہو گا۔ اگر یہ سمجھنا چاہیں تو دیکھ لیں ان کی زندگی میں سکون نہیں، بچے آوارہ ہو جاتے ہیں، کوئی بات نہیں سنتا، سکون نصیب نہیں ہوتا، سکھ کا کوئی سانس نہیں آتا۔

تکلیفیں، دکھ، مصیبتیں، صحت، بیماری نیک لوگوں پر بھی آتی ہے، انبیاء و رُسل پر بھی آتی ہے۔ لیکن نیک بندے پر اگر دُنیا میں بھی تکلیف آئے تو دل دکھی نہیں ہوتا، دل مطمئن رہتا ہے۔ تو وہ تکلیف اللہ کے مقرب بندوں کے لیے ترقیٔ درجات کا سبب بن جاتی ہے۔ انہیں اور عظمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ عام مومن کے لیے، ہمارے جیسے لوگوں کے لیے تلافی کا سبب بن جاتی ہے۔ بدکاروں اور کفار پر جو تکلیف آتی ہے وہ از قسم عقوبات ہوتی ہے۔ ان کے دل بے چین ہوتے ہیں، ہر لحہ بے کل رہتے ہیں۔ سکھی اور مطمئن نہیں رہتے۔ ان کے دکھ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

ایمان کی شرط:

اور جن لوگوں نے اللہ پر یقین رکھا، اللہ پر ایمان لائے، اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لائے، ان سے جنت کا وعدہ ہے۔ یاد رہے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانیں تو اللہ کو ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تاریخ کے ایک مانے ہوئے، علم الکلام کے ماہر گزرے ہیں، صرف و نحو کے ماہر، دلائل سے قائل کرنے میں بڑا شہرہ رکھتے تھے۔ آخر عمر میں وقت کے شیخِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اللہ اللہ سیکھنے اور قلب کو ذاکر کرنے کی خواہش کی۔ شیخ نے سکھانے سے پہلے سمجھایا کہ آپ یہ نحوی بحثیں چھوڑ دیں اور اللہ اللہ پر یکسو ہو جائیں۔ کچھ وقت وہاں لگا کر واپس گھر تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد مرض الوفات میں مبتلا ہو گئے۔ شیخ کو پتا چلا، آپ خود ان کے پاس تشریف لے گئے۔ حال دریافت کیا۔ کہنے لگے، میں بہت مشکل میں ہوں، میرا وقت قریب ہے اور

شیطان مجھ سے اللہ کے واحد لاشریک ہونے پر دلیل مانگتا ہے۔ میں اسے ننانوے دلیلیں دے چکا ہوں اور وہ میری دلیلیں ردّ کر کے دلائل کے میدان میں مجھے مات دے دیتا ہے۔ شیخ نے فرمایا، آپ تمام دلائل چھوڑ دیں اور اسے صرف ایک ہی دلیل دیں کہ مجھے محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ اللہ ایک ہے۔ ایک ہی سادہ سا جملہ کہیں کہ مجھے یہ خبر اللہ کے رسول ﷺ نے دی ہے۔ اس پر شیطان لاجواب ہو گیا۔ یاد رہے! اللہ کو وہی مانتا ہے جو رسول ﷺ پر ایمان لاتا ہے۔ صرف حضور ﷺ بتاتے ہیں کہ اللہ کی ذات کیسی ہے؟ اس کی صفات کیسی ہیں؟ اپنے طور پر ماننے سے اللہ پر ایمان مکمل نہیں ہوتا کیونکہ اپنے طور پر بغیر نبیؑ کی راہنمائی کے کوئی انسان جان ہی نہیں سکتا کہ اللہ کی ذات کیسی ہے؟ اس کی صفات کیسی ہیں؟ انسان کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں سوائے وحیٔ الٰہی کے۔

وحیٔ الٰہی کی دو خصوصیات ہیں، ایک وحی سننا صرف اللہ کے نبیؑ کا کام ہے، کوئی دوسرا دُنیا میں گواہ نہیں ہوتا کہ یہ آیت اُتری تو میں بھی سن رہا تھا۔ ایسا اصدق الصادقین صرف اللہ کا رسولؐ ہوتا ہے۔ جتنی آیت نازل ہوتی ہے، اتنی ہی آگے تعلیم فرماتا ہے۔ دوسری بات وحیٔ الٰہی کی تشریح بھی نبی کا منصب ہے۔ ہم اپنی طرف سے، یا صرف ونحو کے زور پر، یا گرائمر کے صیغے بنا کر اور کھینچ تان کر جو ترجمے کرتے ہیں، وہ درست نہیں ہیں۔ وحی کا وہی مفہوم صحیح اور درست ہے جو حضور ﷺ نے سمجھایا اور صحابہ کرامؓ نے سمجھا، پھر اس پر صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کے سامنے عمل کیا اور حضور ﷺ نے تصدیق فرمائی کہ تم نے سمجھا بھی صحیح ہے اور عمل بھی ٹھیک کیا۔ قرآن کا صرف وہی مفہوم صحیح ہے۔

یاد رہے! وحی سننا صرف اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے۔ اللہ کے نبیؑ کو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وحی کا مفہوم سمجھانا بھی منصب نبوت ہے۔ ہر کوئی عربی دانی کے زور پر قرآن کا مفہوم خود بنائے گا تو وہ قرآن میں تحریف ہوگی۔ اسی لیے اتنے فرقے بن گئے ہیں۔ ہر فرقہ کہتا ہے میں قرآن پر عمل کر رہا ہوں۔ وہی آیتیں پڑھ کر اپنا من پسند مطلب نکال لیتا ہے۔ لیکن اگر سارے فرقے اس بات کو مان لیں کہ ہم وہ مفہوم مانیں گے جو حضور ﷺ نے بتایا تو فرقہ بندی ختم ہو جائے۔

جنت کا وعدہ:

وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اہلِ تقویٰ سے جنت کا وعدہ ہے۔ اہلِ تقویٰ وہ ہیں جن کا عقیدہ بھی درست ہے اور عمل میں بھی کوشاں ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کی جائے۔ ان کے لیے جو باغ بنائے گئے ہیں اس کی پہلی صفت یہ ہے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کہ جنت میں نہریں باغوں کے تابع کر دی گئیں ہیں۔ دُنیا میں

باغات نہروں کے تابع ہیں، چشموں کے تابع ہیں، دریاؤں کے تابع ہیں۔ جہاں پانی پہنچتا ہے وہاں باغ لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں پانی نہیں پہنچتا وہاں باغ نہیں اُگتا۔ فرمایا، جنت کے باغ ایسے ہیں کہ پانی ان کے تابع ہیں۔ جہاں جنّتی کا جی چاہے، وہاں اپنا باغ لگا لے۔ یہ پانی کی ذمہ داری ہے کہ وہاں پہنچے۔ یہ ایک ہی ایسی صفت ہے کہ قرآن کریم بار بار اس کا تذکرہ فرماتا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا اکثر ترجمہ یہ کردیا گیا ہے کہ "ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں" تو اس سے اصل مفہوم گڈمڈ ہوجاتا ہے۔ لکھنے والا اللہ اس کے علم میں برکت دے، اسے تو شاید سمجھ آتی ہوگی لیکن جو ترجمہ پڑھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں باغ اوپر رہ جاتا ہے، نہریں نیچے سے گزر رہی ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا مفہوم یہ ہے کہ نہر باغ کے تابع ہے۔ دُنیا میں باغات نہروں کے تابع ہیں۔ جنت کی نہریں باغات کے تابع ہیں۔ جہاں کوئی جنّتی باغ لگائے گا پانی وہاں پہنچے گا۔ پھر دُنیا میں پھلوں کے اپنے موسم ہیں۔ ایک موسم میں جو پھل آتا ہے پھر وہ دوبارہ اُسی موسم میں آئے گا اُكُلُهَا دَآئِمٌ جنت کے پھل دائمی ہیں۔ کسی موسم کے محتاج نہیں ہیں۔ کوئی پھل گلتا، سڑتا، خراب نہیں ہوتا۔ جب دیکھو، ان کے باغات پھلوں سے لدے پھندے کھڑے ہیں۔ جو جی چاہے توڑلو، جو چھوڑ دو گے وہ بھی تروتازہ ہی رہے گا۔ وَظِلُّهَا اور ان کا سایہ بھی ہمیشہ رہتا ہے۔ دُنیا کی طرح نہیں ہے کہ دن دوپہر اور سہ پہر کے ساتھ بدلتا رہے۔ وہاں تغیر نہیں، وہاں کا ایک ہی موسم، ایک ہی روشنی، ایک ہی دھوپ، ایک ہی وقت، ایک ہی بہار، ایک ہی فضا ہے۔ ہر چیز پر بہار ہے۔ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ (۳۵) اور جو انکار کرتے ہیں اور کفر کرتے ہیں، ان کا انجام تو آگ ہے۔ اب سننے والا تقابل کرکے دیکھ لے کہ وہ کہاں پہنچنا چاہتا ہے، دونوں راستے ہیں۔ ایک اللہ کی جنت کو جارہا ہے اور ایک جہنم کو جارہا ہے۔ جنت کو وہ راستہ جاتا ہے جس میں اتباعِ رسالت ہے، جس نے حضور ﷺ کا دامن تھام لیا، اپنی زندگی کو حضور ﷺ کے احکام کے تابع کرلیا وہ کامیاب ہوگیا۔ اس لیے کہ نتائج عمل پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک شخص سارا دن وظیفہ پڑھتا رہے میں نے پانی پی لیا، میں نے پانی پی لیا تو کہنے سے اس کی پیاس کم نہیں ہوگی اور زبان سے ایک بار بھی نہ کہے لیکن پانی پی لے تو پیاس بجھ جائے گی۔ نتائج عمل پر مرتب ہوتے ہیں، کہنے پر نہیں۔ کہتا رہے میں مسلمان ہوں، میں مسلمان ہوں، یہ اس کے کہنے کی بات ہے۔ جب اطاعت کرے گا، اتباع کرے گا تو اسے اسلام کی لذت نصیب ہوگی۔ اور جو انکار کرتا ہے وہ تو سیدھا دوزخ ہی جائے گا۔ بات ہی ختم ہوگئی۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ (۳۶) یہود و نصاریٰ تنقید بھی

کرتے تھے۔فرمایا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہے، آیات نازل ہوتی ہیں تو بعض آیات جب پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہیں تو پھر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ یہ تو ہمارے دین پر آ گیا ہے۔اور جب احکام میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو پھر ناراض ہوجاتے ہیں، الگ ہوجاتے ہیں کہ ہم تو نہیں مانتے۔تو ان سے فرمادیجیے کہ جتنے مذاہب دُنیا میں آسمانی ہیں، جتنی کتابیں آسمانی ہیں، جتنے دین انبیاءؑ نے تعلیم فرمائے، ان سب میں اصول ایک ہے۔توحید باری بنیادی اصول ہے۔ہر نبیؑ نے دعوت دی ''لا الہ الا اللہ'' یہ ہر نبیؑ کی نبوت کا بنیادی اصول رہا ہے۔ہر نبیؑ نے اپنی نبوت کی دعوت دی۔اس کے بعد معاد ایک اصول ہے۔آخرت ایک اصول ہے۔ہر نبیؑ نے آخرت کی خبر دی اور وہی خبر دی جو آدم علیہ السلام نے دی۔وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتا رہے ہیں۔اس سے زیادہ بتادیں، اس سے زیادہ وضاحت سے بتادیں، لیکن اصولاً وہی ہوتی ہیں کہ آخرت میں کیا ہوگا۔اسی طرح کفر اور ایمان میں جو حد فاصل ہے ہر نبیؑ نے وہی بتائی۔یہ ایسی بات نہیں ہے کہ قرآن نے اگر اگلی کتابوں کی اور توحید کی تصدیق کی ہے تو اسلام ان کے پیچھے چل پڑا ہے۔نہیں، یہ سب انبیاءؑ کی اصولی تعلیمات ہیں۔رہ گئے فروعی احکام یعنی لین دین کے طریقے، صلح و جنگ کے طریقے، کاروبار، شادی بیاہ، روزمرہ کے معمولات، یہ ہر نبیؑ کی شریعت میں اس قوم کی استعداد، اس کے علم، اس کی قوتِ کار کے مطابق اللہ نے مقرر فرمائے ہیں۔اب پہلی قوموں پر دو، دو نمازیں فرض تھیں۔ہم پر، اس امت مرحومہ پر اللہ نے پانچ فرض کردیں۔پہلی تمام امتوں پر رمضان کے روزے فرض رہے۔ہر امت میں روزہ مغرب کو افطار کرتے، جب تک جاگتے رہتے کھانے پینے کی آزادی تھی، جب کوئی سو جاتا، روزہ بند ہوجاتا پھر اگلی مغرب کو افطار کرتا۔ابتداً مسلمانوں نے بھی روزے ایسے ہی رکھے۔پھر اللہ کریم نے آسانی فرمادی اور حکم دے دیا کہ مغرب کو افطار کرو اور سو ؤ یا جاگو، طلوعِ فجر تک کھا پی سکتے ہو۔تو آگے جو تشریحات یا جنہیں فروعات کہتے ہیں، وہ ہر قوم کی استعدادِ کار، ہر قوم کے مزاج، ہر قوم کے حالات اور وقت کے تقاضے کے مطابق اللہ نے مقرر فرمائے۔اور ہر قوم کے لیے وہی مفید ہے، جس کے کرنے کا اسے حکم دیا گیا۔لہٰذا اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

فرمادیجئے کہ جب اصول ایک ہے تو تم بھی شرک کرنا چھوڑ دو۔توحید پر قائم ہوجاؤ۔تم نے (یعنی) یہودیوں نے اللہ کے نبی عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنالیا ہے۔عیسائیوں نے اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مان لیا ہے حالانکہ دونوں اللہ کے نبیؑ تھے۔بھلا! تم نے اس کی دلیل کہاں سے لی، کون سی پہلی کتاب سے لی؟ کہیں عقلی و نقلی کوئی دلیل دُنیا میں موجود ہے کہ اللہ کا بیٹا ہے۔تو ان چیزوں پر تم کیوں جاتے ہو؟ آؤ! اللہ کی توحید کو مانو، اپنے نبیؑ کی رسالت کو مانو، احکامِ شریعت اور آخرت کو مانو۔ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ انہیں فرمادیجیے کہ مجھے تو حکم ہوا ہے کہ خالص اور

صرف اللہ ہی کی عبادت کروں۔ اللہ کے سوا کسی کے لیے عبادت میں کوئی حصہ نہیں ہے لَآ اُشْرِكَ بِهٖ اور اس کی ذات اور اس کی صفات میں رائی برابر کسی کو شریک نہ کروں۔ نہ اپنی زبان سے، نہ اپنے قول سے، نہ عمل سے، نہ کردار سے۔ اِلَيْهِ اَدْعُوْا اور میرا منصب نبوت ہے کہ میں اللہ کی مخلوق کو اسی کی طرف بلاؤں۔ میں نے آج تک کسی سے نہیں کہا کہ مجھے سجدہ کرو۔ کسی آنے والے کو میں نے نہیں کہا کہ اللہ سے میں بات کرتا ہوں، تم مجھ سے بات کرو، نہیں۔ میں نے ہر آنے والے کو اللہ کی بارگاہ میں کھڑا کر دیا ہے۔ وہ اللہ اکبر کہہ کر اپنے دل کی بات اپنے اللہ سے کرتا ہے۔ اِلَيْهِ اَدْعُوْا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ وَاِلَيْهِ مَاٰبِ(۳۶) اور سب نے لوٹ کر بھی اسی کے پاس جانا ہے۔ اسی نے حساب لینا ہے۔ اُسی نے رحمت کرنی ہے۔ اُسی نے رحم فرمانا ہے، اُسی نے گرفت کرنی ہے۔ وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے حساب لے۔ مخلوق اس کی اپنی ہے، مخلوق کا کردار اس کے سامنے ہے۔ میرے ذِمّہ فرائض نبوت کی ادائیگی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ہم نے یہ قولِ فیصل، یہ حکم، یہ قرآنِ حکیم عربی میں نازل فرما دیا۔ قرآنِ حکیم کیا ہے؟ اللہ کی بارگاہ کا نازل شدہ حکم ہے۔ جو لوگ زندگی بھر قرآن سے دور رہتے ہیں۔ اپنے کردار کو قرآن سے مَس نہیں ہونے دیتے، انہیں تو تب پتا چلے گا جب وہ آخرت میں اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے کہ قرآن قولِ فیصل تھا۔ دُنیا میں تو یہ جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں تو صرف حقائق سامنے آئیں گے۔ آج تو زندگی بھر قرآن کے خلاف گزارنے والے مر کر شہید کہلواتے ہیں، لیکن میدانِ حشر میں پتا چلے گا کہ شہید کون ہے؟

شہید کون؟

شہید کا معنی ہے گواہ۔ ہر وہ بندہ اپنی حیثیت کے مطابق شہادت کا درجہ پاتا ہے جس کی زندگی اللہ کی عظمت پر گواہ ہے۔ جس کا کردار اللہ کی عظمت اور نبی ﷺ کی صداقت کا گواہ ہے۔ اگر وہ اسی پر مرتا ہے تو وہ گواہ ہے، شہید ہے۔ البتہ شہادت کے اپنے اپنے درجے ہیں۔ جو آج شہید ہوتا ہے وہ اور ہے، جو پہلے گزرا، وہ اور ہے۔ جو حضور ﷺ کے قدموں میں شہید ہوا، اس کی اپنی عظمت ہے، بدر اور اُحد والوں کی اپنی عظمت ہے۔ لیکن ہر اس مومن کو شہادت نصیب ہوتی ہے جس کا کردار اس کی گواہی دے کہ وہ اللہ کا بندہ اور حضور ﷺ کا غلام ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہی سہی، لیکن جان تو اللہ کی اطاعت میں دے۔

فرمایا، میرا منصب یہ ہے کہ میں اللہ کی مخلوق کو اللہ کی طرف دعوت دوں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، قرآنِ حکیم طے شدہ ہے، حتمی ہے، یہ اللہ کا آخری فیصلہ ہے۔ اس کا کوئی حکم تبدیل نہیں ہوگا۔ یہ اتنا مکمل ہے کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ فرد کی ذاتی زندگی، گھریلو، خاندانی زندگی سے لے کر قومی اور بین الاقوامی سطح تک، ہر چھوٹی بڑی بات میں بہترین راہنمائی کرتی ہے۔ فرمایا، ہم نے یہ فیصلہ نازل کر دیا۔ اب کوئی اس حکم سے سرتابی کر کے یہ نہ سمجھے کہ کوئی اور فیصلہ آجائے گا، فیصلہ آ چکا۔ یہی دُنیا میں بھی نافذ ہوگا، یہی آخرت میں بھی لاگو ہوگا۔ جو اپنی آخرت تلاش کرنا چاہے قرآن سے سمجھے، اپنا کردار دیکھے، قرآن کیا کرنے کو کہتا ہے، وہ بھی دیکھے۔ اس کے سامنے ہر چیز آئینے کی طرح واضح ہوگی۔

قرآنِ حکیم عربی زبان میں ہے۔ اسی لیے عربی زبان کو تمام زبانوں پر فضیلت ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی زبان ہے، اللہ کے رسول ﷺ کی زبان ہے، اللہ کی کتاب کی زبان ہے، اہل جنت کی زبان ہے۔ باقی دُنیا میں جتنی بھی زبانیں رائج ہیں، نہ کوئی مبارک ہے، نہ کوئی منحوس ہے۔ اپنے مافی الضمیر کی ترجمانی کا ایک ذریعہ ہے۔ جتنی زیادہ زبانیں کوئی سیکھ لے اتنی زیادہ زبانوں میں بات کر سکتا ہے، لوگوں کو تبلیغ کر سکتا ہے۔ بہت سی زبانیں جاننا ایک خوبی ہے اگر اللہ عطا کرے۔ لیکن جہاں تک عظمت، برکت، ثواب کا تعلق ہے وہ صرف عربی میں ہے۔ باقی سب زبانیں ایک سطح پر ہیں۔

مقامِ فکر:

اس رکوع کی آخری بات بھی سن لیجیے اور پوری توجہ سے سنیے۔ احکاماتِ قرآن کی اہمیت کیا ہے، اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو کیا ہوگا؟ یا گزارہ کر لیا جائے کہ کوئی بات مان لی جائے، کوئی بات نہ مانیں تو کیا ہوگا؟ فرمایا، وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اے میرے حبیب! (ﷺ) آپ کی ذات کائنات میں افضل ترین ذات ہے۔ مخلوق میں بزرگ تر آپ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ انبیاء کے امام ہیں۔ امام الانبیاء ہیں، خاتم الانبیاء ہیں، آپ ﷺ پر نبوت مکمل ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ کی بعثت سے نبوت مکمل ہوگئی۔ آپ ﷺ کا پیغام قیامت تک چلتا رہے گا۔ ختم نہیں ہوگا۔ نئے نبی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اگر اللہ نہ کرے ایسا ہو کہ آپ بھی لوگوں کی باتوں میں آکر اس حکم پر عمل نہ کریں، اس حکم کی اہمیت یہ ہے کہ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (۳۷) پھر آپ کو بھی اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔

کیا اس کے بعد کسی فرد کے لیے کوئی گنجائش ہے کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کرے اور بچ جائے؟
وہ ذاتِ اقدس ﷺ جو انبیاء کی بھی سردار ہے۔ ہماری روحیں عالم بالا میں جانے کی استعداد نہیں رکھتیں۔
آپ ﷺ کا وجودِ عالی دونوں جہانوں کی سیر کر کے آ گیا۔ ہماری ارواح میں وہ لطافت، وہ پاکیزگی، وہ
طہارت نہیں ہے جو آپ ﷺ کے وجودِ عالی میں ہے۔ آپ ﷺ تمام نبیوں، رسولوں کے سردار ہیں۔

جیسے کہا جاتا ہے کہ ملک کے آئین و دستور پر عمل ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ اور اگر بادشاہ و حکمران بھی
اس پر عمل نہ کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بادشاہ نے اس پر عمل نہیں کرنا۔ مطلب
یہ ہوتا ہے کہ کسی کو بھی اس سے استثنا نہیں، کوئی بھی نہیں بچے گا۔ جو بھی یہ جرم کرے گا اسے یہ سزا ملے گی۔ اللہ نے بھی یہ
فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ نہ کرے اگر میرے حبیب ﷺ بھی جن کی ہر سانس بھی قرآن کی اطاعت ہے، جن کا اٹھنا
بیٹھنا، سونا، جاگنا سب دین ہے، بولنا دین ہے، خاموش رہنا دین ہے۔ اگر وہ بھی خدانخواستہ اس قرآن پر عمل نہ
کرے تو پھر میرے عذاب سے چھڑانے والا کوئی نہیں۔

فرمایا، مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (۳۷) اب ہم ذرا اللہ کے اس فیصلے کو دیکھیں! قرآنِ حکیم
میں جا بجا ملتا ہے کہ اللہ نے قرآن کو ذکر کہا ہے، کہیں قرآن کو کتاب کہا گیا ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ
فِيْهِ (البقرۃ:2) لیکن یہ انوکھا انداز ہے، جب قرآن کو فیصلہ کہہ دیا گیا، یہ انداز نرالا ہے۔ فرمایا، اسے معمولی
بات نہ سمجھو كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا عربی زبان میں ہم نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا ہے۔ ہدایت اسی کو ملے گی
جو اس کے تابع ہوگا، اللہ کو اسی نے مانا جس نے ایسا مانا جیسا قرآن منواتا ہے۔ نبی ﷺ کو اسی نے مانا جس
نے ایسا مانا جیسا قرآن منواتا ہے۔ نیکی صرف وہ ہے جسے قرآن نیکی قبول کرتا ہے۔ ہر وہ کام جرم ہے جسے قرآن
جرم کہتا ہے۔ اور یہ قرآنِ حکیم ہے، فیصلہ ہے، اللہ کی بارگاہ کا۔ آج تمہارے ہاتھ میں ہے، کل بارگاہِ الٰہی میں
ہوگا اور تم پر اسی حکیم کے فیصلے جاری کیے جائیں گے۔ اب اپنی زندگی دیکھ لو! کتنا کردار قرآن کے اندر ہے اور
کتنا قرآن سے باہر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ:208) اسلام میں سارے کے
سارے آ جاؤ۔ اگر اسلام ایک محفوظ قلعہ ہے تو تم ایک ٹانگ باہر رکھ کر باقی اسلام کے اندر رکھ لو، تو باہر والی ٹانگ
تو دشمن کاٹ کر لے جائے گا۔ تم ایک بازو باہر کر دیتے ہو باقی وجود قلعے میں ہے تو اس باہر والے کو تو کوئی نہیں
بچائے گا، یہ تو کٹ جائے گا۔ سارے کے سارے اندر آ جاؤ۔ یہاں یہ تعیین بھی کر دی کہ قرآن عربی زبان میں

ہے۔اگر کوئی اردو یا انگریزی ترجمہ پڑھتا ہے تو وہ ترجمہ پڑھ رہا ہے۔قرآن وہی ہے جس کی تلاوت ہوگی۔ عربی کے علاوہ کسی زبان میں اس کا ترجمہ کرے وہ قرآن نہیں کہلائے گا بلکہ قرآن کا ترجمہ کہلائے گا۔اور وہ تلاوت نہیں ہوگی، وہ ترجمہ پڑھنا ہوگا۔اگر کوئی تلاوت کرنا چاہتا ہے تو اسے عربی ہی میں کرنی ہوگی۔اور فرمایا، کوئی بڑے سے بڑی ہستی بھی اس کا دامن چھوڑ دے تو پھر میرے عذاب سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

میں آپ کا محاسبہ کرتا رہوں، اور آپ مجھ پر نکتہ چینی کرتے رہیں تو یہ حق ادا نہیں ہوگا۔میرے نیک و بد عمل سے میرا ربّ زیادہ واقف ہے۔بھلا برا، وہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ہر ایک دوسرے پر فتویٰ لگانے، نکتہ چینی کرنے کی بجائے، اپنے اپنے کردار کو اگر قرآن کے ترازو میں جانچے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ہر بندے کو اپنا جواب دینا ہے۔ لہٰذا اپنے کردار کو قرآن کے ترازو میں تولا جائے۔

سورۃ الرعد رکوع 6 آیات 38 تا 43

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

اور یقیناً ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی دی اور کسی پیغمبر کے اختیار میں یہ بات نہ تھی کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی آیت (نشانی) لائے۔ ہر زمانے کے مناسب (خاص خاص) احکام ہوتے ہیں ﴿۳۸﴾ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہے) باقی رکھتا ہے اُسی کے پاس اصل کتاب ہے ﴿۳۹﴾ اور جس بات (عذاب) کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اگر اس میں سے بعض آپ کو دکھائیں یا آپ کی مدتِ حیات پوری فرما دیں تو بے شک آپ کا کام احکام کا پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے ﴿۴۰﴾ کیا وہ نہیں

دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کی (چاروں) اطراف سے کم کرتے چلے آتے ہیں اور اللہ (جو چاہتے ہیں) حکم فرماتے ہیں کوئی ان کے حکم کو ہٹا نہیں سکتا اور وہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں ﴿۴۱﴾ اور یقیناً ان سے پہلے (کافر) لوگوں نے تدبیریں کیں سو سب تدبیر تو اللہ ہی کی ہے۔ ہر شخص جو کچھ کر رہا ہے وہ (اللہ) اسے جانتے ہیں اور کافروں کو بھی جلد معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے ﴿۴۲﴾ اور یہ کافر لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ (معاذ اللہ) پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجیے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور وہ شخص جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا علم ہے، گواہ کافی ہیں ﴿۴۳﴾

تفسیر ومعارف

انبیاء عام انسانوں جیسی زندگی گزارتے ہیں:

فرمایا، وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً آپ ﷺ کے بارے میں کفار و مشرکین کہتے ہیں کہ یہ کیسے رسول ہیں کہ ان کی ازواجِ مطہرات ہیں، یہ ہماری طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے ہیں، ہمارے جیسی انسانی زندگی گزارتے ہیں تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کفار و مشرکین سے پوچھئے کہ کیا اُن سے پہلے جو بہت سے انبیاء و رُسل علیہم السلام آئے تھے کیا اُن کی زندگی عام انسانی زندگی نہیں تھی، کیا ان کے بیوی بچے نہیں تھے اور کیا وہ کھاتے پیتے، چلتے پھرتے نہیں تھے؟ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ کیونکہ انبیاء و رُسل علیہم السلام انسانوں میں سے ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر رسولؐ کی زندگی بالکل ایک عام انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کوئی خاص طبقہ نبیؐ کے اتباع کا مکلف نہیں ہوتا، بلکہ ساری اُمت مکلف ہوتی ہے۔ اور نبیؐ پاک کی زندگی ایسی ہوتی ہے کہ ہر عام شخص غریب، امیر، چھوٹا، بڑا، پڑھا لکھا، اَن پڑھ، ہر بندہ اُس پر عمل کر سکتا ہے۔ چونکہ پوری اُمت ان کے اتباع کی مکلف ہوتی ہے اس لیے ہر آدمی کے لیے اس طرح عمل کرنا آسان ہوتا ہے۔

یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو معجزہ ہم کہتے ہیں وہ دکھا دیں تو انہیں بتائیے کہ اس معاملے میں اللہ کا کوئی نبیؐ بھی اپنی مرضی سے معجزے نہیں دکھاتا بلکہ اللہ کریم جب چاہتے ہیں، جو معجزہ چاہتے ہیں، وہ اللہ کے نبیؐ کے ہاتھ پر ظاہر

ہوتا ہے۔ یہ اللہ کریم کا کام ہے کہ کس وقت کونسا معجزہ دکھایا جائے اور وہ بہتر جانتے ہیں۔

ہر کام اپنے وقت کا رہین منت ہے:

لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ(۳۸) ہر کام کا ایک خاص وقت ہے۔ ہر چیز اللہ کریم کی طرف سے طے شدہ ہے اور ہر بات اپنے موقع پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اللہ جب چاہے یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثۡبِتُ کسی حکم کو ختم کر دیتا ہے، کسی حکم کو باقی رکھتا ہے۔ یہ اللہ کریم کے فیصلے ہیں اور یہ بھی ازل سے طے ہو چکے ہیں۔ اللہ کریم لوگوں کے حالات دیکھ کر نہیں جانتا بلکہ مخلوق کی پیدائش سے پہلے جانتا ہے کہ کون کیا کرے گا، کس میں کتنی استعداد ہوگی، کس کی سوچ کیا ہوگی، کس کے علم کا معیار کیا ہوگا اور کس کا کردار کیا ہوگا؟ لہٰذا اس نے اپنے علم سے سب کچھ طے کر دیا ہے۔ ہر چیز کا، ہر کام کا ایک وقت معین ہے۔ وہ اپنے وقت پر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات، اولیاء اللہ کی کرامات، یہ طے شدہ امور ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایک بندے کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کے لیے اللہ کا نبیؑ، اللہ کا ولی دُعا کر دیتا ہے، اس کی تکلیف ٹل جاتی ہے۔ تو یہ کام بھی اچانک نہیں ہوتا۔ یہ بھی اللہ کے اس ازلی فیصلے میں مقرر ہے کہ فلاں شخص کے حق میں فلاں وقت، فلاں دُعا قبول ہوگی۔ دُعا کرنے والے کو بھی وہ خود توفیق عطا فرماتا ہے، وہ خود اس کی دُعا قبول فرماتا ہے۔ کوئی تبدیلی کسی حال میں ایسی نہیں ہوتی کہ وہ پہلے سے اللہ کے علم میں نہیں تھی، اور اچانک ہوگئی۔ یہ اللہ کی طرف سے طے شدہ فیصلے ہیں۔ اسی لیے فرماتے ہیں کہ دُعا بھی تقدیر ہے، یعنی تقدیر میں یہ فیصلہ بھی ہو چکا کہ کس کے حق میں کس کی دُعا اور کون سی دُعا قبول ہوگی۔ تو کوئی ایسا کام نہیں ہوتا جو پہلے سے علمِ الٰہی میں نہ ہو۔ اللہ کا علم قدیم ہے اور وہ جانتا ہے وَعِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ(۳۹) اور اصل کتاب لوحِ محفوظ اللہ کے پاس ہے، جس میں ہر شئے درج ہے۔ لیکن اللہ کا علم تو بہت وسیع ہے، اللہ کے علم کی کوئی حد نہیں۔ یہ ساری باتیں جو ظہور پذیر ہوتی ہیں، یہ تو لوحِ محفوظ میں بھی لکھی ہوئی ہیں، یہ تو ایک کتاب میں بھی محفوظ ہیں۔ لیکن اللہ کا علم وسیع تر ہے۔

حساب لینا صرف اللہ کا کام ہے:

وَاِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ ہوسکتا ہے ان پر اللہ کی جو گرفت آئے، اس کے بعض مناظر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ظاہر کر دیں اور آپ ﷺ کی حیات مبارک میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے واقع ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دیکھ لیں اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چشم عالم سے پردہ فرمائیں اور ان کے کرتوتوں کے نتائج بعد میں انہیں بھگتنے پڑیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ نبیؐ کی زندگی میں سب کچھ ہو جائے۔ نبیؐ کا منصب جلیلہ احکام کا پہنچا دینا ہے وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ(۴۰) یہ حساب لینا ہمارا کام ہے، یہ اللہ کریم کا

کام ہے کہ وہ بندوں کے کردار کا محاسبہ فرماتا ہے۔ یہ انبیاءؑ کا کام نہیں۔ انبیاءؑ کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ آپ ﷺ نے حق ادا کر دیا نبیؐ کا منصبی فرض ادا ہو گیا۔ اس کے بعد لوگوں کا ردِ عمل کیا ہے؟ اس بات کو قبول کرتے ہیں یا سرے سے انکار کر دیتے ہیں، کچھ حصہ مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے۔ ساری بات تسلیم کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں، یا زبانی مانتے ہیں عملاً نہیں مانتے۔ ان ساری باتوں کا حساب لینا یہ اللہ کریم کی شان ہے۔ فرمایا مخلوق کا محاسبہ میں خود کروں گا۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کیا یہ کفار دیکھتے نہیں کہ روئے زمین پر کوئی ایک ایسا فرد اس زمانے میں نہیں تھا جو اللہ جل شانہٗ کے نام، اس کی ذات، یا اس کی صفات سے آگاہ تھا۔ اللہ کا نام لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے، لوگوں کے علوم سے محو ہو چکا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو گزرے صدیاں بیت چکی تھیں۔ دین عیسوی مسخ ہو چکا تھا۔ توحید باری گڈمڈ ہو چکی تھی۔ کوئی اللہ سے آشنا نہیں تھا۔ جب آپ ﷺ نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دعوت دی تو روئے زمین کی ساری انسانیت کفر و شرک میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اب ساری انسانیت کے مقابلے میں اللہ کا ایک بندہ کھڑا ہو کر بات کرے تو دنیوی اعتبار سے اس کی کیا حیثیت بنتی ہے؟ ساری دُنیا کا کفر و شرک آپ ﷺ کے خلاف کھڑا ہو گیا۔ لیکن کیا یہ کافر دیکھتے نہیں کہ دن بدن آپ ﷺ کی دعوت پھیل رہی ہے اور کفار کے گرد زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بوڑھا آسمان جانتا ہے، یہ زمین جانتی ہے کہ روئے زمین پر کوئی اللہ کا نام لیوا نہیں تھا جب آپ ﷺ نے دعوتِ حق دینا شروع کی۔ اب ایک ہستی سے شروع ہونے والی دعوت چند برسوں میں پھیل رہی ہے اور یہ دیکھ رہے ہیں اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کہ ان کے گرد زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے اور اللہ کا نام اور اللہ کو ماننے والے پھیلتے جا رہے ہیں۔ تو کیا یہ آپ ﷺ کے برحق نبی ہونے اور شریعتِ مطہرہ کے سچ ہونے کی دلیل نہیں ہے! وَاللّٰهُ يَحْكُمُ اللہ جو چاہتے ہیں وہ حکم فرماتے ہیں اور جو وہ فرماتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑا معجزہ تو یہ ہے کہ اللہ کے ایک بندے نے ایک دعوت دی، روئے زمین کا کوئی دوسرا بندہ ساتھ نہیں تھا۔ جب آپ ﷺ نے دعوت دی تو آپ ﷺ اکیلے تھے، روئے زمین کی ساری آبادی کے مقابلے میں ایک ہستی کی بات کی کیا حیثیت! کیا یہ معجزہ نہیں ہے کہ وہ بات پھیلتی جا رہی ہے، لوگ نُورِ ایمان سے سینے منور کرتے جا رہے ہیں اور کافروں پر زمین تنگ ہو جا رہی ہے، سرکتی جا رہی ہے۔ کیا یہ بہت بڑا معجزہ نہیں ہے اور کیا یہ اس بات کو نہیں دیکھتے کہ سچ میں، حق میں کتنی قوت ہے کہ وہ اندھیروں کا جگر پھاڑ کر اپنی روشنی پھیلاتا جا رہا ہے۔ اللہ کریم جو چاہتے ہیں وہ حکم فرماتے ہیں اور کوئی حکم کو روک نہیں سکتا۔ جو فیصلہ اللہ کر دیتے ہیں اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اور وہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ

سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ(۴۱) آسمانوں پر ایک دن گزرتا ہے تو زمین پر ایک ہزار سال گزر جاتا ہے۔ اللہ کے نزدیک ایک دن ہزار سال کا ہے، مراد یہ ہے کہ آسمان پر ایک دن گزرتا ہے تو زمین پر ایک ہزار سال گزر چکا ہوتا ہے۔ انسان کی کتنی عمر ہے ساٹھ سال، ستر سال، اسی سال، سوسال، کتنی زندگی ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ عنداللہ جو دن ہے اس کے تو چند پل ہی جی سکتا ہے، ہزار سال کے مقابلے میں۔ اگر صبح کو پیدا ہوا تو چاشت کے وقت سے پہلے پہلے عمر تمام ہوگئی۔ تو یہ کیوں گھبرا رہے ہیں کہ نتیجہ کیوں نہیں نکلتا۔ فرمایا، کوئی دیر نہیں، اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں، بہت جلد تم اس مقام پر پہنچنے والے ہو جہاں حساب شروع ہو جائے گا، جہاں اجر شروع ہو جائے گا، جہاں عمل کا وقت گزر جائے گا کہ دُنیوی زندگی تھوڑی سی ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم نے آسمانوں پر اٹھالیا۔ زمین کے رات دن، اوقات اپنے ہیں، موسم اپنے ہیں، غذا منفرد ہے، پورا نظام الگ ہے۔ اس حساب سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر گئے دو ہزار سال گزر چکے ہیں، زمین پر دو ہزار سال بیت گئے، آسمان پر دو دن گزرے۔ دو دن میں آدمی کی عمر میں کیا فرق پڑتا ہے؟ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ جب آپؑ زمین پر نازل ہوں گے تو ویسے ہی جوان ہوں گے جیسے گئے تھے۔ آسمانوں پر دو دن رہ لیا، ہفتہ اور رہ لیں گے۔ تو ہفتے، دو دن، دس دن سے عمر میں کیا فرق پڑتا ہے؟ کیونکہ وہاں تو وہاں کے احکام ہیں، اگر آسمان پر تشریف لے گئے تو اوقات آسمان کے ہو گئے، موسم آسمان کے ہو گئے، غذا آسمان کی ہو گئی۔

معترض کو بھی عجیب عجیب اعتراض ہوتے ہیں، قادیانیوں نے ایک دفعہ ایک فضول سا اعتراض کیا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اگر آسمان پر ہیں تو وہ رفع حاجت کہاں کرتے ہیں؟ ارے جاہلو! آسمان پر تو زمین سے زیادہ مخلوق بستی ہے اگر انہیں ضرورت پیش نہیں آتی تو عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر چلے گئے تو ان پر بھی وہیں کے قانون لاگو ہوں گے۔ زمین سے خوراک ساتھ نہیں جائے گی، غذا بھی وہیں کی ہوگی، موسم بھی وہیں کے ہوں گے، احکام بھی وہیں کے ہوں گے۔ جب تک آسمان پہ رہیں گے، زندگی بھی آسمانی مخلوق کی طرح ہو جائے گی۔

اسی لیے ارشاد ہے کہ جب آپؑ دُنیا پر واپس تشریف لائیں گے تو جوان ہوں گے، شادی کریں گے، وصال ہوگا اور روضہء اطہر میں دفن ہوں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ، قبروں سے اس طرح اٹھیں گے کہ ایک طرف میں ہوں گا، دوسری طرف عیسیٰ علیہ السلام۔ اب وصالِ نبوی کے بعد ہزاروں انقلابات آئے، بھلے بُرے، ہر طرح کے مسلمان حکمران بھی آئے، ایسے لوگوں کے پاس بھی اقتدار آیا جنہوں نے مسجد نبوی میں اذانیں اور نمازیں تک بند کر دیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان برحق ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، یُدْفَنُ عیسیٰ

مَعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَصَاحِبِیہٖ فیکُوْنَ قَبْرُہٗ الرَّابِعُ (طبرانی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دونوں خلفاء راشدینؓ کے بعد چوتھی قبر عیسیٰ علیہ السلام کی ہوگی۔ تب سے اب تک اس جگہ کو کوئی پُر نہیں کر سکتا، وہ ویسے ہی محفوظ ہے۔ تین ہستیاں وہاں جلوہ افروز ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ چوتھی قبر کی جگہ ابھی محفوظ ہے اور اللہ کریم عیسیٰ علیہ السلام تک محفوظ رکھیں گے، وہ وہاں دفن ہوں گے۔ تو فرمایا، اللہ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور کوئی ان کے حکم کو روک نہیں سکتا۔ وَھُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۴۱) بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔ کفار کہتے ہیں کہ اگر ہم نہیں مانتے تو پھر ہمارا کیا بگڑا؟ فرمایا، گھبراؤ نہیں! بہت جلد وقت آ رہا ہے، تمہارے پاس تو صبح سے لے کر چاشت تک کا وقت ہے، دوپہر تک بھی نہیں، پانچ سو سال بھی کسی کی عمر نہیں ہے، دو سو سال بھی کسی کی نہیں ہے۔ اگر کوئی سو سال کو پہنچتا ہے تو پیر فرتوت بن جاتا ہے، وہ زندہ ہو کر بھی مردے کی طرح ہو جاتا ہے۔ تو فرمایا، تمہارے پاس تھوڑا سا وقت ہے۔ فرمایا، آخرت کا دن تو پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ آسمان کا دن ایک ہزار سال کا ہے۔ اس قیامت کے دن کے مقابلے میں اپنی زندگی کا حساب لگائیے اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ قیامت کا دن دُنیا کے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، یا آسمانوں کے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس ایک ہزار سال والے دن کے پچاس ہزار سال ہوں۔ اور دُنیوی زندگی کی کتنی سی مُہلت ہے، جس میں انسان کتنی برائی کرے گا، کتنا جھوٹ بول لے گا، کتنی دولت لوٹ لے گا، کیا کرے گا؟ چند لمحے بعد تو اُسے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونا ہے، تمہارا حساب بہت جلد ہونے والا ہے۔

اللہ کی تدبیر ہی غالب رہتی ہے:

وَقَدْ مَکَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ان سے پہلی اقوام میں بھی جنہوں نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی بڑی تدبیریں کیں، بڑے مکر کیے، بڑے حیلے کیے کہ تعلیماتِ نبوت کو روک دیا جائے، مٹا دیا جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پہلے انبیاءؑ کے ساتھ ایسا بھی ہوتا رہا ہے۔ فَلِلّٰہِ الْمَکْرُ جَمِیْعًا لیکن تدبیریں تو ساری اللہ کے پاس ہیں، انسان کیا کر سکتا ہے، سوچ ہی سکتا ہے، عملی دُنیا میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا جب تک اللہ نہ چاہے اور وہ حق کو غالب رکھنا چاہتا ہے۔ بعثتِ عالی کو اب ساڑھے چودہ سو سال ہونے والے ہیں۔ 1434 ہجری جا رہا ہے، ہجرت مبارک کو 14 سو 34 سال ہو گئے، تو تیرہ سال قبل ہجرت کی مکی زندگی اس میں شامل کرو تو ساڑھے چودہ ہو جاتے ہیں، ساڑھے چودہ سو سال میں یہودیوں نے، مشرکین نے، کفار نے، عیسائیت کی دُنیا نے کون سا حیلہ نہیں کیا کہ قرآن کریم کی تعلیمات کو گڈمڈ کر دیا جائے۔ لیکن ناکام رہے، وہی قرآن کریم ہے، کوئی ایک زیر زبر، ایک نقطہ تک تبدیل نہیں کر

سکے۔ پھرانہوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو عملی زندگی سے بیزار کردیا جائے اور اپنی تہذیب ان پر مسلّط کردی جائے، بے شمار مسلمان اس کے اسیر بھی ہو گئے۔ انہوں نے بہت زور لگایا لیکن کیا دین دار مٹ گئے؟ دین پھر بھی باقی ہے اور دِین دار بھی باقی ہیں۔ پوری دُنیا پر کافر طاقتیں مسلّط ہیں، چھائی ہوئی ہیں، ان کے پاس وسائل وذرائع ہیں، انہوں نے بہترین اعلیٰ دماغ اور ذہین لوگ اکٹھے کر کے Think Tank بنا رکھے ہیں۔ یہ ساری محنت ایک اسلام کو مٹانے پر ہوتی رہی ہے، لیکن کیا وہ مٹا سکے؟ چوبیس گھنٹوں کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں روئے زمین پر کہیں نہ کہیں اذان بلند نہ ہو۔ آپ Globe کے مطابق سورج کی روش کو دیکھیں تو کسی جگہ فجر ہو رہی ہے، کسی جگہ ظہر ہو رہی ہے، آگے کسی جگہ عصر ہو رہی ہے، آگے کسی جگہ مغرب ہو رہی ہے اور آگے کسی جگہ عشاء ہو رہی ہے۔ ہر لمحے فضا میں کروڑوں صدائیں بلند ہو رہی ہیں اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا الله ۔ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ الله۔ اسے یہ مٹا نہیں سکے، اس لیے کہ کفار تدبیریں تو کرتے ہیں۔ لیکن صرف سوچنے سے تو بات نہیں ہوتی، بات تو ہوتی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اور عمل کرنے کی طاقت اللہ کے قبضہء قدرت میں ہے۔ تدبیریں بھی اللہ کی ہیں، اسی کی محتاج ہیں، اسی کی مخلوق ہیں، ان کا بھی وہی مالک ہے يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اور اللہ کریم جانتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے؟ ہر ہر فرد، ہر ہر ذات کے بارے میں ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے، اس کا ایمان کیا ہے، عقیدہ کیا ہے اور کردار کیا ہے، وہ سوچتا کیا ہے اور کر کیا رہا ہے؟ اس سے اللہ کریم خود ہر لمحہ واقف ہیں۔ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ (۴۲)

موت حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے:

اور بہت جلد کافروں کو یہ پتا چل جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے؟ یہ تو تھوڑی سی مدت ہے جو انہیں مہلت دی گئی، یہ چند لمحے فرصت کے گزار لیں پھر انہیں میرے پاس ہی آنا ہے۔ اور جب موت آتی ہے تو ظاہر کی آنکھیں تو بند ہو جاتی ہیں لیکن حقیقی آنکھ کھل جاتی ہے باطن کی آنکھ کھل جاتی ہے قریب المرگ بندے کو بھی فرشتے نظر آنے لگ جاتے ہیں برزخ منکشف ہو جاتا ہے اس لیے جب آنکھ کھلے گی تو پتا چلے گا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے، فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق:22) تمہاری نگاہوں سے پردے ہٹا دیے گئے اور آج تمہاری نگاہ فولادی ہو گئی ہے، مضبوط ہو گئی ہے، اب تم دیکھ سکتے ہو جو چیزیں پس منظر تھیں کہ جنت کیا ہے، دوزخ کیا ہے، عذاب کیا ہے، ثواب کیا ہے، فرشتے کیسی مخلوق ہیں؟ سب تمہارے سامنے آ جائے گا تو جب یہ سب کچھ کھل جائے گا تو کافروں کو بھی پتا چل جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے؟

کفر کی کوئی بنیاد نہیں:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا جب کافر لاجواب ہو جاتے ہیں، کوئی دلیل نہیں رہتی تو کہتے ہیں آپ رسول نہیں ہیں، بس! ہم نہیں مانتے۔ دلائل تو دے نہیں سکتے، دلائل میں ہار جاتے ہیں، اعتراضات جو کرتے ہیں ان کے جواب من جانب اللہ مل جاتے ہیں تو بالآخر اس بات پر آ جاتے ہیں، کچھ بھی ہو ہم نہیں مانتے۔ انہیں فرما دیجیے، اس بات کا جواب یہ ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہیں۔ جب تم دلائل عقلی بھی تسلیم نہیں کرتے، دلائل نقلی بھی تسلیم نہیں کرتے تو پھر بات ختم ہو گئی۔ مناظرے کی، مباحثے کی، دلائل کی بات تو ختم ہو گئی۔ جب تم نے پہلی کتابوں میں نقل ہوئے دلائل کو اور قرآن میں نازل ہونے والی دلیلوں کو بھی ماننے سے انکار کر دیا ہے، جو ثبوت عقلی تھے اور عقل جن چیزوں کو جانتی تھی، وہ بھی تم نے ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ تو تمہیں دلیل دینے کے لیے باقی کیا بچا! میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ کافی ہیں اور در حقیقت یہ تمام جزوی دلائل ہوتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی حقیقی دلیل یہی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اللہ ہوتا ہے اور نبوت کا گواہ اللہ کافی ہے۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ پہلی کتابوں میں:

ہاں! دُنیا میں کچھ لوگ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ (۴۳) ایسے بھی ہیں جن کے پاس پہلی کتابوں کے علوم ہیں، تو وہ بھی جانتے ہیں کہ میں اللہ کا نبی و رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں۔ پہلی کتابوں میں بھی میرے اوصاف بیان کیے گئے ہیں اور میرے بارے ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ تو دُنیا میں جو لوگ صاحب علم ہیں، جو پہلی کتابوں کے علوم سے واقف ہیں، جانتے وہ بھی ہیں۔ قبول کریں یا نہ کریں لیکن جانتے وہ بھی ہیں اور اس حد تک جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے عہدِ فاروقی میں بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا، عیسائیوں کی طاقت بھی وہاں کافی مضبوط تھی، محاصرہ طویل ہو گیا اور وہ بھی تنگ ہو گئے، اندر راشن کی، کھانے پینے کی چیزیں ختم ہونے لگیں تو انہوں نے اپنے پادریوں سے اور جو دانشور اور راہنما تھے ان سے بات کی کہ بھئی! اس قصے کو ختم کریں یا تو ہمیں اس شہر کے دروازے کھول دینے چاہئیں اور باہر نکل کر لڑنا چاہیے، جو بھی فیصلہ ہو، ہم جیتیں یا ہاریں، چونکہ مزید ہم اندر بیٹھ کر زندہ نہیں رہ سکتے، یا پھر شہر چھوڑ دینا چاہیے۔ تو ان پادریوں نے کہا کہ ہمارے پاس جو علوم ہیں تورات و انجیل کے، ان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاؓ کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، تو تم مسلمانوں سے بات کرو اور ان سے کہو کہ اگر تمہارا خلیفۂ وقت خود یہاں آ جائے تو ہم بغیر لڑے شہر تمہارے حوالے کر دیں گے۔ ان کے علماء نے کہا کہ اگر ان کا خلیفۂ وقت خود یہاں آ جائے اور ہمیں پتا

چل جائے کہ یہ برحق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ برحق ہے اور اس کے ہاتھ پر یہ شہر فتح ہونا ہے، پھر اس سے لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر اس میں وہ اوصاف نہ ہوئے جو ہماری کتابوں میں موجود ہیں تو پھر شہر کے دروازے کھول کر ٹوٹ پڑو، فتح تمہاری ہے۔ چنانچہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ عیسائی یہ شرط لگاتے ہیں کہ خلیفۂ وقت یہاں آئے، ہم ان سے بات کر کے فیصلہ کریں گے، شہر چھوڑ دیں گے۔ آپؓ نے بیت المال سے ایک اونٹ لیا، ایک غلام کو ساتھ لیا، مدینہ منورہ سے بیت المقدس کے راہی ہوئے، کچھ دور اونٹ پر سواری فرمائی، پھر غلام سے کہا کہ تم اس پر سوار ہو جاؤ، کچھ دیر میں پیدل چلتا ہوں، پھر میں سوار ہو جاؤں گا اور تم پیدل چلنا۔ اس نے عذرِ معذرت کی کہ حضرت میں خادم ہوں، غلام ہوں۔ آپؓ نے کہا غلام ہو یا مالک ہو، سب انسان ہیں، سب کو تھکاوٹ ہوتی ہے، سب کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس نے کہا پھر میں آپ کے پیچھے بیٹھ جاتا ہوں تو فرمایا یہ بھی جاندار ہے، اگر ہم دونوں اس پر بیٹھ جائیں گے تو اس کو تکلیف ہوگی۔ آپؓ کا لباس بھی روایتی اور پرانا تھا۔ کپڑا کہیں کہیں سے جہاں پھٹ گیا تھا وہاں چمڑے کے پیوند بھی لگے ہوئے تھے۔ اور بیت المقدس کے قریب پہنچے تو بارش شروع ہوگئی، کھدر کا کپڑا تھا لباس بھیگ کر اور بھی بھاری ہو گیا۔ زمین پر کیچڑ سا ہو گیا اور جب بیت المقدس پہنچے تو اونٹ پر بیٹھنے کی باری غلام کی تھی۔ وہ غلام اونٹ پر بیٹھا تھا آپؓ نے مہار پکڑی ہوئی تھی اور جوتے اور گھٹنوں تک ٹانگیں مبارک کیچڑ میں لت پت ہو رہی تھیں۔ کپڑوں پر کیچڑ کی چھینٹیں بھی پڑ رہی تھیں۔ جو مسلمان استقبال کے لیے آئے اور وہاں جو جرنیل موجود تھے انہوں نے خوبصورت سا لباس، بہترین سا گھوڑا پیش کیا کہ عیسائی کیا کہیں گے کہ یہ مسلمانوں کے امیر المومنینؓ ہیں! آپ لباس بدل دیں، اس گھوڑے پر بیٹھ جائیں۔ آپؓ نے لباس بدلا، گھوڑے پر بیٹھے لیکن جلد ہی اتر آئے۔ فرمایا، نہیں اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے، یہ اپنا لباس لے لو اور میرا لباس مجھے دو، اپنا گھوڑا بھی لے جاؤ۔ میں نے لباس بدلا، یہ تمہارا قیمتی لباس پہنا، گھوڑے پر بیٹھا تو میرے دل میں انانیت آ گئی۔ اس لیے میں جیسا ہوں ٹھیک ہوں۔ اس حال میں جب آپؓ تشریف لے گئے اور عیسائی پادریوں نے دیکھا تو انہوں نے کہا یہی اوصاف تورات میں بھی لکھے ہیں۔ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی سچا ہے اور اس کا یہ خلیفہ (رضی اللہ عنہ) بھی سچا ہے۔ اس سے لڑو گے تو تباہ ہو جاؤ گے، شہر اس کے ہاتھ پر فتح ہونا مقدر ہے لہٰذا شہر خالی کر دو۔ انہوں نے کلمہ نہ پڑھا، یہ ان کی بدنصیبی۔ مانا نہیں، یہ ان کی بدنصیبی۔ لیکن وہ جانتے تھے۔ سو، فرمایا، میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دو کہ جن کے پاس کتابوں کا علم ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ میں سچا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ اور میرا اللہ بھی گواہ ہے، اور وہ لوگ بھی گواہ ہیں جن کے پاس آسمانی کتب کا علم ہے۔ یہ لوگ مانتے ہیں یا نہیں، لیکن جانتے وہ بھی ہیں۔

سورۃ ابراہیم رکوع 1 آیات 1 تا 6

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۙ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَوَیۡلٌ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَیَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۳﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمۡ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ ﴿۴﴾ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۙ وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ ﴿۵﴾ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَیۡكُمۡ اِذۡ اَنۡجٰىكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ وَیُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَیَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ وَفِیۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۶﴾

الٓرٰ ۟ یہ ایک (پرنُور) کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس لیے نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر نُور (روشنی) کی طرف لے جائیں، غالب (اور) قابلِ تعریف (اللہ) کے راستے کی طرف ﴿۱﴾ اللہ وہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اُسی کا ہے اور کافروں کے لیے ایک سخت عذاب سے (بڑی) خرابی ہے ﴿۲﴾ جو دُنیا کی

زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں (زیادہ پسند کرتے ہیں) اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں ٹیڑھا پن (شبہات) تلاش کرتے ہیں ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں ﴿۳﴾ اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انہیں (اللہ کے احکام) کھول کھول کر بیان فرما دے۔ پھر اللہ جسے چاہتے ہیں گمراہ کرتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور وہ غالب حکمت والے ہیں ﴿۴﴾ اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو (کفر کی) تاریکی سے (اسلام کی) روشنی کی طرف لائیں اور ان کو اللہ کے (احسانات کے) دن یاد دلائیں۔ بلاشبہ ان (معاملات) میں عبرتیں ہیں ہر صبر (اور) شکر کرنے والے کے لیے ﴿۵﴾ اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ کے انعام جو تم پر ہوئے یاد کرو جب تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی۔ وہ لوگ تمہیں برے عذاب دیتے تھے اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی ﴿۶﴾

تفسیر و معارف

سورۃ ابراہیم مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ چونکہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے، لہٰذا یہ آپؑ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں زیادہ تر بحث عقائد پر کی گئی ہے کیونکہ مکہ مکرمہ میں اسلام کی دعوت دی جا رہی تھی۔ لوگ اسلام قبول کر رہے تھے لہٰذا عقائد پر زیادہ بحث مکی سورتوں میں ملتی ہے۔ جبکہ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست وجود پذیر تھی، اس لیے مدنی سورتوں میں احکام پر زور دیا گیا ہے۔

الٓرٰ حروفِ مقطعات ہیں اور اس موضوع پر بہت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ یہ ایک ایسی بے مثل و بے مثال کتاب ہے جسے ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ یہ کتاب اور اس کے اوصاف دُنیا بھر کی کتابوں میں بے مثل و بے مثال ہیں۔ جو حقائق اس کتاب نے بیان کیے، ان سب سے اس وقت دُنیا ناآشنا تھی۔ ذاتِ باری، صفاتِ باری، آخرت، اعمال پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان پر بالتفصیل

بحث فرمائی۔ عقائد واحکام تو پہلی کتابوں میں بھی تھے لیکن ان کی تعلیمات معدوم ہو چکی تھیں، ان میں تحریف ہو چکی تھی۔ یہ وہ عظیم الشان کتاب ہے جس نے وہ سارے حقائق پھر سے آشکارا کر دیے۔ اور یہ وہ کتاب ہے جس نے نازل ہو کر اپنے نزول سے لے کر قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لیے ہر مسئلے میں راہنمائی فرما دی۔ مسئلہ ذاتی ہو، خاندانی ہو، قومی ہو، یا بین الاقوامی، ہر ایک معاملہ میں یہ کتاب راہنمائی فرماتی ہے۔ اس کے ارشادات قولِ فیصل ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں، ناقابل ترمیم ہیں۔ ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ دُنیا میں لوگ آئیں گے گزر جائیں گے، زمانے آئیں گے بیت جائیں گے۔ ہر قوم اور ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوں گے۔ ہر دور میں انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع بدلتے رہیں گے، ان کے انداز بدلتے رہیں گے لیکن اس کے احکام ایسے ہیں کہ ہر حال میں، ہر جگہ یہی قابلِ عمل اور صحیح ہوں گے۔ کِتٰبٌ یہ وہ کتاب ہے جو یکتا ہے اور کوئی دوسری کتاب اس کے مثل نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب کے فوائد دنیوی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ آخرت تک کو محیط ہیں۔

اللہ کی کتاب، سراپا نُور:

اللہ کی یہ کتاب بندے کا اللہ کریم سے رشتہ استوار کرتی ہے۔ یہ سراپا نور ہی نہیں بلکہ یہ اپنے پڑھنے، ماننے اور عمل کرنے والے کے دل کو بھی منور کر دیتی ہے۔ اللہ کریم نے جس طرح سورج کو سراجِ منیر کہا ہے یعنی ایک ایسا چراغ جو روشن ہے اور دوسروں میں بھی روشنیاں بانٹتا ہے۔ اسی طرح اس مبارک کتاب کو بھی سراجاً منیراً کہا ہے یعنی ایسا چراغ جو دلوں کو منور کرتا ہے، جلا بخشتا ہے، اور اس کے نزول کا مقصد بھی یہی ہے۔

صاحبِ کتاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان:

فرمایا، اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ اس کتاب کو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا، اس کا نزول ساری انسانیت کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہوا، مگر یہ نزول صرف ایک ہستی پر ہوا، اور وہ ہستیِ مبارک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وحی کو سمجھنا، وصول کرنا یہ صرف نبیء کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب ہے اور اسے انسانیت کو سمجھانا بھی صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی منصب عالی ہے۔ اگر ہم محض صرف ونحو، عربی گرائمر کے زور سے کوئی معنی تجویز کریں گے تو وہ کتاب کے صحیح معنی نہیں ہوں گے۔ کتاب کے معنی صرف وہ ہوں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھائے۔ کلامِ الٰہی کو وصول کرنے کے لیے فرشتوں سے بڑھ کر لطافت، طہارت و پاکیزگی چاہیے اور انسانوں میں یہ طہارت، یہ لطافت صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو میسر ہوتی ہے۔ صرف اللہ کا نبیؑ وحی الٰہی کو

وصول فرماتا ہے، اسے سمجھتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیؐ کو سمجھا دیا جاتا ہے اور وہ قوم کو سمجھاتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین:

جس طرح اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عظمتیں عطا فرمائیں، پوری انسانیت میں اعلیٰ منصب سے سرفراز فرمایا، اسی طرح ایسے افراد اور ایسی قوم بھی عطا فرمائی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سن کر اسے ایسا قبول کیا کہ قبول کرنے کا حق ادا کر دیا۔ یہ قومِ عرب کی خوش نصیبی تھی کہ اللہ نے انہیں وہ استعداد بخشی کہ انہوں نے وحیء الٰہی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وصول کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے اس پر عمل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تصدیق فرمائی کہ اس حکم سے یہی مراد تھی تو گویا دین کا فیصلہ ہو گیا کہ دین کیا ہے۔

میعارِ حق:

یہ طے ہے کہ دین وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سمجھایا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ اب اگر ساری دُنیا کے مسلمان اس پر متحد ہو جائیں تو فرقہ بندی ختم ہو جائے گی۔ جب بھی کوئی شخص اپنی طرف سے تشریح کرے گا جو اس تشریح سے مطابقت نہیں رکھتی ہو گی جو تشریح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سمجھی اور اس پر عمل کیا، تو ایک نئے فرقہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔

اسلام ایک ہے:

مجھ سے کسی نے سوال کیا کہ اسلام میں بہت فرقے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہے۔ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں ہے، اسلام سب کا ایک ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اسلام کو اس انداز سے سمجھا جائے جس انداز سے صحابہ کرامؓ نے سمجھا، عمل کیا اور آگے پہنچایا۔ جب ہم کتابِ الٰہی کی تشریح اپنی مرضی سے کریں گے تو ہم اسلام میں نہیں رہیں گے۔ کیونکہ فرقے تو تب بنتے ہیں جب کوئی اسلام سے باہر ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام سے باہر بہت سے فرقے ہیں، مگر اسلام میں کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اسلام ایک ہے۔

فرقہ اور اختلاف:

فرقہ تب بنتا ہے جب کوئی اسلام سے باہر نکلتا ہے۔ اصول میں تبدیلی کرتا ہے۔ جبکہ فروعات میں اختلاف مبارک ہوتا ہے۔ فروعات اس طرح ہوتی ہیں مثلاً کچھ مسلمان صلوٰۃ میں رفع یدین کرتے ہیں، بعض نہیں کرتے۔ صلوٰۃ میں تکبیر پر ہاتھ اٹھانا سنّت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ثابت ہے۔ لہٰذا سارے مسلمان تکبیرِ اُولیٰ پر

ہاتھ اٹھا کر کانوں تک لے جاتے ہیں۔اب اس کے دو پہلو ہیں کہ ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھائے جائیں، یا صرف تکبیرِ اُولیٰ پر کافی ہیں۔حنفی المسلک تکبیرِ اُولیٰ پر ہاتھ اٹھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔اہلِ حدیث احباب ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔تو یہ فرع ہے اصول کی، تکبیر پر ہاتھ اٹھانے کے اصول کے سب قائل ہیں۔یہ اصولی اختلاف نہیں بلکہ فروعی اختلاف ہے۔ایسا اختلاف بابرکت ہوتا ہے کہ بات کے ہر پہلو پر عمل ہو گیا، اس پر تو لڑائی کی ضرورت نہیں، یہ تو باعثِ برکت ہے کہ ارشادِ نبوی ﷺ کے اگر دو پہلو تھے تو دونوں پر عمل ہو گیا۔

اسی طرح صلوٰۃ باجماعت میں جب امام سورۃ الفاتحہ کے اختتام پر پہنچتا ہے تو مقتدیوں کے لیے آمین کہنا ضروری ہے۔اب آگے اس کی فرع ہے کہ آمین بلند آواز میں کہی جائے، یا خاموشی سے۔احناف کے نزدیک خاموشی سے کہی جاتی ہے جبکہ بعض مسالک بلند آواز سے کہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔تو فروعات بات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں، فرقہ نہیں بناتیں۔

مشاجراتِ صحابہؓ:

اس طرح کے فروعی اختلافات صحابہ کرامؓ میں بھی تھے اور انہیں مشاجراتِ صحابہؓ کہا جاتا ہے۔وہ اختلافات تھے، مخالفت نہیں تھی، جھگڑا نہیں تھا۔مشاجرہ، شجر سے ہے۔جب کسی درخت کی ٹہنیاں بہت گھنی ہو جائیں اور ایک دوسرے میں ایسے مل جائیں کہ ایک جال سا بن جائے تو اسے مشاجرہ کہتے ہیں۔تو صحابہ کرامؓ کے فروعی اختلافات کو مشاجراتِ صحابہؓ کہتے ہیں کہ اس سے چھاؤں اور گھنی ہو جاتی ہے۔اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِہْتَدَیْتُمْ (حدیثِ مرفوع) او کما قال رسول اللہ ﷺ "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں تم جس کے پیچھے چل پڑو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔فروعات کا اختلاف، اختلاف نہیں ہوتا اس لیے اسے اختلاف نہیں کہنا چاہیے۔بات کے ہر پہلو پر عمل ہو جاتا ہے لہٰذا باعثِ برکت ہوتا ہے۔

شانِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین:

اللہ کریم نے اپنے نبی ﷺ کی بعثت کے لیے اس قوم کو پسند فرمایا جس میں فطری استعداد تھی، جس میں قوتِ کار تھی۔اس قوم نے اگر مخالفت کی تو مخالفت کی بھی انتہا کر دی اور جب تسلیم کیا تو ماننے کا بھی حق ادا کر دیا۔گھر چھوڑ دیے، جان و مال، اولاد سب کچھ قربان کر دیا۔اپنی زندگیاں نچھاور کر کے اللہ کے پیغام کو روئے زمین پر پہنچا دیا۔قرآن کا نزول تیئس (23) برس میں مکمل ہوا، اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وصالِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد تیئس (23) برسوں میں آپ ﷺ کے جانثار صحابہؓ نے سائبریا سے

افریقہ تک اور امریکہ کے مغربی ساحلوں سے لے کر چین اور جاپان تک اسلام پہنچا دیا تھا۔ جس طرح اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو چن لیا، اُن پر یہ اعلیٰ کلام نازل فرمایا، ویسے ہی آپ ﷺ کی خدمت کے لیے، آپ ﷺ کے پیغام کو پہنچانے کے لیے خاص لوگ عطا کیے۔ ایک خاص مزاج، ایک خاص وجود دے کر اللہ نے انہیں پیدا کیا۔ آج اگر کوئی ان کی قدر و قیمت ماپنے بیٹھ جائے تو یہ اس کی جہالت ہے۔ میں، آپ یا کوئی عالم ان کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ ہمارے فہم و ادراک سے وہ لوگ بالاتر ہیں، کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے صحبت یافتہ ہیں، براہ راست شاگرد ہیں۔ جو لوگ صحابہؓ کے بارے میں لب کشائی کرتے ہیں وہ بے چارے جانتے ہی نہیں کہ صحابہؓ کیا تھے۔ اگر بندہ جانتا نہ ہو تو جواہرات کو پتھر ہی سمجھتا ہے، جبکہ جاننے والا تو پتھروں میں سے بھی کوئی کام کا پتھر نکال لیتا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''جذب القلوب اِلیٰ دیار المحبوب'' میں مدینہ منورہ کے فضائل میں لکھتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کو کتنا محبوب ہوگا کہ آپ ﷺ نے یہاں قیام کرنا پسند فرمایا۔ غزوۂ حنین میں جب غنائم تقسیم ہوئے تو زیادہ حصہ نومسلموں کو عطا کیا گیا۔ انصارِ مدینہ کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ تو اپنے ساتھ بھیڑ بکریاں، اونٹ، گھوڑے، دولت دُنیا لے جائیں اور تم اپنے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کو لے جاؤ تو حضور ﷺ نے وہیں قیام پسند فرمایا اور وہیں جلوہ افروز ہیں۔ یہ ایک فضیلت ہی کافی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے فضائل میں سے ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اکثر صحابہ کرامؓ مدینہ منورہ میں دفن ہوئے، تو فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں موجود ہے کہ جہاں کسی کا مدفن بنتا ہے، اس کی تخلیق کے لیے وہیں سے ذرّات یا خمیر لیا گیا ہوتا ہے پھر روئے زمین سے ذرّات آکر اس پر جمع ہوتے رہتے ہیں، لیکن وہ دفن اسی مٹی میں ہوتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ ایک قوم تھی جنہیں اللہ کریم نے اپنے نبی ﷺ کی رفاقت کے لیے ایک خاص استعداد دے کر پیدا فرمایا تھا۔ ان کی اکثریت مدینہ منورہ میں دفن ہے، اس کا مطلب ہے کہ مدینہ منورہ کی زمین ایسی مبارک ہے کہ اکثر صحابہؓ کے وجود کے ابتدائی ذرّات وہاں سے لیے گئے۔ اس بات کو وہ فضائل مدینہ میں لکھتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے۔ صحابہ کرامؓ عام انسان نہیں تھے۔ اللہ کے خاص بندے تھے۔

مقصدِ نزولِ کتاب:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ یہ عظیم الشان کتاب جو ہم نے آپ ﷺ پر نازل فرمائی۔ اس کا مقصد ہے

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کہ آپ ﷺ اولادِ آدم کو، انسانیت کو، اندھیروں سے نکال کر نُور کی طرف لے آئیں۔ اس کتاب میں اتنی روشنی، اتنی نُورانیت، اتنے انوارات، اتنی برکات جمع ہیں کہ یہ قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کو منور کرتی چلی جائے گی۔ اس کی روشنی ختم نہیں ہوگی۔ یہ وہ کتاب ہے کہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو، تاریکی میں ڈوبی ہوئی اولادِ آدم کو راہ راست پر لانے کا واحد ذریعہ ہے کہ اسے اس کا نُور پہنچے اور وہ تاریکی سے روشنی میں آجائے۔ ظلمت سے نُور میں آجائے۔ اسی کتاب میں قیامت تک آنے والے ہر فرد کے دل کو روشن کرنے کے لیے نُور موجود ہے۔ انسانیت ختم ہوجائے گی، قیامت قائم ہوجائے گی، اس کا نُور ختم نہیں ہوگا۔

ہماری اکثریت کا یہ مسئلہ ہے کہ وہ قرآن کا مفہوم نہیں سمجھتی۔ اور تلاوت بھی کم ہی کرتی ہے۔ اہلِ عرب خوش نصیب ہیں کہ وہ تلاوت کریں یا سنیں، نماز پڑھیں یا امام کے پیچھے سنیں، تو ایک ایک لفظ ان کے دل میں اترتا جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہم جو غیر عرب ہیں، ہم میں سے سوائے اہل علم کے، اکثریت کو کچھ سمجھ نہیں آتی لیکن یہ عجیب کتاب ہے کہ اگر آپ کو اس کا مطلب سمجھ آتا ہے تو نُورٌ علیٰ نُور ہے، اس پر عمل کرتے ہیں مزید نُور ہے۔ لیکن اگر مطلب سمجھ نہیں بھی آتا اور اسے پڑھتے جائیں تو اس کا نُور دل میں سرایت کرتا جاتا ہے اور پڑھنے والے کا دل منور ہوجاتا ہے۔

الٓرٰ حروف مقطعات ہیں، ان کے معنی تو کسی کو معلوم نہیں لیکن ان حروف کی تلاوت سے جو نُورانیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارے قلوب میں بھی آجاتی ہے۔ تو اس سے پتا چلتا ہے کہ قرآن کی تلاوت، ترجمہ سمجھے بغیر بھی کی جائے تو دل کو روشن کر دیتی ہے۔ اور روشن دل، زندہ دل کی نشانی یہ ہے کہ اسے برائی اور گناہ کڑوے لگنا شروع ہوجاتے ہیں اور نیکی کی طرف رغبت بڑھ جاتی ہے۔ تو ہمیں اپنے کردار سے، اپنے دل کی پسند و ناپسند سے اندازہ کرنا چاہیے کہ ہمارے دل کتنے منور ہو پائے ہیں۔ جبکہ اس کتاب کی برکات تو یہ ہیں لِتُخْرِجَ النَّاسَ کہ آپ ﷺ تمام انسانیت، قیامت تک آنے والے ہر بنی آدم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں۔ یعنی قیامت تک آنے والا ہر فرد جو مسلمان ہوتا جائے تو ہر فرد کا دل چاند کا ٹکڑا بنتا چلا جائے گا۔

آپ ﷺ کی رسالت قیامت تک کے لیے ہے:

اس آیہ کریمہ کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک پہلو تو زیر بحث آچکا کہ اس کتاب کو سمجھانا، حضور ﷺ کا منصبِ عالی ہے۔ دوسرا بہت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ انسانیت تو قیامت تک چلے گی تو رسالت ونبوتِ محمد رسول اللہ ﷺ بھی قیامت تک قائم ہے۔ جس طرح عہدِ نبوی ﷺ میں لوگوں کو تاریکی سے

روشنی نصیب ہوئی، قیامت تک ہر کلمہ پڑھنے والے کے ہاتھ میں دامانِ رسالت آتا چلا جائے گا اور وہ ظلمت سے نُور میں آتا چلا جائے گا۔ اسی لیے آج بھی ہم پڑھتے ہیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا سورج اسی آب و تاب سے چمک رہا ہے جس طرح عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں چمک رہا تھا اور قیامت تک ایسے ہی روشن رہے گا۔ لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وصال کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم برزخ میں تشریف لے گئے، بات ختم ہو گئی۔ نہیں! بات ختم نہیں ہوئی، بات ویسے ہی زندہ و تابندہ ہے اور اس آخری بندے تک رہے گی جس پر قیامت قائم ہو گی۔

کتابِ حیات کے ساتھ ہمارا رویہ:

ہمیں تو دُنیا اور اس کے مشاغل نے اتنا اُلجھا دیا ہے کہ ہمارے پاس قرآن پڑھنے کی فرصت بھی نہیں ہے۔ گھروں میں رکھا ہے، ریشمی غلافوں میں، اونچے اونچے طاقوں میں رکھتے ہیں۔ چومتے ہیں، ادب سے رکھتے ہیں، اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے، بچیوں کو جہیز میں دیتے ہیں۔ یہ سب اچھا ہے لیکن اس سے مقصد ادا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد پڑھنا، سمجھنا اور عمل کرنا ہے۔ یہ کتاب حیات تھی اور ہم نے اس سے مردہ دلوں کو زندہ کرنا تھا۔ لیکن ہم مرنے والے کے سرہانے پڑھتے ہیں کہ وہ آسانی سے مرجائے۔ کہ

از یٰس او آساں بمیری

قرآن کا مصرف یہ سمجھ لیا کہ مرنے والے کے سرہانے سورۃ یٰس پڑھو کہ وہ آرام سے مرجائے۔

حالانکہ یہ تو کتابِ حیات ہے۔ قرآن پڑھنے سے ہمیں کوئی کیفیت نصیب نہ ہو، اس سے برسنے والا نُور محسوس نہ ہو تو ہماری بدنصیبی ہے۔ لیکن اصول یہ ہے کہ دیکھنے کے لیے آنکھ اور محسوس کرنے کے لیے حس چاہیے۔ اگر ایک آدمی مردہ ہو جائے تو اسے آپ آگ پر بھی رکھیں تو اسے گرمی محسوس نہیں ہو گی۔ وہ جل سکتا ہے لیکن اسے تپش کا احساس نہیں ہو گا۔ اسی طرح جب دل مردہ ہو جائے تو قرآن کے نُور اور روشنی کو محسوس نہیں کر سکتا۔ بیمار کو آپ دودھ میں میٹھا ملا کر بھی دیں تو اسے کڑواہی لگتا ہے کیونکہ اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے۔

تقاضائے ربوبیت:

اس کتاب میں انسانیت کے ہر فرد کے لیے، قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لیے نُور موجود ہے۔ ظلمتوں سے نکالنے کے لیے روشنی موجود ہے۔ یہ اتنا اہتمام کس کے لیے؟ اس لیے کہ اللہ ربّ ہے، ربوبیت اس کی صفت ہے۔ یہ ربوبیت کے کرشمے ہیں، تخلیق بھی، تربیت بھی، پرورش اور تکمیل ضرورت بھی۔ انسان وہ واحد مخلوق ہے

جس کی روح عالمِ امر سے ہے۔ ارشادِ باری ہے، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے امر میں سے ہے۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل:85) عالمِ امر کے حقائق مادّی ذہن سے نہیں سمجھے جاسکتے کہ دائرۂ تخلیق جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے عالمِ امر شروع ہوتا ہے۔ امر اللہ کی صفت ہے۔ عالمِ امر کے حقائق اللہ کسی کو سمجھا دیں یا جب آخرت میں انسان جائے گا اور یہ دنیوی مزاج ختم ہو جائے گا تب علم و ادراکات آخرت کے ہوں گے پھر اندازہ ہوگا کہ روح کیا ہے۔ لہٰذا اتنا فرما دیا کہ روح اللہ کے امر سے ہے۔ اب یہ کیسے ہے، کیونکر تجلی فرمائی، کیسے تخلیق کی؟ فرمایا، یہ باتیں انسانی عقل سے بالاتر ہیں۔ جو وجود خاکی ذرات سے پروردگارِ عالم نے تخلیق فرمایا اس کی خدمت پر معمورۂ عالم کو لگا دیا۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو اس انسانی وجود کی خدمت کے لیے، چاند کی روشنی اور اس کا سفر اسی کی خدمت پر مامور ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں تو اس کی خاطر، پھول، پھل اگتے ہیں تو اس کے لیے فرمایا، وَخَلَقَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (الجاثیۃ:13) روئے زمین کی ساری مخلوق، دُنیا کا سارا نظام صرف اے انسان تیری خاطر ہے، تیری خدمت کے لیے ہے۔ تم جانداروں کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھا لیتے ہو۔ کھال کے جوتے بنا لیتے ہو۔ اور تمہیں ثواب بھی ملتا ہے کہ اسے اللہ کے نام پر ذبح کیا، بسم اللہ پڑھ کر حلال رزق کھایا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ربِّ کریم فرماتا ہے، میں نے پیدا ہی تمہاری خدمت کے لیے کیا تھا۔ تم نے اچھا کیا میرے نام پر ذبح کیا، میرے نام سے کھایا، میرے نام پر جوتے بنا کر پہنے، میرا شکر ادا کیا۔ اس کے پیدا کرنے کا مقصد ادا ہو گیا۔ پھول کتنے خوبصورت لگتے ہیں۔ تم انہیں توڑ کر گلدانوں میں سجا لیتے ہو۔ اچھا کرتے ہو، تمہارے لیے ہیں۔ تم انہیں گلدانوں میں سجاؤ، تم ان کے ہار بناؤ، گلدستے بناؤ، دوا بناؤ، غذا بناؤ، مشروبات بناؤ یہ سب تمہاری خاطر پیدا کیے گئے۔ ہاں! ایک شرط ہے یہ بات یاد رکھو کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، انہیں بھی اس نے ہی پیدا کیا ہے۔ اس کے نام پر استعمال کر سکتے ہو، ناشکری کر کے استعمال کرو گے تو میں حساب لوں گا۔ اس خاکی بدن کے لیے ربّ العالمین نے اتنا وسیع نظام پیدا فرما دیا جبکہ یہ بدن تو روح کا آلہ ہے، یہ اصل انسان نہیں ہے۔ اب والد سے انسان کو کتنا پیار ہوتا ہے، جب فوت ہو جائے تو کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ اباجی کو اٹھا لو یا اباجی کا جنازہ پڑھو۔ کہتے ہیں میّت کو اٹھاؤ، میّت کا جنازہ پڑھو۔ موت ساری خوش گمانیاں ختم کر دیتی ہے۔ سارے رشتے توڑ دیتی ہے۔ تو یہ بدن جو روح کا آلہ ہے، اس کی سواری ہے، اس دُنیا میں کام کرنے کا ایک ہتھیار ہے۔ اس کے لیے تو ربّ کریم نے اتنی کائنات سجا دی تو پھر روح کے لیے کتنا اہتمام کیا ہوگا؟ علماءِ حق فرماتے ہیں کہ اصل انسان روح ہے۔ جب بھی بات 'الانسان' کی ہوگی تو اس سے مراد روح ہوگا۔ روح کو کوئی مردہ یا میّت نہیں کہتا۔ روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے اگر سواری

کے لیے اتنا اہتمام کیا جائے تو سوار کے لیے کوئی غذا، مشروبات نہ ہوں گے؟ گھوڑے کے لیے اہتمام زیادہ ہوگا یا سوار کے لیے؟ گھوڑے کی عزت اس لیے ہوگی کہ اس پر ایک اعلیٰ انسان سوار ہے۔ اگر وہی گھوڑا تانگے میں جُتا آتا تو آپ اس کے لیے وہ اہتمام نہ کرتے۔ سواری کی اہمیت سوار سے ہوتی ہے۔ تو اصل انسان یعنی روح کے لیے بھی تو ربّ کریم نے کوئی کائنات سجائی ہوگی۔ وہ کائنات قرآن ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع ہے۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ یہ پروردگار کی طرف سے ہے کہ اس نے روح کے لیے جو نعمتیں بنائیں سب کو یکجا کر کے اس کتاب میں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی میں سمو دیا۔ روح کے لیے سارا اہتمام، اس کتاب اور صاحبِ کتاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں رکھ دیا۔ اب جو کچھ لینا ہے ایک در سے لینا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لینا ہے۔ جو اہتمام روح کے لیے کیا گیا وہ اس کی شان کے مطابق ہے۔ سواری کے لیے اللہ نے کائنات سجادی تو روح کے لیے اس سے کروڑوں گنا وسیع کائناتیں سجادیں۔ اور اس میں ایک بہت بڑی آسانی یہ رکھی کہ روح کی ساری نعمتیں، اس کی تربیت، اس کی غذا، اس کی راحت سب کو ایک نکتے میں سمو دیا ہے اور وہ ہے اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جبکہ دُنیا کی نعمتیں حاصل کرنے کے لیے در، در کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ ربّ کریم نے یہ کتاب اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی۔ اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب ہے کہ تمہیں ظلمت سے نُور میں لائیں اور تمہارا کام ہے کہ دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چمٹ جاؤ۔

اللہ سے تعلق:

استاذی المکرّم قلزمِ فیوضات حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی برکات کو اللہ کریم نے سورۃ یٰسٓ میں جمع فرمادیا ہے۔ سورۃ یٰسٓ کی ساری برکات سورۃ الفاتحہ میں سمیٹ دی ہیں اور سورۃ الفاتحہ کی ساری برکات بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں سمودی ہیں۔ اور یہ ساری برکات بِسْمِ اللّٰهِ کے 'با' میں رکھ دی ہیں۔ یہ 'با' تلبس ہے یعنی ساتھ لگتا ہے، ملتا ہے، لپٹتا ہے، چمٹتا ہے تو اللہ کریم کی ذات اور اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چمٹ جانا ہی سارا دین ہے۔ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چمٹ گئے، پھر دُنیا کا کوئی طوفان ان سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن چھڑا نہ سکا، کوئی لالچ، کوئی دنیوی منفعت انہیں اطاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ روک سکی۔ ہم تو دُنیا کی قلیل متاع پر بک جاتے ہیں۔ کہیں عہدوں کے لالچ میں اور کہیں محض اس اُمید پر بک جاتے ہیں کہ فلاں شخص میرے بہت کام آئے گا۔ ایسا معاملہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا تھا کہ قیصرِ روم نے انہیں دوستی کی پیشکش کی تھی لیکن ان کا جواب کیا تھا؟ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جو بہت معروف آدمی تھے، ان تین افراد میں شامل تھے جن کی توبہ

کا معاملہ اللہ کے سپرد تھا۔ مخلص صحابیؓ تھے مگر غزوہ تبوک میں شرکت میں سستی ہوگئی تھی۔ بہر حال جب مسلمانوں نے ان سے قطع تعلق کرلیا اور زمین ان پر تنگ ہوگئی تو ایک غسانی سردار جو کافر تھا اور قیصر کا دست راست تھا، اس نے انہیں خط لکھا کہ قیصر کے پاس آجاؤ، تمہاری بڑی عزت ہوگی۔ بادشاہ کا پیغام تھا کہ سنا ہے کہ تمہارے صاحب تم سے خفا ہیں تو میرے دربار میں سب سے اعلیٰ مرتبہ تمہارا انتظار کررہا ہے تم یہاں چلے آؤ۔ یہ خط پڑھ کر کہنے لگے کہ میرے گناہ اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ اب کافروں کو مجھ سے امیدیں بندھنے لگی ہیں۔ اسی قاصد کے سامنے اس خط کو تنور میں ڈال دیا اور کہا کہ بادشاہ سے کہنا یہی میرا جواب ہے۔ ان مقدس نفوس کی امیدوں کا مرکز صرف اللہ کریم کی ذات تھی۔

اللہ پروردگار ہے، ربّ ہے اس نے یہ کتاب نازل فرمائی، روح کی تربیت کے لیے کئی عالم سجا دیے اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ(۱) اللہ کی راہ کی طرف وہ جو ہر شے، ہر ذات پر غالب ہے اور جو سزاوارِ حمد وثناء ہے۔ فرمایا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ ہے جہاں سے وہ نُور ملتا ہے، جو اس بارگاہ تک لے جاتا ہے، جو ساری کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے۔ دُنیا میں ہم کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں کہ کسی اعلیٰ عہدیدار تک رسائی ہوجائے، کسی وزیر سے واقفیت ہوجائے، جس کی کسی حکمران تک رسائی ہوجائے تو اس کے قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔ فرمایا، اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یہ وہ راستہ ہے جو بارگاہ الوہیت کو جاتا ہے اور اسی پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کو چلاتے ہیں۔ اور وہ ایک ہی ہستی ہے جو اس راہ پر چلا سکتی ہے۔ انہی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات ہوں گی تو انسان اُدھر قدم بڑھا سکیں گے۔ اَللّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ حق یہ ہے کہ اس کی بارگاہ کی طرف لپکو جو دُنیا وآخرت سب کا مالک ہے۔ دُنیا کی نعمتیں ہوں، عالمِ امر کی نعمتیں ہوں یا آخرت کی، سب کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ تو اللہ ہی کی بارگاہ کی طرف طلبگار بن کر لپکنا چاہیے۔

اس ضمن میں سلطان محمود غزنویؒ کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ سلطان مرحوم کو اپنے خادم ایاز سے بہت لگاؤ تھا حالانکہ وہ اسے جنگل میں کسی چرواہے کے ہاں سے لائے تھے۔ انہیں پسند آگیا تو ساتھ رکھ لیا۔ اسے اپنا مقرب بنا لیا اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے حسنِ سلوک سے دربار کے بعض امراء بہت خفا تھے۔ ان میں سے ایک نے اعتراض کیا کہ آخر ایاز نے ایسا کون سا معرکہ سرانجام دیا ہے کہ اس کی اتنی قدر ومنزلت ہوتی ہے جبکہ ہمارے آباء و اجداد نے فتوحات حاصل کیں، لڑائیاں لڑیں، زخم کھائے۔ اور اب ہم آپ کے خادم ہیں لیکن عزت ایاز کی کی جاتی ہے، آخر اس نے کون سا میدان فتح کیا ہے؟ سلطان خاموش ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد کسی فتح سے لوٹے تو انہوں نے حکم دیا کہ دربار میں مختلف چیزوں کے نام تختیوں پر لکھ کر دیواروں پر سجا دیے جائیں۔ مثلاً گھوڑے، زمین، جاگیریں، اشرفیاں، اسلحہ، ہاتھی، بہترین لباس، یہ نام تختیوں پر لکھ کر دربار میں سجادی جائیں۔ جب حکم کی تعمیل ہوگئی تو اہلِ دربار کو،

ان امراء کو طلب کیا گیا اور اجازت دی کہ فتح کی خوشی میں بادشاہ کی طرف سے انعام کے طور پر وہ جس چیز کا چاہے انتخاب کر لیں، وہ انہیں عطا کر دی جائے گی۔ سب اپنی اپنی پسند کی چیز کی طرف لپکے۔ کسی کو گھوڑے پسند تھے، کسی کو اسلحہ، کسی کو جاگیریں، کسی کو جواہرات وغیرہ۔ غرضیکہ سب نے اپنی اپنی پسند کی چیز کا انتخاب کیا۔ ایسے میں ایاز اٹھا اور اس نے سلطان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ مجھے سلطان کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہیے۔ تب سلطان نے اس معترض امیر سے کہا کہ تمہاری بات کا یہ جواب ہے۔ میں اس کو اس لیے پسند کرتا ہوں کہ میں اس کی پسند ہوں، اس کی زندگی میرے ساتھ گزری ہے۔

اللہ کریم بھی فرما رہے ہیں، صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ(۱) اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ یہ وہ راستہ ہے جو بارگاہ الوہیت کو جاتا ہے۔ اے کائنات کی نعمتوں پر فدا ہونے والے شیدائیو! یہ راستہ تمہیں ان نعمتوں کے خالق اور حقیقی مالک کی طرف لے جاتا ہے۔ تم اس بارگاہ میں پہنچ جاتے ہو جہاں سب نعمتیں بنتی اور بٹتی ہیں۔ وَوَیۡلٌ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ برباد ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے ان حقائق کا انکار کیا۔ ان کے پاس کچھ نہیں بچا۔ یعنی بربادی کی حد ہو گئی۔ وَوَیۡلٌ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ کافروں کی تباہی انتہا کو پہنچ گئی۔ ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا کہ اتنے کرم کے ہوتے ہوئے مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ(۲) وہ عذابِ شدید میں غرق ہیں۔ ظاہر ہے جو دو راستوں میں سے اس راستے کا انتخاب کرے جو جہنم اور اس کے عذابوں کی طرف جاتا ہو جبکہ دوسرا راستہ اللہ کی رضا کا ہو، اس کی جنت اور ان کی نعمتوں کا ہو۔ اور پھر وہ اللہ کی رضا کے راستے پر نہ چلے بلکہ ہاتھ چھڑا کر دوسری طرف جائے تو اس سے زیادہ بدنصیب کون ہو سکتا ہے جبکہ سیدھا راستہ بالکل سامنے ہو، اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اصدق الصادقین بتا رہا ہو، اللہ کی کتاب بتا رہی ہو، اللہ کے بندے بتا رہے ہوں۔ فرمایا، اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَةِ یہ وہ بے وقوف ہیں جنہوں نے مادّی دُنیا کی لذات کو آخرت پر فوقیت دی۔

برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم

انسان چونکہ بدن اور روح کا مجموعہ ہے اس لیے دونوں کے اپنے اپنے تقاضے ہیں اور دونوں کی اپنی اپنی غذا ہے۔ ایک ظاہری، بدن کی، اور ایک روح کی۔ اگر روح زندہ ہو اور اسے ذکر اللہ کی غذا ملے اور برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم پہنچیں تو اس کی خواہش قربِ الٰہی ہوتی ہے۔ اور ایسی روح مادّی بدن کی خواہشات پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن اگر روح غذا سے محروم ہو جائے یا نیم مردہ ہو جائے یا کفر میں چلی جائے، مر جائے کیونکہ 'کفر' روح کی موت ہوتی ہے۔ کفر موت ہی کی طرح روح کو بے حس کر دیتا ہے ورنہ روح کو فنا یا موت نہیں ہے۔ جب روح بے حس ہو جائے تو بندے کے سامنے صرف مادّی دُنیا رہ جاتی ہے اور وہ آخرت سے لاپروا ہو جاتا ہے۔ وہ محبت جو اسے آخرت کے ساتھ ہو سکتی تھی،

خود اللہ کریم کی ذات سے ہو سکتی تھی، اس کا رخ مادّی چیزوں کی طرف پھر گیا۔ چند سکوں کی طرف، چند عہدوں کی طرف چند مکانوں کی طرف اور يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ انہوں نے آخرت کے بدلے دُنیوی لذات کو محبوب بنالیا اور یہ محبت انہیں کفر تک لے گئی۔ اور انجام کار تباہی تک لے گئی۔ اب یہ لوگ تباہی کے کنارے کھڑے ہیں کہ نہ صرف خود اطاعتِ الٰہی چھوڑے ہوئے ہیں بلکہ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکنے کی بھر پور سعی کر رہے ہیں۔ عالمِ کفر کے سارے وسائل، ذرائع ابلاغ، اُن کے اجلاس و کاروبار، ان تمام کارروائیوں میں ان کے یہی ارادے پنہاں ہوتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ سے دور کیا جائے۔ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اب یہ اتنے دور جا چکے ہیں کہ دوسروں کو بھی ادھر ہی کھینچ رہے ہیں۔ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اور ہمیشہ کجی یا ٹیڑھا پن تلاش کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اللہ کے رسول ﷺ پر بھی اعتراض سوجھتے ہیں، یہ اللہ کی وحی پر بھی اعتراض اٹھاتے ہیں اور اللہ کی کتاب پر بھی اعتراض ہی کرتے ہیں۔ ٹیڑھا پن اور کجی دراصل ان کی نگاہ میں ہے جس کے سبب حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (۳) یہ بہت ہی دور کی گمراہی میں جا پڑے کہ وحیٔ الٰہی پر اعتراض کرتے ہیں۔ انہیں اعتراض ہے کہ قرآن عربی میں کیوں نازل ہوا؟ عربی تو عرب کے ہر خاص و عام کی زبان ہے تو اس میں نزول کونسا بڑا کام ہے۔ اگر یہ اتنی مقدس تھی، اتنی عظیم کتاب تھی تو اسے کسی اور، یا فرشتوں کی زبان میں نازل ہونا چاہیے تھا۔ عربی تو ہر عام آدمی بھی بولتا ہے۔ تو فرمایا، یہ بے وقوف نہیں سمجھتے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ہر نبیؑ جس قوم میں مبعوث ہوا، اسی قوم کی قومی زبان میں اس پر تعلیماتِ باری نازل ہوئیں۔ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ تا کہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکیں جو وہ بیان فرمائیں۔ اگر قرآن کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو پھر عربوں کو سمجھانے کے لیے ترجمہ کیا جاتا۔

کلامِ الٰہی اور تراجم:

ترجمے اور اصل کلام میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے، بہت فرق ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت سب سے مشکل مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات کہنے والے نے اپنے جملے میں کہی ہے، وہ بات بعینہٖ آگے پہنچائی جائے۔ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں تو اکثر ہم وہ بات لکھ دیتے ہیں جو کہنے والے نے کہی نہیں ہوتی، ہم نے ہی سمجھنے میں کوتاہی کی ہوتی ہے۔ سب سے مقدس اور قابلِ احترام ترجمے تو قرآن مجید کے ہیں، جو اُنہی افراد نے کیے جنہیں اللہ نے بہت وسیع علوم عطا کیے ہیں۔ یہ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں اور چنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ پانچ، چھ یا سات ترجمے اکٹھے رکھ کر پڑھیں تو اکثر الفاظ کے مفاہیم مختلف ملیں گے، آخر کیوں؟ یہ اس لیے کہ یہ ترجمہ کرنے والے کے شعور کے مطابق ہوتا ہے، جس نے جو سمجھا وہ دیانتداری سے آگے پہنچا دیا۔

برصغیر میں طلوعِ اسلام کے بعد، غالباً چودہ سو سالوں میں قرآن مجید کے صرف پچاس ترجمے لکھے گئے ہیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ نایاب ہوتے ہوئے، آج صرف سات یا آٹھ دستیاب ہیں۔ پھر ان ترجموں میں وہ ترجمے بھی شامل ہیں جنہوں نے حقائق مسخ کر دیے اور انہیں بھی قرآن کا ترجمہ کہا جاتا ہے۔ تو ترجمے میں سب سے کٹھن کام کہنے والے کی بات کو، اس کی منشاء کو بعینہٖ آگے پہنچانا ہے۔ سب سے ناممکن کام یہ ہے کہ اس جملے کی شیرینی، یا کلام کی لذت اور ادبی کمال کو ترجمے میں منتقل کیا جائے۔ آپ اردو کا شعر سنتے ہیں، آپ اس کا ترجمہ انگریزی یا فارسی میں کر کے اس کا مطلب تو پہنچا سکتے ہیں لیکن اس میں جو لذت، جو کیف ہے وہ منتقل نہیں کر سکتے۔ تو قرآن کریم کے ترجمے تو ہوئے لیکن جو سرور، جو کیف، جو روانی اور لطف عربی زبان میں ہے وہ دوسری زبانوں میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ بڑا ہی کامیاب وہ ہوگا جو الفاظ کا وہی مفہوم بتا دے جو حضور ﷺ نے بتایا ہے۔ یہ اعلیٰ ترین ترجمہ ہے۔ لیکن عربی کی روانی، اس کا لسانی زیروبم، لذات و کیفیات، اس جملے کی ادائیگی اور لطافتیں بھلا ترجمے میں کیسے پیش کی جا سکتی ہیں؟

فرمایا، وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ جتنے انبیاءؑ پہلے آئے، جس قوم میں مبعوث ہوئے، اسی قومی زبان میں ان پر کتاب نازل کی گئی کہ سب سے پہلے سننے والے، اس کے مفاہیم، اس کی لذت و کیفیات سے آشنا تو ہوں تا کہ آگے پہنچانے کا حق ادا کر سکیں۔ تو اگر اوّل اوّل مخاطبین کو بھی ترجمہ سے سمجھنا پڑے تو پھر وہ لذت، وہ کیفیات تو رہ جائیں گی۔ پھر آگے کیا پہنچے گا؟ تو ان جاہلوں کا یہ اعتراض کہ قرآن عربی میں کیوں نازل ہوا، کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ آپ ﷺ سے پہلے بھی جن قوموں میں انبیاءؑ مبعوث ہوئے، اُن پر اسی قوم کی زبان میں کلام نازل کیا گیا۔ یہ تو عربوں کی خوش نصیبی تھی کہ آپ ﷺ اُن میں مبعوث ہوئے۔ اور انہی کی قومی زبان میں آپ ﷺ پر کتاب بھی نازل کی گئی۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی زبان کو چن لیا گیا۔ قیامت کے روز بھی یہی زبان ہوگی، اہلِ جنت کی زبان بھی یہی ہے۔ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یہ تو اللہ اور بندے کا معاملہ ہے۔ اللہ کی اپنی تقسیم ہے۔ ہدایت اور گمراہی کا مدار انسان کے دل کی کیفیت پر ہے کہ اس کا اپنے اللہ کے ساتھ کس درجے کا تعلق ہے۔ اسی کیفیت پر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جس درجے کا تعلق یا کیفیت ہوگی، جتنی زیادہ ہوگی اتنی زیادہ ہدایت مرتب ہوگی۔ اور جتنی کم ہوگی، اسی درجے میں ہدایت نصیب ہوگی۔ اگر اس کا قلبی رجحان اللہ سے ہٹ کر دوسری طرف، مادّی لذات کی طرف ہوگا تو اس پر گمراہی مرتب ہو جائے گی۔

ہدایت و گمراہی کا مدار:

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اللہ جسے چاہتے ہیں گمراہ کر دیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں

ہدایت دے دیتے ہیں۔ جو بندے کے دل میں ہے، اسی پر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آم کا پودا لگاتا ہے تو اس پر آم ہی لگتے ہیں۔ اگر کوئی مرچ کا پودا لگاتا ہے تو مرچیں لگتی ہیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴) وہ غالب ہے، طاقت والا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، لیکن وہ حکیم ہے اور سب کام اس کی حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنے معجزات عطا فرما کر اسی لیے مبعوث کیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نُور کی طرف لے آئیں۔ اللہ کے نبیؑ کا کام، منصبِ نبوت یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام کو ڈول کی طرح، کنویں میں تاریکیوں میں پڑے لوگوں کی طرف ڈال دیں۔ اب یہ اُن پر ہے کہ وہ اس ڈول میں سوار ہوجائیں۔ اور نبیؑ انہیں کھینچ کر اوپر سورج کے سامنے روشنی میں لے آئے۔ اب اللہ کا نبیؑ ڈول بھی ڈالے، پکارے بھی، مگر لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اس میں نہیں بیٹھیں گے تو پھر رہیں تاریکی میں! وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ اور اے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ کے احسانات گنوایئے۔ کہ اللہ نے انہیں کنعان کے دیہات سے نکال کر مصر میں جگہ دی۔ اور مصر کی ساری سلطنت ان کے سپرد کردی۔ مصر میں بسنے والی اقوام ان کے تابع ہوگئیں اور وہ حکمران ہوگئے۔

عظمت، نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دامن سے وابستگی میں ہے:

تو اس عظمت کو انہوں نے کیوں کھودیا کہ آج قبطیوں کی بدترین غلامی میں جاچکے ہیں اور فراعنہ مصر ان پر مسلط ہیں! یہ ان بلندیوں سے ان پستیوں میں کیسے پہنچے؟ انہیں یاد دلایئے کہ اللہ نے تو تمہیں ان بلندیوں پر بٹھایا تھا، اور وہ عظمت تمہیں اللہ کے نبی یوسفؑ کی بدولت، ان کی برکت سے، عطا کی گئی تھی۔ اور تم نیچے گرتے گرتے ان رذالتوں میں گرفتار ہوگئے۔ تو کم از کم اب واپس آجاؤ۔ آج پھر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دامن تھام لو۔ اللہ کے احسانات یاد کرو، اس کی عطا کردہ عظمت یاد کرو، اپنی موجودہ پستی پر غور کرو۔ اور اللہ نے مجھے نبوت عطا کی ہے تو آج پھر موقع ہے، میرا دامن تھام لو کہ اللہ تمہیں پھر سے سربلند کردے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۵)

ان سب باتوں میں بہت دلائل موجود ہیں، لیکن صرف اُن کے لیے جو جلد بازی میں فیصلے نہیں کرتے بلکہ صبر کرتے ہیں۔ پورے سکون کے ساتھ، ٹھہراؤ کے ساتھ نیکی و بدی کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر نیکی کی طرف فیصلہ کرتے ہیں۔ اور ان میں جذبہء شکر بھی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے ممنون و مشکور ہوتے ہیں کہ اس نے ان میں اپنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مبعوث فرمایا اور یہ آسان راستہ عطا کردیا کہ ہم ایک جملہ کہہ کر ہر طرح کے کفر اور گناہوں کی ظلمت سے نکل کر اللہ کے نُور کی روشنی میں آگئے۔

یہ معمولی بات نہیں کہ ایک بندے کی زندگی، کفر اور گناہوں میں گزر جائے اور جب اللہ اسے خلوص عطا

کرے، وہ فیصلہ کرے، اور اقرار کرلے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو اس سے پہلے کے تمام گناہ دُھل جاتے ہیں۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۵) اس میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو صبر و تحمل سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں اور اپنے اچھے فیصلے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو یاد دلایا کہ تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ تم کون تھے، کہاں سے چلے، کہاں اللہ نے تمہیں پہنچایا؟ تمہارے پاس کتنے اختیارات تھے، کتنے باعزت و باوقار تھے؟ اور رفتہ رفتہ کتنی پستی و ذلت میں گھر گئے۔ اب جب اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا تو پھر تمہیں ان پستیوں سے نکالا، روحانی اعتبار سے دلدل اور ظلمت کی پستی سے نکالا اور دنیوی تکلیفوں سے بھی نجات دی۔ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ جب اللہ نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی تو تم دنیوی ذِلتوں سے بھی مامون ہو گئے۔ فرعونی تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وہ تو تمہیں طرح طرح کے عذاب دیتے تھے۔ جن سے تمہارا حلیہ بگاڑ دیتے تھے۔ اور چابکوں سے مار مار کر تم سے خدمت لیتے اور اس سے بھی بڑا عذاب یہ تھا کہ وَیُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ تمہارے بیٹے ہوتے تو انہیں قتل کر دیتے، ماؤں کی گود سے لے کر تلواروں پر اچھال دیتے تھے اور بیٹیاں ہوتیں تو انہیں اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتے۔ اللہ نے تمہیں اس عذاب سے بھی نجات دی۔ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ (۶) اس سے بڑا عذاب کیا ہوگا کہ تم اپنے بچوں کا تحفظ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ تم نے جوں جوں یوسف علیہ السلام کے بعد ان کا اتباع چھوڑا اور دنیوی عہدوں اور عیش و عیاشی کی طرف متوجہ ہوتے گئے اور حکمرانی کے مزے لوٹنے لگے تو ایک ایک نعمت تم سے زائل ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ تم اس پستی میں چلے گئے کہ فرعونیوں نے تمہیں غلام بنا لیا۔ تم سے مشقت لیتے، مارتے پیٹتے۔ جسے چاہتے زندہ رکھتے، جسے چاہتے مار دیتے۔ تمہارے خون کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ نبوت کا فیض ہے کہ اللہ نے آج تمہیں اُن روحانی پستیوں سے بھی نکالا اور ان دنیوی پستیوں سے بھی نکال لیا اور آج تم پھر ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زمین پر موجود ہو۔

سورۃ ابراہیم رکوع 2 آیات 7 تا 12

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۸﴾ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب تمہارے پروردگار نے تم کو آگاہ فرمایا تھا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ (نعمت) عطا کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو بے شک میرا عذاب بڑا سخت ہے ﴿۷﴾ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اگر تم اور سب لوگ جو زمین میں (بستے) ہیں، ناشکری کریں تو بے شک اللہ بے نیاز (اور) قابلِ تعریف

ہیں ﴿۸﴾ بھلا تم لوگوں کو ان کے حالات کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے قوم نوحؑ اور عاد اور ثمود کی اور جو اِن کے بعد ہوئے، ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر دلائل لے کر آئے تو ان قوموں نے اپنے ہاتھ ان کے مونہوں پہ رکھ دیے اور کہنے لگے کہ ہم تو تمہاری رسالت (جو حکم دے کر بھیجا گیا ہے) کے منکر ہیں اور جس امر کی جانب آپ ہم کو بلاتے ہو بے شک ہم اس میں بڑے شبہ میں ہیں ﴿۹﴾ ان کے پیغمبروں نے فرمایا کہ (تم کو) اللہ کے بارے شک ہے جو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ہیں۔ وہ تم کو بلا رہے ہیں کہ تمہارے گناہ معاف فرمائیں اور وقت مقررہ تک تم کو (خیر و خوبی سے) مُہلت دیں۔ انہوں نے کہا تم محض ہماری طرح کے آدمی ہو۔ جن چیزوں کو ہمارے بڑے پوجتے رہے ہیں تم ہمیں ان سے روکنا چاہتے ہو، سو کوئی واضح دلیل (معجزہ) لاؤ ﴿۱۰﴾ ان کے پیغمبروں نے ان سے فرمایا (ہاں) ہم تمہارے ہی جیسے آدمی ہیں ولیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں احسان (نبوت عطا) فرماتے ہیں اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر تم کو (جو تم چاہو) معجزہ دکھا سکیں اور اللہ ہی پر سب ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے ﴿۱۱﴾ اور ہم اللہ پر بھروسہ کیوں نہ رکھیں اور یقیناً اس نے ہمیں ہمارے (دونوں جہانوں کے فائدے کے) راستے بتا دیے اور جو تکلیفیں تم ہم کو دیتے ہو ہم اس پر ضرور صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے ﴿۱۲﴾

تفسیر و معارف

قانونِ فطرت:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ(۷) اللہ تعالیٰ جو سب کے پروردگار ہیں، ربّ ہیں اپنے بندوں کو فطرت کے طے شدہ قانون سے آگاہ فرما رہے ہیں کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ

لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ اگر تم شکر کرو گے تو میں اپنی نعمتیں تم پر بڑھا دوں گا۔ اور زیادہ عطا کروں گا۔

شکر کیا ہے؟

شکر کیا ہے اور کیسے کیا جائے؟ اس سوال پر بہت سی بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ یہ ایک سوچ ہے، ایک اندازِ فکر ہے، ایک کیفیت ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اس کی بنیاد عمل ہے۔ فکر اور سوچ کا انداز بعد میں آتا ہے، عمل پہلے آتا ہے، شکر کی اساس انسانی کردار ہے۔ حقیقتِ شکر یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت پورے خلوص سے کی جائے۔ اور یہ اطاعت عقائد ونظریات سے لے کر اعمال وکردار پر محیط ہو۔ اطاعت تب ہوتی ہے جب سب سے پہلے عقیدہ درست ہو کیونکہ عمل کی بنیاد عقیدہ ہوتا ہے اور جیسا عقیدہ ہو، ویسا ہی عمل ہوگا۔ تو شکر یہ ہے کہ عقیدہ، اعمال، کردار سب درست ہوں۔ صرف زبان سے کہنا کہ 'اللہ کا شکر ہے' اور عملاً نافرمانی کرنا گستاخی ہے۔ اللہ کا شکر، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی مخلص اور بھرپور کوشش کے ساتھ اطاعت کا نام ہے اور پھر اگر بتقضائے بشریت غلطی ہو جائے تو اللہ کی رحمت بخشش کے لیے کافی ہے۔

شکر پر انعام:

پروردگارِ عالم نے مطلع فرما دیا، لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تم پر اپنی نعمتیں زیادہ کر دوں گا۔ اگر تم اپنا عقیدہ وکردار درست کرو گے، خلوص سے اطاعت کرو گے تو تمہیں ترقیٔ درجات بھی نصیب ہو گی اور دنیوی نعمتیں بھی نصیب ہوں گی۔ نعمت میں زیادتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ کریم کی طرف سے کسی بہت بڑی پریشانی کو ٹال کر کوئی چھوٹی سی پریشانی بھیج دی جاتی ہے تو شکر گزار بندوں کے لیے پریشانی بھی نعمت ہوتی ہے۔

تصوف میں بھی ترقی کا یہی نسخہ ہے:

تصوف وراہِ سلوک میں بھی ترقیٔ درجات کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔ یعنی عقیدے وکردار کی درستگی اور خلوص سے عمل کرنا۔ ہر سالک کی تمنا ہوتی ہے کہ اسے ترقیٔ درجات نصیب ہو۔ اعلیٰ درجات ومقامات نصیب ہوں۔ یہ تمنا رکھنا تو اچھی بات ہے لیکن اس کی تکمیل کے لیے اطاعتِ الٰہی اور عبادات شرط ہیں۔ حلال کھائے، سچ بولے، فرائض، واجبات وسنن اپنے اپنے وقت پر ادا کرے اور اطاعت میں سرگرداں رہے۔

وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ (۷) اگر تم ناشکری کرو گے، نعمتوں کی ناقدری کرو گے، عقائد میں خرابی لے آؤ گے یا کردار میں خرابی لے آؤ گے تو میرا عذاب بھی بہت شدید ہے۔ بعض اوقات عقیدہ درست بھی ہوتا ہے لیکن کردار درست نہیں ہوتا تو یہ بات بھی مصیبت کا سبب بن جاتی ہے۔

اللہ کریم کا عفو و درگزر:

اللہ کریم ایسے غفور و رحیم ہیں کہ یہاں تاکیداً نہیں فرمایا، وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ کہ اگر تم کفر کرو گے تو میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا، بلکہ یہ فرمایا، میرا عذاب بھی بہت سخت ہے۔ اس میں بھی ایک گنجائش رکھی ہے کہ وہ چاہے تو بڑی سے بڑی خطا معاف کر دے۔ اللہ کریم نے شکر گزاری پر تو انعامات میں زیادتی کو یقینی رکھا ہے، نعمتوں میں اضافہ کو لازمی قرار دیا ہے۔ لیکن ناشکری پر، نافرمانی پر یہ متنبہ کر دیا ہے کہ میرے عذاب شدید ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ ضرور عذاب دوں گا۔ یہ اس کا کرم ہے، اس کی رحمت ہے کہ وہ چاہے تو اپنے بندوں کو بخش دے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے۔

فرمایا، وَقَالَ مُوۡسٰٓى اِنۡ تَكۡفُرُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيۡدٌ (۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر تم لوگ عظمتِ الٰہی کا انکار کر دو، کفر اختیار کرو اور صرف تم ہی نہیں سارے جہاں کے لوگ بھی اگر کفر کا راستہ اختیار کر لیں تو عظمتِ الٰہی پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ نقصان لوگوں کا ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ غنی ہے۔ اس کی عظمت کسی کے ماننے کی محتاج نہیں ہے۔ ہاں جو مان لے اس کا اپنا بھلا ہے۔ جو انکار کر دے، وہ خسارے میں ہوگا۔ اس کی عظمت تمہارے اقرار کی محتاج نہیں ہے۔ لَغَنِىٌّ حَمِيۡدٌ وہ غنی ہے محتاج نہیں ہے اور سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں۔

تاریخ بہترین استاد ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ تمہارے سامنے تاریخِ انسانی بکھری پڑی ہے۔ کیا تم نے پہلی قوموں کے احوال نہیں سنے، کیا تم تک ان کی خبریں نہیں پہنچیں؟ تم سے پہلے بھی بہت سی ایسی قومیں گزری ہیں جنہوں نے ناشکری کی اور ناشکری بھی حد سے زیادہ کی تو ان سب کا کیسا برا انجام ہوا۔ کیا تم یہ سب نہیں جانتے؟ اور پھر بھی تم ناشکری کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہو؟ جن لوگوں نے انبیاءؑ سے جھگڑے کیے، حق کو قبول کرنے سے انکار کیا، جیسے قومِ نوح، عاد اور ثمود، تم نے سنا کہ ان کا کیا حشر ہوا؟ تم تک ان کی تاریخ تو پہنچی ہے کہ نوحؑ کی قوم، ہودؑ کی قوم کا کیا حشر ہوا۔ قوم عاد میں بڑے بڑے کڑیل جوان تھے، مگر اُن پر کیا بیتی؟ اور

یہی نہیں کہ جن کی تاریخ ہم تک پہنچی وہی لوگ تھے، بلکہ بے شمار اقوام تھیں جو تاریخ کی تہوں میں دفن ہوگئیں وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ان کے بعد بھی بہت سے لوگ تھے۔ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جن کا اب نام ونشان بھی نہیں اور آج اللہ کے سوا کوئی بھی انہیں نہیں جانتا۔ اپنے دور میں وہ بھی بڑی شان والے ہوں گے، بہت طاقتور ہوں گے، صاحب اقتدار ہوں گے لیکن زمانہ انہیں تہہ خاک کرگیا۔ کوئی بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کون لوگ تھے، کیسے تھے، اوران پر کیا بیتی؟ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَیْدِیَهُمْ فِیْٓ اَفْوَاهِهِمْ ان کے پاس بھی اللہ نے رسولؑ بھیجے رُسُلُهُمْ جو اُن کی طرف مبعوث ہوئے۔ گویا ہر قوم میں سے اس ہی قوم کے فرد کو اللہ نے رسولؑ مبعوث فرمایا۔ بِالْبَیِّنٰتِ اور انہیں بہت ہی واضح دلائل عطا کیے۔ انہیں معجزات، کتاب، صحائف اور دلائل عطا فرمائے۔ اور ہر نبیؑ، ہر رسولؑ نے احکامِ الٰہی مخلوق تک پہنچائے، یہی اُن کا منصبِ رسالت تھا۔ ان نافرمان بھولی بسری قوموں کا رویہ اپنے انبیاءؑ ورسلؑ کے ساتھ ایسا تھا فَرَدُّوْٓا اَیْدِیَهُمْ فِیْٓ اَفْوَاهِهِمْ جیسے انہوں نے انبیاء کے دہنِ مبارک پر بھی ہاتھ رکھ دیا ہو۔ یعنی نہ صرف یہ کہ ان کی بات نہ مانی بلکہ ان کی تبلیغ میں بھی رکاوٹ ڈالی اور حق کا راستہ روکنے میں اپنی تمام قوتیں صرف کردیں۔ ان کا سارا زور اس بات پر لگ گیا کہ انبیاء کی بات کسی تک نہ پہنچے۔ کہنے لگے، اِنَّا کَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ کہ آپ جو چیز لائے ہیں ہمیں اس سے انکار ہے۔ آپ جو پیغام لائے ہیں ہم اس کے منکر ہیں۔

کہنے لگے، وَاِنَّا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ(۹) ہمیں تو آپؑ کے نبی ہونے میں ہی شک ہے۔ ہمیں تو اس بات پر ہی شک ہے کہ آپ کو اللہ نے بھیجا ہے اور جو بات آپ کررہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بلکہ ہمارا یہ خیال ہے کہ یہ سب آپ نے خود سے گھڑ لیا ہے اور اس کے پیچھے ضرور آپ کے ذاتی مقاصد ہیں۔ آپ خود کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ آپ قیادت ورتبہ چاہتے ہیں اور ہمیں اپنا زیرِ نگیں کرنا چاہتے ہیں تو ہم نہ صرف یہ کہ آپ کا انکار کرتے ہیں بلکہ یہ شک کرتے ہیں کہ آپ کا مقصد نیک نہیں۔ بلکہ آپ اللہ کے نبی ہی نہیں ہیں۔

کلامِ الٰہی میں شک ذاتِ الٰہی میں شک ہے:

قَالَتْ رُسُلُهُمْ انبیاء نے جواباً کہا، اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ تمہیں اللہ کے ساتھ شک ہے؟ جو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ہیں۔ اللہ کے پیغام میں شک کرنا اس کی ذات میں شک کرنے کے مترادف ہے۔ بات کا انکار صرف بات تک نہیں رہتا بلکہ وہ کہنے والے کی ذات تک جاتا ہے۔

اگر کوئی کسی کو یہ کہے کہ جو بات تم کہہ رہے ہو جھوٹ ہے تو گویا اس نے کہنے والے کو صاف صاف جھوٹا کہا ہے۔ تو انبیاء نے حیران ہو کر کہا کہ تم ایسے بدبخت ہو کہ اللہ کی ذات پر شک کر رہے ہو حالانکہ وہ لوگ پیغامِ الٰہی پر شک کر رہے تھے۔ لیکن انبیاء نے فرمایا کہ پیغام میں شک کرنا پیغام بھیجنے والے کی ذات میں، اس کی عظمت میں شک کرنا ہے۔ جب کہ وہ ذات ایسی عظیم ہے کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جو کل کائنات کا خالق ہے، جس کی عظمت کی گواہی کائنات کا ہر ذرہ دے رہا ہے، تمہیں اس ذات میں شک ہے!

اُس کی تخلیق کی وسعتوں کی کوئی حد نہیں۔ تم تو زمین کے راز بھی پوری طرح نہ جان سکے، وہ تو آسمانوں کا بھی خالق ہے۔ ہر قوم نے اپنے زمانے میں یہی سمجھا کہ شاید ہم نے بہت کچھ پالیا لیکن بعد میں آنے والے ان سے بھی زیادہ پا گئے۔ آج تک یہی عالم ہے کہ کل تک جو انسانی علوم کی حد تھی، آج اس سے زیادہ ہو چکی ہے، کل اور بڑھ جائے گی۔ لیکن کائنات کی حقیقتیں، زمین اور فضاؤں میں جو کچھ ہے، ان کے اسرار کی کوئی انتہا نہیں اور اللہ کی شان ہے کہ وہ ان سب کا خالق ہے۔ اس نے عدم سے ان چیزوں کو وجود بخشا۔ وہ ساری کائنات کا خالق ہے۔ ہر چیز سے ہر لمحہ آگاہ ہے کہ اس نے خود بنائی ہے۔ اور تم ایسے نادان ہو اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ کہ اس عظیم خالق، پروردگارِ عالم کی ذات میں شک کر رہے ہو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا، وجود عطا کیا، عقل و شعور دیا، احساسات دیے۔ اور اتنا کریم ہے، تمہارے پاس اپنے انبیاء بھیجے، کتابیں بھیجیں اور ان سب احسانات سے اس ذاتِ کریم کا مقصد کیا تھا؟ یَدۡعُوۡکُمۡ لِیَغۡفِرَ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَیُؤَخِّرَکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وہ تمہیں اپنی بارگاہ میں بلا رہا ہے، تاکہ تم اپنی خطائیں اس کریم کی بارگاہ میں لے آؤ اور اس سے مغفرت اور بخشش لے لو۔ وہ تمہیں اپنے کام کے لیے نہیں بلا رہا کہ تمہارے آنے سے اس کا کوئی کام ہو جائے گا۔ وہ غنی ہے، اسے کسی سے کچھ لینا نہیں ہے۔ وہ تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اگر تم یا تمہارے باپ دادا بھٹک گئے تو اللہ نے نبیؐ و رسولؐ بھیجا کہ تمہیں واپس اس کی بارگاہ میں لے جائیں تاکہ تم اپنی خطاؤں سے توبہ کرو، اپنا عقیدہ درست کرو اور اپنے اعمال کی اصلاح کرو۔ لِیَغۡفِرَ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ تاکہ وہ کریم تمہاری ساری خطائیں، سارے گناہ معاف کر دے۔ وَیُؤَخِّرَکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی اور تم دُنیا میں اپنی طبعی عمر پوری کر سکو۔ ورنہ جس کردار کے تم حامل ہو، کفر پر مصر ہو اور جن برائیوں میں ملوث ہو تم پر تو قضا مسلط ہو جاتی۔ جس طرح پہلی قومیں اپنی طبعی عمر پوری کرنے سے پہلے غرق ہو گئیں، اُن پر آگ اور پتھر برسائے گئے اگر تمہاری روش بھی وہی رہی تو تمہاری بھی دُنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ تو وہ کہنے لگے، قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا

بھئی! آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ آپ ہماری طرح کے انسان ہیں۔ آپ کو بھی بھوک لگتی ہے، کھاتے پیتے ہیں، نیند آتی ہے۔ آپ کے بھی بیوی بچے ہیں، بازاروں میں گلیوں میں آپ چلتے پھرتے ہیں تو جیسے ہم میں ویسے ہی آپ ہیں تو آپ رسول کیسے ہو سکتے ہیں؟

نبیؐ کی نبوت کا انکار یا بشریت کا انکار، برابر ہے:

گویا انہوں نے نبیؐ کی نبوت کا انکار اس لیے کر دیا کہ وہ آپ ﷺ کو اپنے جیسا عام بشر سمجھتے تھے یعنی اس کی بشریت کا تو اقرار کر لیا لیکن نبوت کا انکار کر دیا کہ آپ ہماری طرح کے انسان ہیں۔ اگر آپ اللہ کے رسول ہوتے تو انسانوں سے بالاتر کوئی مخلوق ہوتے، فرشتوں کی طرح کوئی نُوری مخلوق ہوتے۔

اس انکار کا دوسرا پہلو یہ ہے، جو آج کے دور میں ماننے والوں میں گمراہی پھیل گئی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو نبی تو مانتے ہیں، نبوت کا اقرار کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ نبیؐ بشر نہیں نُور ہوتا ہے۔ نبیؐ کی نبوت کا انکار کیا جائے یا بشریت کا، دونوں برابر ہیں۔ اللہ کی ساری مخلوق میں صرف انسان وہ مخلوق ہے جسے معرفتِ الٰہی کی استعداد بخشی گئی ہے۔ ان میں سب سے اعلیٰ انبیاءؑ ہیں۔ انبیاءؑ ہی میں سے رسولؑ ہوتے ہیں۔ نبوت کا انکار، رسالت کا انکار ہے۔ پتا نہیں ہم انبیاءؑ کی بشریت کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ دراصل ہم اپنی ذات پر قیاس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم بشر ہیں تو رسولؑ تو ہمارے جیسا نہیں ہونا چاہیے، انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں بشریت صرف شکل وصورت سے نہیں بلکہ عقائد وکردار کی درستگی کے سبب سے ہے۔ اگر اس کے عقائد یا اعمال درست نہیں ہیں تو قرآن تو اسے بشر تسلیم ہی نہیں کرتا، بلکہ فرماتا ہے، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ وہ تو چوپائے کی طرح ہے، شکل وصورت تو انسانی ہے مگر جانوروں جیسا ہے بلکہ بَلْ هُمْ اَضَلُّ جانوروں سے بھی گیا گزرا۔ اس لیے کہ جانوروں کو تو معرفتِ الٰہی کی فطری استعداد نہیں دی گئی جبکہ انسان کو عطا ہوئی اور وہ اسے ضائع کر کے جانوروں کے معیار پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ پیٹ بھر لینا، گھر بنا لینا، بچے پال لینا۔ یہ سارے کام تو جانور بھی کر لیتے ہیں تو اللہ کریم نے جسے شرفِ انسانیت عطا کیا، وہ نبوت کا انکار کر کے جانوروں کی طرح بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہو گئے۔ ہم خود کو بشر مانتے ہوئے، نبیؐ کی بشریت کا انکار کر دیتے ہیں۔

معیارِ بشریت:

حق تو یہ ہے کہ بشریت کا معیار اللہ کا نبیؑ ہوتا ہے۔ نبیؑ خیر البشر ہوتا ہے، نبیؑ جیسا کوئی دوسرا بشر نہیں ہوتا، گو وہ اولادِ آدمؑ میں سے ہی ہوتا ہے، انسان ہوتا ہے۔ باقی انسان جتنی عادات نبیؑ کی اپنا لیں، اپنی حیثیت کے مطابق جتنے خلوص سے نبیؑ سے وابستہ ہو جائیں، اتنی بشریت اُن میں آ جاتی ہے۔ اور جتنا کردار نافرمانی کا اپناتے ہیں، جتنے دور ہوتے ہیں اتنی حیوانیت اُن میں رہ جاتی ہے۔ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا کہنے لگے آپؑ تو ہماری ہی طرح کے بشر ہیں اور ہم نے یہ اخذ کیا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۰) کہ آپ لوگ ہمیں اس روش پر چلنے سے روکنا چاہتے ہیں جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے رہے۔ ہم بتوں کی پوجا چھوڑ دیں، باپ دادا کی رسومات چھوڑ دیں، اپنے طرز حیات کو یکسر بدل دیں۔ جن چیزوں کی ہم پیروی کرتے ہیں ان کو چھوڑ کر آپؑ کی پیروی شروع کر دیں تو گویا آپؑ ہم سب کے پیشوا بن جائیں اور ہم آپؑ کی رعیت بن جائیں؟ آپؑ کی بات ماننے کا تو مطلب یہ ہے کہ حکومت واقتدار آپؑ کو مل جائے گا اور ہماری حیثیت محض رعیت والی ہو گی۔ آپؑ ہم سے باپ دادا کی رسومات چھڑوا کر ہم پر مسلط ہونا چاہتے ہیں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۱۰) پھر کوئی واضح دلیل، کوئی معجزہ دکھائیے۔ جیسا ہم کہیں ویسا ہی معجزہ ظاہر کریں۔ انبیاءؑ نے، رسلؑ نے جواب دیا قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ہم بھی تمہاری طرح انسان ہیں۔ ہم تمہیں عجائبات دکھانے نہیں آئے، نہ ہی عجائبات دکھا کر تم پر اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں، البتہ ہم میں یہ بہت بڑا فرق ہے کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ہمیں اللہ نے اپنے بندوں میں سے چن لیا ہے، ہم پر یہ احسان فرمایا ہے کہ ہمیں رسولؑ مبعوث کیا ہے جبکہ تم لوگ گمراہ ہو چکے ہو۔ فریضۂ رسالت یہ نہیں ہے کہ ہم عجائبات دکھاتے پھریں۔ ہم اللہ کے رسولؑ ہیں اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کا پیغام، جو وہ اپنی مخلوق تک پہنچانا چاہتا ہے، اسے اللہ کی بارگاہ سے وصول کریں اور اسے اللہ کی مخلوق تک پہنچائیں۔

باقی مخلوق میں یہ استعداد نہیں ہوتی کہ وہ براہ راست کلامِ الٰہی وصول کرے۔ ہماری تو سماعت بھی اتنی محدود ہے کہ ہم ساری مخلوق کی آواز نہیں سن سکتے۔ بہت سے جانوروں کی آواز تو سن لیتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کا مطلب

کیا ہے اور بے شمار جانور ایسے ہیں جن کی ہم آواز بھی نہیں سن سکتے۔ امریکہ کی ایک ریاست میں جنگلی جانور، ہرن وغیرہ بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ شام ڈھلتے ہی وہ شہروں کی سڑکوں پر بھی کثرت سے نظر آتے ہیں تو چونکہ انہیں کوئی مارتا نہیں اس لیے گاڑیوں میں ایسے ہارن لگائے جاتے ہیں جو گاڑی کے سٹارٹ ہوتے ہی بجنا شروع کر دیتا ہے اور بند ہونے تک بجتا رہتا ہے، وہ کسی انسان کو سنائی نہیں دیتا لیکن ان جانوروں کو دور سے سنائی دیتا ہے اور وہ راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ تو ہماری قوتِ سماعت تو بہت سی سامنے کی چیزوں کو وصول کرنے سے قاصر ہے۔ بے پناہ اللہ کے فرشتے زمین پر پھرتے ہیں، ہم نہ تو ان کو دیکھ سکتے ہیں، نہ اُن کی بات سن سکتے ہیں تو پھر ارشادِ الٰہی کو سننے کے لیے کیا کیفیت چاہیے؟ اب سماعت میں اتنی نزاکت، اتنی لطافت ہو، اتنی نُورانیت ہو کہ وہ فرشتوں سے بھی زیادہ مضبوط ہو جائے اور براہ راست کلامِ الٰہی سنے، فرمایا یہ نعمت صرف نبیؑ کو عطا ہوتی ہے اور اس کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ نعمت دی۔ ہمارا کام عجائبات دکھا کر اپنی دھاک بٹھانا نہیں ہے جو پیغام ہم نے اللہ سے وصول کیا ہے، اسے تم تک پہنچانا ہی ہمارا منصب ہے اور معجزات اللہ کا فعل ہے، جب وہ چاہے، دکھا دے۔

معجزہ:

معجزہ اللہ کا فعل ہے اور نبیؑ کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے صادر ہوتا ہے اور دین کی سربلندی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ اس کے دستِ قدرت میں ہے کہ وہ چاہے تو معجزہ بھی دکھا دے۔

کرامت:

ولی کی کرامت اللہ کا فعل ہوتا ہے، جو کرامت کے طور پر ولی کے ہاتھ پر صادر ہوتی ہے لیکن باتباع نبیؑ صادر ہوتی ہے۔ گویا ولی کی کرامت دراصل نبیؑ کا معجزہ ہوتی ہے، جو نبیؑ کے اتباع کے انعام کے طور پر اسے نصیب ہوتی ہے۔ نبیؑ کا معجزہ کرامت کے طور پر ولی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے۔ اب یہ خالصتاً اللہ کے دستِ قدرت میں ہے کہ یہ معجزہ یا کرامت کب ظاہر ہوں۔ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنۡ نَّاۡتِيَكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ انہوں نے فرمایا کہ تم جو فرمائش کر رہے ہو، اس کو پورا کرنا ہمارے فرائضِ منصبی میں داخل نہیں ہے۔ ان کا صدور اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اللہ نے ہم پر جو احسانِ عظیم کیا ہے کہ ہمیں وہ طہارت ولطافت عطا کی ہے جس کے سبب ہم اس کا کلام براہِ راست سن سکتے ہیں اور پھر ہمیں نسلِ انسانی میں رکھا تا کہ انسان ہم سے مستفید ہو سکیں تو ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم اللہ کی باتیں سنیں اور تمہیں سنائیں۔ اس کا پیغام تم تک پہنچائیں۔ ہمارا کام یہ

نہیں ہے کہ ہم معجزات دکھائیں ہاں! یہ اس کا اپنا کام ہے کہ اگر وہ تمہاری ہدایت کے لیے کوئی معجزہ دکھانا چاہے تو ہمارے ہاتھ پر صادر کر دے گا۔ اس میں ہماری مرضی کو دخل نہیں ہے۔ یہ اللہ کی پسند ہے، اس کا فعل ہے، اگر وہ تمہیں کوئی دلیل دکھا کر ہدایت دینا چاہے تو وہ قادر ہے۔

توکّل:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۱) اور ایمان کا تقاضا ہوتا ہے کہ مومن اللہ پر بھروسہ کرے۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ بعض لوگ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے توکل کیا ہوا ہے، یہ توکل نہیں ہے۔ دوسری طرف بعض لوگ اسباب اختیار کرتے ہیں اور اسباب پر بھروسہ کر لیتے ہیں کہ مثلاً یہ جو سفارش کرائی ہے تو میرا کام ہو جائے گا یا یہ رشوت دی ہے، اس سے میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ یہ دونوں رویے غلط ہیں، یہ دونوں توکل نہیں ہیں۔

توکل یہ ہے کہ جو کام آپ کرنا چاہیں، اس کے لیے جتنے جائز اسباب آپ کی دسترس میں ہیں، جو بھی بس میں ہیں انہیں اختیار کریں اور نتیجہ اللہ کے سپرد کریں۔ یہ یقین ہو کہ اس کا نتیجہ صرف اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ اس کا انتظار کریں۔ انسان یہ سوچے کہ میں محنت کرنے کا مکلّف تھا، دن بھر مزدوری کی، اب وہ کتنا رزق دیتا ہے، جو وہ دیتا ہے وہ میرے نصیب کا ہے۔

تو انبیاءؑ فرماتے ہیں ہم اللہ پر توکّل کرتے ہیں یعنی ہم تم تک بات پہنچاتے ہیں، یہ ضروری ہے۔ اب اس محنت کا کیا نتیجہ نکلتا ہے، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔ وہ اللہ کا اپنا کام ہے۔ وہ تمہیں ہدایت دے تو ہدایت پا جاؤ گے، نہ دے تو گمراہ رہ جاؤ گے۔ تم سب مسلمان ہو جاؤ تو ہماری شان میں اضافہ نہیں ہو گا، یا سب انکار کر دو تو ہماری عظمت میں کمی نہیں آئے گی۔ ہمارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا بھلا ہم، انبیاءؑ و رسلؑ کی جماعت اللہ پر بھروسہ کیسے نہ کریں، ہم ہی تو وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے حقیقی ہدایت کے راستوں سے آشنا کر دیا ہے، اور ہم ہی تو ہیں جو دوسروں کی ہدایت اور راہنمائی کا سبب بن رہے ہیں تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں! اب رہی یہ بات کہ تم مخالفت کرو گے اور ہمیں ایذا دو گے، ہمارے ساتھ دشمنی کرو گے تو وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہم صبر کریں گے، برداشت کریں گے۔ اس کی رضا کے لیے صبر کریں گے۔ تم ہمارے دشمن نہیں ہو، بلکہ تمہاری یہ دشمنی اللہ سے ہے۔

اہل اللہ سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے:

انبیاءؑ سے جو عداوت رکھتا ہے، دشمنی رکھتا ہے وہ دراصل اللہ سے دشمنی کر رہا ہوتا ہے کیونکہ نبیؑ کسی پر اپنی ذاتی بات مسلط نہیں کرتا بلکہ اللہ کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچاتا ہے۔ جو دشمنی کر رہا ہے، وہ اللہ سے کر رہا ہے۔ اب اگر تم نے اللہ سے دشمنی مول لے لی ہے اور اس میں ہمیں کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو وَ لَنَصۡبِرَنَّ عَلٰی مَاۤ اٰذَیۡتُمُوۡنَا تمہاری طرف سے ایذا پہنچ رہی ہے ہم اسے تو برداشت کریں گے، اس پر صبر کریں گے۔ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ (۱۲) اور توکل کرنے والے، بھروسہ کرنے والے تو اللہ پر ہی بھروسہ کریں گے۔ ہمارا بھروسہ اللہ جل شانہٗ پر ہے اور ہم تمہاری ایذاؤں پر صبر کریں گے۔ تمہارا کردار تمہارے ساتھ ہے، ہمارا کردار ہمارے ساتھ ہے۔ ہم اللہ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، وہ ہمیں اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ تم اللہ سے دشمنی کر رہے ہو، اس کا تمہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

سورۃ ابراہیم رکوع 3 آیات 13 تا 21

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۟ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

اور کافر لوگوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تم کو ضرور اپنے ملک سے نکال دیں گے یا ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ۔ پس ان (پیغمبروں) پر ان کے پروردگار نے وحی فرمائی کہ ہم ضرور ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے ﴿۱۳﴾ اور ضرور آپ

لوگوں کو ان کے بعد زمین میں آباد کر دیں گے۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جو میرے سامنے (قیامت کے روز) کھڑا ہونے سے ڈرے اور میرے عذاب سے خوف کھائے ﴿۱۴﴾ اور انہوں (انبیاءؑ) نے فتح چاہی اور ہر سرکش ضد کرنے والا نامراد رہ گیا ﴿۱۵﴾ اور اس کے پیچھے دوزخ ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا ﴿۱۶﴾ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیے گا اور (گلے سے) آسانی سے نہ اتار سکے گا اور ہر طرف سے اس پر (سامانِ) موت کی آمد ہوگی مگر وہ مرے گا نہیں اور اس کے پیچھے اور سخت عذاب کا سامنا ہوگا ﴿۱۷﴾ جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا ان کی حالت عمل کے اعتبار سے یہ ہے کہ جیسے کچھ راکھ ہو جس کو تیز آندھی کے دن میں تیز ہوا اڑا لے جائے (اسی طرح) جو کام وہ کرتے رہے ان کا کوئی فائدہ ان کو حاصل نہ ہوگا (بلکہ راکھ کی طرح اڑ جائے گا) یہی بہت دور کی گمراہی ہے ﴿۱۸﴾ (اے مخاطب!) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک پیدا فرمایا ہے اگر وہ چاہیں تو تم سب کو فنا کر دیں اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق پیدا فرما دیں ﴿۱۹﴾ اور یہ اللہ کو کچھ بھی مشکل نہیں ﴿۲۰﴾ اور (قیامت کے دن) سب لوگ اللہ کے روبرو کھڑے ہوں گے پھر چھوٹے درجہ کے لوگ (عوام) بڑے درجہ کے لوگوں (یعنی متکبرین، لیڈروں) سے کہیں گے کہ بے شک ہم تمہارے تابع تھے کیا تم اللہ کے عذاب میں سے کچھ بھی ہم سے دور کر سکتے ہو؟ وہ کہیں گے اگر اللہ ہم کو ہدایت فرماتے تو البتہ ہم تم کو ہدایت کرتے اب تو ہم سب کے لیے برابر ہے کہ ہم گھبرائیں یا ہم صبر کریں ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ﴿۲۱﴾

تفسیر ومعارف

کفر ایسی جہالت ہے جو انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اسی لیے کفار نے انبیاءؑ کا ہمیشہ انکار کیا۔ فرمایا جارہا

ہے کہ اسی اندھے پن کا شکار ہو کر کافروں نے کہا وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ یا تو ہمارے دین میں واپس آ جاؤ یا ہم تمہیں اپنے شہروں سے، اپنی زمین سے، اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ پس ان کے پروردگار نے اپنے انبیاء پر وحی فرمائی کہ ایسے ظالموں کو اب ہم تباہ کر دیں گے۔

ولایتِ انبیاءؑ:

تمام انبیاءؑ پیدائشی طور پر نبیؑ ہوتے ہیں۔ ازل سے یہ ہستیاں منتخب اور برگزیدہ ہوتی ہیں۔ اللہ کا کوئی نبیؑ پیدائش سے لے کر بعثت تک کسی نافرمانی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ انہیں ولایت کا ایک خاص درجہ نصیب ہوتا ہے جو صرف انہی کا خاصہ ہے۔ انبیاءؑ جب تک مبعوث نہیں ہوتے۔ اللہ کی طرف سے اعلانِ نبوت کا حکم نہیں آتا، ان پر احکام نازل نہیں ہوتے کہ لوگوں تک پہنچائے جائیں، تب تک وہ تبلیغ نہیں کرتے۔ لیکن پیدائش سے بعثت تک کا زمانہ ان کی پاکیزگی کردار کا گواہ ہوتا ہے۔ اعلانِ نبوت سے پہلے بھی جو پاکیزگی، طہارت، قربِ الٰہی کی تمنا، نیکی وسچائی جو انبیاءؑ کے کردارِ عالی میں ہوتی ہے، اسے نبیؑ کی ولایت کہتے ہیں۔ یعنی ہر نبیؑ کو بعثت سے پہلے ولایت کا ایک خاص درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو صرف نبیؑ کے لیے ہوتا ہے، غیر نبی کو نصیب نہیں ہوتا۔ اسی لیے اللہ کریم نے حضور ﷺ کی قبلِ بعثت کی زندگی کی قسم کھائی ہے۔ اور اسے حضور ﷺ کی نبوت پر گواہ ٹھہرایا ہے۔ امتیوں کو جو ولایت نصیب ہوتی ہے، باتباعِ نبیؑ ہوتی ہے۔ نبیؑ کے خادموں میں شامل ہو کر نصیب ہوتی ہے۔ نبیؑ کی ولایت اور ولی کی ولایت میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا خود نبیؑ اور ولی میں ہے۔ نبیؑ کی شان بہت بلند، ارفع واعلیٰ ہوتی ہے۔ اور ولی کی ولایت، نبیؑ پر ایمان لانے، انؑ کے احکام کو دل وجان سے قبول کرنے، نبیؑ کی غلامی اختیار کرنے اور اتباع کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔

کفر کا نتیجہ:

کافر اتنے عقل کے اندھے اور جاہل ہیں کہ جب نبیؑ نے اعلانِ نبوت فرمایا تو انہوں نے نبیؑ کی گزشتہ زندگی پر غور ہی نہیں کیا کہ انؑ کا کردار تو ان لوگوں سے یکسر الگ تھا۔ نہ انہوں نے کبھی بتوں کی پوجا کی، نہ جھوٹ بولا، نہ کسی اور غلط کام میں ملوث ہوئے۔ انہی لوگوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے پاکیزگی کردار کا اعلیٰ نمونہ رہے۔ جب تک انہوںؑ نے اعلانِ نبوت نہیں کیا، یہ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ یہ بھی ان ہی کے مذہب کے پیروکار ہیں۔ جب انہوں نے اعلان نبوت فرمایا، تب انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے تو کوئی نئی بات گھڑ لی ہے۔

کفر کا اندھا پن یہ ہے کہ جس چیز کو نبوت کی حقانیت کی دلیل بننا چاہیے تھا، (نبیؐ کی قبل بعثت کی زندگی) وہی چیز اُن کی نبوت کی مخالفت کی بنیاد بن گئی۔ اور انہوں نے انبیاءؑ سے کہا کہ یا تو ہمارے دین میں واپس آ جاؤ، یا ہم تمہیں اپنے شہروں، آبادیوں سے باہر نکال دیں گے۔

کفر کی کوئی بنیاد نہیں:

کفر محض گمراہی ہے۔ کفر میں کوئی حدود و قیود نہیں، کوئی ضابطے قاعدے نہیں، کوئی بنیاد نہیں۔ ہندومت کی ایک معروف شخصیت کا قول ہے کہ ایک مرتبہ یہ مذہب (ہندومت) اختیار کرلو پھر جو چاہو کرتے رہو، ہندومت سے خارج نہیں ہوگے۔ کفر کی چونکہ کوئی بنیاد ہی نہیں تو اس کی حدود و قیود کیا ہوں گی!

سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ متحدہ ہندوستان کے زمانے میں ایک جگہ تقریر فرما رہے تھے، تو ایک ہندو نے پرچی پر ایک اعتراض لکھ کر بھیجا کہ ہم ہندوؤں کے ہاں جب شادی ہوتی ہے تو پھر طلاق وغیرہ کا کوئی تصور نہیں۔ آپ لوگوں کی طرح ہمارے ہاں نکاح ٹوٹتا نہیں ہے لہٰذا ہندومت بہتر ہے۔

شاہ صاحب نے پرچی پڑھ کر قریب بیٹھے شخص سے فرمایا کہ کوئی دھاگہ لے آؤ، کسی نے دھاگہ پکڑا دیا۔ فرمایا، ایک چاقو لاؤ۔ چاقو فراہم ہوگیا۔ فرمایا، اس دھاگے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑو۔ پھر آپ نے دھاگے کو درمیان سے کاٹ دیا۔ مجمع سے پوچھا کہ دھاگہ کٹ گیا؟ ہجوم نے اقرار کیا۔ پھر اسی شخص سے کہا اب اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں کھڑے رکھو گویا تم نے دھاگہ پکڑ رکھا ہے۔ پھر درمیان میں بار بار چاقو چلایا، اور مجمع سے پوچھا کیا کچھ کٹ گیا ہے؟ لوگوں نے کہا کچھ ہے نہیں تو کٹے گا کیا؟ اس پر آپؒ نے اس معترض سے فرمایا تمہارے ہاں نکاح ہوتا ہی نہیں تو طلاق کہاں سے ہونی ہے؟ کوئی چیز ہوگی تو ٹوٹے گی۔ کسی چیز کا وجود ہوگا تو وہ سلامت رہے گی، یا ٹوٹے گی۔ جب کچھ شئے ہے ہی نہیں تو ٹوٹنا کیا؟ اسی بات کی وضاحت کی جارہی ہے کہ کفر کی کوئی بنیاد نہیں۔ اسی لیے کافر حق کا انکار کرتے رہے۔

نبیؑ کا انکار اور نبیؑ کی مخالفت:

جب اللہ کا نبیؑ مبعوث ہوتا ہے تو خوش نصیب لوگ ایمان لے آتے ہیں، بدنصیب قبول نہیں کرتے۔ جو قبول نہیں کرتے ان کے پاس فیصلے کی مُہلت موجود رہتی ہے، اور ان کا کام چلتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ انکار سے بڑھ کر مخالفت پر اتر آئیں، وہ اللہ کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ یہ لوگ جب نبیؑ کی ایذا کے درپے ہوگئے، آپؑ کی مخالفت پر اتر آئے، انبیاءؑ کو شہر بدر کرنے کی ٹھان لی تو اللہ کریم نے فرمایا، فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ

الظّٰلِمِیْنَ پروردگار نے انبیاءؑ پر وحی نازل فرمائی کہ ایسے ظالموں کو اب ہم مزہ چکھائیں گے، اب یہ بچ نہیں پائیں گے۔ انہوں نے نبوت سے ٹکر لی ہے تو اب ہم انہیں تباہ کریں گے۔ ان کی بربادی کا وقت آ گیا ہے۔

اہل مکہ کو بھی کفر کے باوجود مُہلت ملتی رہی۔ انہوں نے مسلمانوں کو اور نبی کریم ﷺ کو ایذائیں بھی دیں۔ لیکن جب انہوں نے ظلم کی انتہا کر دی اور آپ ﷺ اور ان کے جاں نثاروں کو ہجرت پر مجبور کر دیا تو پھر خود بھی بچ نہ سکے۔ بدر میں ہلاک ہوئے، احد میں مارے گئے۔ فتح مکہ کے موقع پر تو قصہ ہی ختم ہو گیا۔ البتہ اُن میں جو خوش نصیب تھے، انہوں نے ایمان قبول کر لیا تو اللہ کریم نے بذریعہ وحی اپنے انبیاءؑ کو آگاہ فرما دیا کہ ہم ظالموں کو تباہ کر دیں گے۔

آباد رہنے کا مفہوم:

فرمایا، وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ اس کے بعد زمین پر آپؑ اور آپؑ کے پیروکار آباد رہیں گے تو یہاں سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ دُنیا میں آباد رہنے کے لیے اتباعِ نبوت چاہیے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں معلوم تو ہو کہ 'آباد رہنا' کہتے کسے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں جسے حکومت مل جائے وہ آباد ہے، یا جسے دولت مل جائے، عالی شان گھر مل جائے وہ بہت آباد ہے، یا جسے انواع و اقسام کے کھانے میسر ہیں، شاید وہ بہت آباد ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ سکونِ قلب میسر ہو تو ہی حقیقی آباد رہنا نصیب ہوتا ہے۔ اگر سکونِ قلب نصیب ہو تو ایک جھگی بھی محل سے بہتر ہے۔ سکونِ قلب میسر ہو تو سوکھی روٹی بھی شاہی دستر خوان سے بہتر ہے۔ اور مزدوری کرنے والا بادشاہ سے زیادہ خوش رہ سکتا ہے۔

تو ظاہری حالات پر نظر رکھی جائے تو بعض اوقات کسی گناہگار کو بڑا پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بہت آباد ہے۔ حالانکہ وہ آباد نہیں ہوتا، اسے اللہ نے مہلت دی ہوتی ہے۔ گناہ پر ڈھیل دی ہوتی ہے کہ جس راستے کا انتخاب اس نے کیا ہے، اس میں دُور تک نکل جائے۔ تو اس کی ظاہری کر و فر پر نہ جائیں، اس کے اندر کیا پریشانیاں پل رہی ہوتی ہیں، کتنی مصیبتوں میں گھرا ہوتا ہے، یہ وہ ہی جانتا ہے۔

حقیقتاً دل کی دُنیا اللہ کی یاد سے آباد ہوتی ہے، دولت دُنیا سے نہیں تو انبیاءؑ سے اور ان کے پیروکاروں سے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ ظالموں کو تباہ کر دیا جائے گا اور اِسی زمین پر اللہ انہیں آباد رکھیں گے۔

ایک بادشاہ کی حکایت:

کسی بادشاہ نے صبح اُٹھ کر محل کی کھڑکی سے جھانکا تو دور اسے ایک ایسا شخص نظر آیا جو پتھروں پر سو رہا تھا تو وہ بہت حیران ہوا کہ اسے تو شاہی بستر پر ساری رات چین سے سونا نصیب نہ ہوا، کروٹیں بدلتے ہی رات گزری۔ اور یہ کیسا انسان ہے جو پتھروں پر اتنی بے فکری سے سو رہا ہے؟ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ جب وہ حاضر ہوا تو بادشاہ نے پوچھا کہ تمہاری رات کیسی گزری؟ وہ کہنے لگا بادشاہ سلامت کچھ تو آپ جیسی گزری، کچھ آپ سے بہت بہتر گزری۔ بادشاہ یہ جواب سن کر بہت حیران ہوا کہ پتھروں پر سونے والے کی رات شاہی محل میں شاہی بستر پر گزرنے والی رات جیسی کیسے ہوسکتی ہے؟ تو بادشاہ نے تفصیل مانگی، وضاحت طلب کی تو اس شخص نے کہا بادشاہ سلامت! جب آپ سو گئے اور میں بھی سو گیا، تو میری رات آپ کی رات جیسی ہوگئی کہ جب بندہ سو گیا تو اسے کیا پتا کہ وہ شاہی بستر پر ہے، یا زمین پر؟ اور جتنی دیر میں جاگتا رہا، میں اللہ کا ذکر کرتا رہا۔ آپ جتنی دیر جاگتے رہے، پریشان ہوتے رہے۔ تو میری رات کا وہ حصہ آپ کی رات کے اس حصے سے بہتر گزرا۔ میری رات یادِ الٰہی میں، اور آپ کی سلطنت کے بکھیڑوں میں گزری۔

فرمایا، ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (۱۴) ہمیشہ انہی لوگوں کے ساتھ یہ سلوک ہوگا کہ ان کو زمین پر آباد رکھا جائے گا اور ان کے مخالفین کو تباہ کر دیا جائے گا۔ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ جو قیامت کے روز میرے روبرو حاضری کو یاد رکھتے ہیں، اور اس کے لیے تیاری کرتے ہیں وَخَافَ وَعِيْدِ میرے وعدوں سے، میرے عذاب اور گرفت سے ڈرتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو گناہ سے بچاتے ہیں اور اللہ کی یاد میں رہتے ہیں، جو اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں۔ یعنی ان کی عملی زندگی اطاعت الٰہی، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے انعام ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا انبیاءؑ کو جب بہت پریشان کیا گیا اور ان پر زندہ رہنے کے وسائل بھی بند کر دیے گئے۔ تو پھر انہوں نے کفار پر فتح کی درخواست کی، اللہ کی مدد چاہی۔ تاکہ انہیں کفار جنہیں اللہ نے بے شمار وسائل، جاہ و حشم دے رکھا تھا، ان پر غلبہ نصیب ہو۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تھی کہ اللہ! آپ نے فرعون کو تخت و حشم، اقتدار و اختیار اور دولت کی فراوانی دے رکھی ہے اور اس نے مجھے اس حد تک پریشان کر دیا ہے کہ میری درخواست ہے کہ آپ اس کے دل پر مہر کر دیں۔ اس کے مال کو نابود کر دیں۔ اب اسے کبھی توبہ کی توفیق نہ ہو۔ یہ جہنم واصل ہو۔ اور پھر فرعون کا تخت و حشم، مال و دولت سب نابود ہو گیا۔ اس کے کسی کام نہ آیا۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (١٥) انبیاءؑ نے جب اللہ سے مدد چاہی، فتح مانگی تو پھر ہر ضدی اور سرکش تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ یہ تباہی صرف اس عارضی دُنیا میں تباہی سے دو چار ہونا نہ تھا کہ کوئی سوچے کہ چلو دُنیا میں اختیارات تھے چھن گئے، موت آ گئی تباہ ہو گئے، بات ختم ہو گئی، عذاب سے مٹ گئے، قصہ تمام ہوا۔ فرمایا، یہ قصہ تمام نہیں ہوا، یہ دُنیا کے عذاب سے تباہی پر بات ختم نہیں ہوئی وَمِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ بلکہ اس کے پیچھے جہنم منتظر ہوگی۔ انبیاءؑ کی مخالفت اور دشمنی کرنے والے کفار جب دُنیا کے عذاب سے تباہ ہوتے ہیں تو ان کا اگلا قدم دوزخ میں ہوتا ہے۔ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ (١٦) اور دوزخ کی شدت کا اندازہ اس ایک بات سے کر لو کہ وہاں جو مشروب ملے گا وہ پیپ اور خون کا آمیزہ ہوگا۔ دوزخیوں کو جب عذاب ہوگا اور اس سے ان کے وجود پر جو زخم لگیں گے، جو خون بہے گا، پیپ بہے گی، اس کا آمیزہ جو بن جائے گا، وہی ان کو پینے کے لیے دیا جائے گا۔ اس کی بدبو اور غلاظت انہیں پینے بھی نہ دے گی، جبکہ دوزخ کی پیاس چھوڑنے بھی نہ دے گی يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ تو وہ اسے گھونٹ گھونٹ پئیں گے۔ جیسے کوئی بہت ہی کڑوی کیسلی دوا، زہریلی دوا کسی کو دی جائے تو وہ تھوڑی تھوڑی پیتا ہے۔ اور پھر دوزخ کی آگ نے جو پیاس بھڑکائی ہوگی تو دوزخی اس آمیزے کو پیئے بغیر رہ بھی نہ سکیں گے۔ تو وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے اور ہر گھونٹ پر ایسا محسوس کریں گے گویا سکرات الموت طاری ہے۔ جیسے فرشتے نے حلق پکڑ رکھا ہو، جیسے وہ روح کھینچ رہا ہو۔ لیکن موت نہیں آئے گی، ہر گھونٹ کے ساتھ موت کی تلخی برداشت کریں گے۔ وہ تلخی جو ایک کافر کو موت کے وقت برداشت کرنی پڑتی ہے کہ کافر کی موت کا عالم بھی بہت عبرت ناک ہوتا ہے۔ تو ہر گھونٹ کے ساتھ اسی تلخی سے دو چار ہونا پڑے گا اور اس کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا کہ موت بھی نہ آئے گی۔ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ (١٧) اور بات مشروب پر ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ دوزخ میں بہت سے ہولناک اور شدید عذاب منتظر ہوں گے۔ ہر آنے والا لمحہ ان عذابوں کی سختی اور شدت میں اضافہ کرتا چلا جائے گا۔ جیسے اہل جنت کے بارے ہے کہ ان پر انعامات ہوں گے کہ درخت سے پھل توڑ کر کھائیں گے کہ اس کے ہر لقمہ میں پہلے لقمے سے زیادہ لذت ہوگی۔ جنت میں جو مشروب عطا ہوں گے اس کے ہر گھونٹ کی لذت پہلے گھونٹ سے زیادہ پائیں گے۔ یعنی نعمتیں بڑھتی جائیں گی۔ اس کے برعکس جو دوزخ میں جائیں گے، ان کے لیے عذاب کی کیفیت و شدت بڑھتی جائے گی۔

کافر اور فلاحی کام:

اب رہی یہ بات کہ کافر بھی بعض بھلائی کے کام کرتے ہیں، نیکی کا کام کر دیتے ہیں۔ مثلاً رفاہِ عامہ کے کام

کر دیتے ہیں کہ کس نے کوئی راستہ بنوا دیا، کنواں بنوا دیا یا ہسپتال بنوا دیا، تالاب بنوا دیے۔ لاہور شہر میں سر گنگا رام ہسپتال اور گلاب دیوی ہسپتال بہت مشہور ہیں جو انہوں نے اپنا پیسہ خرچ کر کے عوام کی بھلائی کے لیے بنوائے۔ وہ نیکی تو ہے اور نیکی تو نیکی ہوتی ہے، جو بھی کرے تو کیا پھر ان نیکیوں کی کوئی رعایت ان کفار کو جہنم میں دی جائے گی؟ کیا عذابوں میں ان کے لیے کوئی تخفیف کی جائے گی؟

آخرت میں انعام کی بنیاد عقیدہ:

فرمایا، نہیں۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ جنہوں نے پروردگار سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی دن تیز آندھی آجائے اور وہ آندھی ان کے اعمال کو تنکوں کی طرح اڑا کر لے جائے اور یہ خالی ہاتھ رہ جائیں۔

جب ان کا عقیدہ ہی درست نہیں تھا، نہ اللہ پر ایمان تھا، نہ نبیؐ پر ایمان لائے اور نہ ہی آخرت پر ایمان تھا لہٰذا صورتاً نیکیاں ضرور ہیں مگر جب اللہ کے لیے نہیں کیں، آخرت کے لیے نہیں کیں تو پھر جس غرض سے کیں یعنی اگر دنیوی شہرت کے لیے کیں یا پیسہ کمانے کے لیے تو پھر اللہ کی مرضی وہ انہیں دُنیا میں اس کا بدلہ دے دیں۔ جیسے جن کے نام کے ہسپتال چل رہے ہیں۔ انہیں دنیوی شہرت تو عطا ہو گئی۔ لیکن آخرت کے انعامات کے لیے ایمان باللہ، درست عقیدہ، شرط ہے۔ لہٰذا کفر کی آندھیاں ان کی نیکی کے تنکوں کو اڑا کر برباد کر دیتی ہیں۔ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ زندگی میں جو اچھا کام اُن سے ہوا، وہ ان کے کسی کام نہ آیا بلکہ کفر کی ظلمت میں ڈوب کر تباہ ہو گیا۔ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (۱۸) اور یہ بہت ہی دور کی گمراہی ہے یعنی بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان عقائد کی اصلاح کیے بغیر، ایمان قبول کیے بغیر، صرف فلاحی یا بھلائی کے کاموں پر ہی رہے۔

فلاحی کام دینی فرائض کا بدل نہیں:

اس زعم میں صرف کافر مبتلا نہیں تھے، بلکہ مسلمانوں کو بھی آج اس میں مبتلا پایا گیا ہے۔ کہیں گے کہ میں نماز نہیں پڑھتا تو کیا ہوا، میں رشوت نہیں لیتا، میں خیرات بانٹتا ہوں، لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔ یاد رکھیں! فلاحی کام، خیراتی کام اور عبادات کی فرضیت دو الگ الگ چیزیں ہیں، یہ ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ نیکی، خیرات وغیرہ کا اپنا مقام ہے اور صلوٰۃ کی فرضیت اور اس سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کا اپنا مقام ہے۔ اگر کسی نیک کام کی توفیق ملے تو اللہ کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے نیکی کی توفیق دی۔ لیکن فلاحی کام کر کے سمجھنا کہ اس نے مجھے

فرائض سے مستثنیٰ کر دیا ہے، یہ پرلے درجے کی گمراہی ہے۔ فرائض تو بنیاد ہیں جن پر نیکی کی تعمیر کی جاتی ہے۔ تو جب کوئی بنیاد سے ہی غافل ہو جائے، اسے ترک کر دے تو عمارت کیا تعمیر ہوگی؟ ہر چیز اپنے مقام پر ہی اچھی لگتی ہے، اپنی بنیاد پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اللہ کا ہر حکم لازم ہے۔ جو کچھ اللہ نے فرما دیا اس پر عمل لازمی ہے۔

دُنیا میں ہمارا رویہ:

عجیب بات ہے کہ دُنیا کے معاملے میں ہمارا رویہ یکسر مختلف ہوتا ہے۔ سارا دن کوئی پھل کھاتا رہے، بسکٹ کھاتا رہے، چائے پیتا رہے پھر بھی کہے گا کہ آج کھانا نہیں کھایا، یعنی جو دن بھر کھاتا رہا، شاید کھانے سے دوگنا کھا گیا، لیکن اسے کھانے کا بدل شمار نہیں کرتا۔ جب تک روٹی نہیں کھاتا، کہتا ہے کچھ کھایا ہی نہیں۔ گویا دن بھر کے کھائے ہوئے کو روٹی کا متبادل نہیں مانتا۔

عمل لازمی ہے۔ فرمایا، دُنیا میں دیکھ لو! اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو چیز جس کام کے لیے تخلیق کی گئی ہے وہی کام کرتی ہے، دوسرا نہیں کر سکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟ قدرت کا قانون ہے، اصول ہے کہ ہر شے ایک کام کے لیے ہے جو دوسرے کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ آم کا پودا لگاؤ گے تو آم ہی لگیں گے، کیکر اُگاؤ گے تو اس پر کانٹے ہی اُگیں۔ اب اگر یہ کہو کہ آم کے پودے پر سیب لگ جائیں اور کیکر پر انگور لگ جائیں تو نہیں لگ سکتے۔ یہ فطرت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ تو آسمانوں اور زمینوں میں غور کرو، اور یہ یاد رکھو کہ اللہ قادر ہے اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ(۱۹) وہ چاہے تو تم سب کو تباہ کر دے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق پیدا کر دے، نئے لوگ آ جائیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ آج جن شہروں میں، جن گھروں میں ہم آباد ہیں ان میں کبھی ہمارے آباؤ اجداد بستے تھے۔ وہ بھی کہتے تھے کہ یہ مکان میرا ہے، یہ زمین میری ہے، یہ جانور، مویشی میرے ہیں۔ آج ہم اس ملکیت کا دعویٰ رکھتے ہیں، اور ان پر نازاں ہیں اور پھر کل ہم بھی نہیں ہوں گے۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ (الاعراف:128) زمین کا مالک تو اللہ ہے جسے چاہے عطا کر دے۔ جسے بھی عطا کرتا ہے اس کے پاس اللہ کی امانت ہوتی ہے کہ کسی نے بھی ہمیشہ تو نہیں رہنا۔ آج ہمارے پاس جو زمین ہے، ہم سے پہلے کسی اور کے پاس تھی۔ ہمارے بعد اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس کے پاس ہوگی تو ہر چیز اللہ کی ذاتی ملکیت ہے اور انسان کو جتنی نعمتیں ملتی ہیں اتنا ہی اس پر شکر واجب ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ قادر ہے چاہے تو تمہیں تباہ کر دے، تمہیں اٹھا لے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق پیدا کر

دے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (۲۰) اور اللہ کی شان ایسی ہے کہ وہ غالب ہے، زبردست ہے اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا یہ تجربہ بھی ہے کہ دادا، پردادا کے محض ناموں سے ہی واقف ہیں اور اس سے پہلوں کو تو شاید جانتے بھی نہیں۔ آج تو شاید تیسری پشت کو اکثر لوگ جانتے ہی نہیں۔ چلیں وہ تو پھر دور کی بات ہے، آج اپنے بھائی کو ہم اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آتے ہیں۔ اور سال، دو سال بعد قبرستان سے گزرو تو قبر تلاش کرنا پڑتی ہے کہ کہاں دفن کیا تھا۔ انسان آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک نئی مخلوق آجاتی ہے۔ قبر بھی قبروں میں گم ہو جاتی ہے، ہاں اگر کتبہ لگا ہو تو مل جاتی ہے لیکن تلاش کرنا پڑتی ہے۔ انسان کو ہمیشہ یہاں نہیں رہنا۔ انسان کے پاس تھوڑی سی مُہلت ہے کہ اپنی زندگی کو سنوارے۔ اس تھوڑی سی مُہلت میں دائمی زندگی بن جاتی ہے اور اسی تھوڑی سی مُہلت میں دائمی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا اور یقیناً قیامت کا دن آنے والا ہے۔ جس دن ہر فرد واحد کو ذاتی طور پر اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے کہ اس روز حجابات ہٹ جائیں گے۔ آخرت کے حقائق کھلیں گے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (ق:31) کہ جنت بھی سامنے کر دی جائے گی گویا بالکل پاس ہی موجود ہے۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (النّٰزعٰت:36) دوزخ بھی قریب کر دی جائے گی۔ سب دیکھیں گے، جنت بھی نظر آ رہی ہوگی اور دوزخ بھی نظر آ رہی ہوگی۔ کافر جو گرفتارِ بلا ہیں تو ان کے لیے دوہری حسرت کا مقام ہوگا۔ جنت نہ جانے کا صدمہ اور دوزخ جانے کا خوف۔ جبکہ مومن کے لیے مقامِ شکر بڑھ گیا کہ دوزخ سے بچ جانے کا شکر، اور جنت میں داخلہ نصیب ہونے کا شکر تو مومن کے لیے دوگنی خوشی، اور کافر کے لیے دوگنا دکھ ہوگا۔

بدکاروں کی پیروی کا انجام:

غلط کاروں کے پیچھے چلنے والے عام لوگ، یا معاشرے کے گمراہ اکابرین کے پیروکار جو ان کی تقلید میں زندگی گزار دیتے ہیں اور ساری زندگی گمراہی کی نذر کر دیتے ہیں، اس روز وہ پیروکار اپنے ان پیشواؤں سے کہیں گے، فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ کہ ہم نے ساری عمر تمہاری پیروی کی، تمہارے پیچھے پیچھے چلے، تمہاری اطاعت و غلامی کی۔ تو تم تو کہتے تھے کہ تم ہمارے بہت کام آؤ گے، بڑی دادرسی کرو گے تو آج مشکل بن گئی ہے تو آج تھوڑا سا

عذاب الٰہی ہی ہم سے ہٹادو۔ ہم نے تو اپنی عمریں تمہارے پیچھے ضائع کر دیں۔ ایمان تک تم پر قربان کر دیا۔ اعمال تمہاری پیروی میں کیے تو آج تم تھوڑا ہی سہی، یہ عذابِ الٰہی ہم سے ہٹوادو۔ اس میں کچھ تو کمی کروادو تو وہ اکابرین بڑی کھری بات کہیں گے، وہ کہیں گے جب تمہیں اللہ نے عقل دی تھی، حواس دیے تھے، آنکھیں دی تھیں، شعور دیا تھا اور تم دیکھ رہے تھے کہ ہم گمراہ ہیں تو تم بیوقوف ہمارے پیچھے کیوں چل پڑے تھے؟ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ اگر اللہ ہمیں ہدایت دے دیتے اور ہمیں توبہ کی توفیق ہو جاتی تو ہم سیدھے راستے پر ہوتے تو تمہیں بھی سیدھے راستے پر لے جاتے، ہم بھی بچ جاتے اور تم بھی۔ مگر جب ہم خود راستے سے بھٹک چکے تھے تو تم باوجود دیکھنے کے، ہمارے پیچھے کیوں چلے آئے؟

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا اب ہم سب کے لیے برابر ہے کہ ہم شور کریں، واویلا کریں یا صبر کریں۔ دونوں حالتوں میں ہمیں کچھ ملنے والا نہیں۔ جو ہو رہا ہے وہ ہوتا چلا جائے گا۔ مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (۲۱) اب ہمارے بچنے کی کوئی امید نہیں، کوئی ایسی صورت نہیں۔ جس کا دامن تھاما ہے، جس کے پیچھے چلے ہو، اب بھگتنا تو پڑے گا۔ اب شور کریں یا صبر کریں، کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

سورۃ ابراہیم رکوع 4 آیات 22 تا 27

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۟اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۟ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

اور جب تمام امور (قیامت کے دن) فیصل ہو جائیں گے تو شیطان کہے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور جو وعدہ میں نے تم سے کیا تھا پھر میں نے اس کی تم سے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا ہاں! میں نے تم کو (گمراہی کی) دعوت دی تو تم نے میری بات قبول کر لی (بغیر سوچے سمجھے)۔ سو تم

مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو۔ بے شک میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ تم پہلے (دنیا میں) مجھے شریک بناتے تھے۔ بے شک جو ظالم ہیں ان کے لیے درد دینے والا عذاب ہے ﴿۲۲﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، وہ ایسے باغوں میں داخل کیے جائیں گے جن کے تابع نہریں جاری ہیں وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کی صاحب سلامت سلام (السلام علیکم) سے ہوگی ﴿۲۳﴾ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اللہ نے پاک بات (کلامِ باری) کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے جیسے ایک پاکیزہ (صحت مند) درخت ہو جس کی جڑ (زمین میں) مضبوط ہو اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوں ﴿۲۴﴾ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر فصل پر اپنا پھل دیتا ہو۔ اور اللہ (ایسی) مثالیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں ﴿۲۵﴾ اور بری بات (کلمہء کفر و شرک) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے (اور) اس کو ذرا بھی قرار (ثبات) نہ ہو ﴿۲۶﴾ اللہ ایمان والوں کو پکی بات (کلمہ طیبہ) سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط (ثابت قدم) رکھتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ بے انصافوں (ظالموں) کو گمراہ کرتے ہیں۔ اور اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ﴿۲۷﴾

تفسیر و معارف

قرآن کریم اللہ کریم کا ذاتی کلام ہے جس کی عظمت اور صداقت کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ گزشتہ اقوام کے حالات ہوں، یا موجودہ زندگی کے احکام، اس کی ہر بات حرف بہ حرف سچ ہے۔ جو اطلاع ماضی کے بارے دی وہ بالکل ایسی ہے جیسا کہ واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اس میں حال کے بارے جو احکام دیے گئے ہیں، اور جو راستے متعین فرمائے ہیں وہ بھی مبنی برصداقت ہیں۔ انسان کو دنیا میں جن خطرات کا سامنا ہے وہ سب اللہ کریم

نے اپنی کتاب میں روزِ روشن کی طرح واضح کر دیے۔ وہ تمام عوامل جو اسے اس کی منزل سے دور کر دیتے ہیں ان سب کی وضاحت فرما دی۔ ان میں سے ایک بڑی وجہ خواہش نفس ہے۔ نفس اجزائے بدن کے ملنے سے وجود میں آتا ہے اور دنیوی لذات کی طرف لپکتا ہے۔ اس کی وہ حالت جو امارہ کہلاتی ہے صرف برائی کی دعوت دیتی ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف:53) فرمایا، نفس دنیوی لالچ، حرص وطمع کی ترغیب دیتا ہے۔ البتہ جب انسان ایمان قبول کرتا ہے تو اس کا کچھ حد تک تدارک ہو جاتا ہے، اور اعمال صالحہ کرنے سے نفس کی حالت بدل جاتی ہے، اور یہ نفسِ لوامہ بن جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ برائی پر ہی مائل رہتا ہے تو شیطان اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ وہ انسان کو بڑی لمبی امیدیں دلاتا ہے۔ دنیوی فوائد، مال و دولت، عہدہ واقتدار کا لالچ دلاتا ہے جبکہ حقیقت میں یہ سب فریب ہوتا ہے۔ آخرت کے احوال میں ابھی یہ بات گزری ہے کہ کفار اپنے راہنماؤں سے جھگڑیں گے کہ تم ہمیں کہاں لے آئے، اور تمہاری پیروی نے ہمارا کیا حشر کر دیا ہے۔ راہنما ان کو برملا کہیں گے کہ تم جانتے بوجھتے ہوئے ہمارے پیچھے کیوں چلے؟ ہر انسان ہر برائی شیطان کے ذمے لگا کر اسے ہی کوستا ہے، لیکن میدانِ حشر میں شیطان بھی بڑی کھری کھری باتیں سنائے گا۔ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ فرمایا، قیامت کے روز جب فیصلے ہو جائیں گے تو شیطان ان لوگوں سے جو اس کی پیروی میں جہنم کے سزاوار قرار دیے جائیں گے، کہے گا اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ اللہ کریم نے تم سے جتنے وعدے کیے وہ سب سچے تھے۔ اس نے اپنے انبیاء کرامؑ کی وساطت سے، اپنی کتابوں کے ذریعہ تم سے باتیں کیں، تم سے وعدے کیے جو برحق تھے۔ اس کی عظمت کی گواہی تو ہر ذرّہ دیتا تھا، اس کی تخلیق، سورج، چاند، ستارے ہر چیز اس کی قدرت پر گواہ تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس نے تمہارے لیے اپنے انبیاءؑ و رسل بھیجے، جنہوں نے اللہ کی باتیں تم تک پہنچائیں، وہ سب سچی تھیں۔ اس کے مقابلے میں وَوَعَدْتُّكُمْ میں نے بھی تم سے وعدے کیے، تمہیں اپنا راستہ دکھایا لیکن فَاَخْلَفْتُكُمْ جو وعدے میں نے کیے سب جھوٹ تھے۔ میں نے جھوٹ بولا، وعدہ خلافی کی۔ فَاسْتَجَبْتُمْ اور تم ایسے بدبخت ہو کہ تم نے اللہ کے وعدوں کو چھوڑ کر میرے جھوٹے وعدوں پر اعتبار کر لیا۔ اس طرح وہ اللہ کے وعدوں کے برحق ہونے کا اقرار کرے گا اور اپنے جھوٹ کو بھی تسلیم کرے گا۔

شیطان کا اختیار:

شیطان اقرار کرے گا وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ کہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں کہ وہ انسان کو زبردستی برائی پر مجبور کر دے نہ ہی انسان کو گناہ پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس نے کہا میرے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں تھی

کہ میں تم کو زبردستی کفر میں دھکیلتا۔ میں تو صرف بات ہی کر سکتا تھا، مشورے دے سکتا تھا، تمہارے دل میں وسوسے ڈال سکتا تھا، وعدے کر سکتا تھا اور وہ سب جھوٹے ہوتے تھے میں وسوسہ اندازی کرتا رہا لیکن تم ایسے بد بخت ہو کہ تم نے میری جھوٹی بات مان لی فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِیۡ اور اللہ کے سچے وعدوں کو چھوڑ دیا۔ جبکہ تم جانتے تھے کہ میرا راستہ کون سا تھا، میں تو بارگاہِ الٰہی سے ردّ ہو چکا تھا، مردود ہو چکا تھا، میرے لیے تو جہنم طے ہو چکی تھی، پھر میرے پیچھے کیوں چلے؟ اب انصاف کرو کہ ملامت کا حقدار کون ہے؟ اللہ نے یہ ساری باتیں تمہیں بتائیں تھیں کہ میں نسل انسانی کا دشمن ہوں۔ کافروں کا بھی دوست نہیں ہوں کہ انہیں کسی ایک گناہ پر نہیں رہنے دیتا بلکہ جہنم کی گہرائیوں کی طرف چلاتا رہتا ہوں۔ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِیۡ سو مجھے ملامت نہ کرو وَلُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ اپنے آپ کو ملامت کرو کہ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ تم نے مجھ پر اعتبار کر لیا اور اللہ اور اس کے انبیاء ورسل کی بات نہیں مانی۔ مَاۤ اَنَا بِمُصۡرِخِکُمۡ میں اب تمہیں عذاب سے نہیں بچا سکتا، نہ ہی تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُصۡرِخِیَّ میرے لیے بھی جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہے اور تم بھی مجھے بچا نہیں سکتے۔ اب تو مل کر ہی بھگتنا ہوگا، اب جھگڑا کرنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! ملامت کرنی ہے تو اپنے آپ کو کرو کہ اللہ کی بات چھوڑ کر تم نے مجھ پر کیوں اعتبار کر لیا؟

شیطان کی پوجا:

شیطان کہے گا کہ دنیا میں تم لوگ مجھے اللہ کا شریک بناتے رہے، میری پوجا کرتے رہے اِنِّیۡ کَفَرۡتُ بِمَاۤ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ مِنۡ قَبۡلُ لیکن میں اس سے انکار کرتا ہوں۔ میں نے کب دعویٰ کیا کہ میں معبود ہوں۔ مجھے تو خبر ہی نہیں کہ کوئی میری پوجا کر رہا ہے۔ میں اس سے انکار کرتا ہوں۔ شیطان کا یہ مکالمہ تمام اہلِ دوزخ کے ساتھ ہے جبکہ سب نے تو شیطان کی پوجا نہیں کی ہوگی۔ آج مغرب میں ایک گروہ موجود ہے جو شیطان کے بچاری ہیں، مگر وہ بہت تھوڑے ہیں۔ عالمِ کفر کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر اور جہنم میں عالمِ کفر کی تعداد کتنی زیادہ ہوگی تو پھر اس آیت کا اطلاق سب کفار پر کیوں کیا جا رہا ہے؟

عبادت کا مفہوم:

عبادت دراصل اطاعت ہی کا نام ہے۔ بالخصوص وہ اطاعت جو جلبِ منفعت، یعنی نفع کی امید پر، یا دفعِ ضرر یعنی نقصان سے بچنے کے لیے کی جائے۔ ایسی اطاعت کا حقدار صرف اللہ کریم ہے۔ ہر نفع ونقصان صرف اس کے دستِ قدرت میں ہے تو جن لوگوں نے شیطان کی پیروی کی، اس امید پر اس کی اطاعت کی کہ اس میں بہت فائدہ ہوگا یا نقصان سے بچ جاؤں گا تو خود شیطان ان سے کہہ رہا ہے کہ تم نے تو مجھے اللہ کا شریک سمجھ رکھا تھا۔ میں اس سے

انکار کرتا ہوں۔ میں تمہارے کردار کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اب اپنا کیا خود ہی بھگتو۔

ظلم کی حقیقت:

اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (۲۲) اور یقیناً جنہوں نے ظلم کیا ان کے لیے بڑے دردناک عذاب ہیں۔ ظلم سے مراد کسی کام کو غلط انداز سے کرنا ہے۔ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے، وَضۡعُ شَیۡءٍ غَیۡرَ مَحَلِّهٖ کسی بھی چیز کو ایسی جگہ پر رکھنا جو اس کا مقام نہ ہو ظلم ہے۔ اسی لیے اللہ کے ساتھ شریک بنانا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ (لقمٰن:13) اللہ کی نافرمانی کرنا، نیکی کی جگہ برائی کرنا یہ سب ظلم ہے بلکہ ہر غلط کام ظلم ہے۔ تو شیطان کہے گا کہ دنیا میں اللہ نے بتایا، اللہ کے انبیاء اور اس کی کتابوں نے بتایا کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ ظالموں کے لیے بڑے دردناک عذاب ہوں گے تو اب وہ لمحہ آپہنچا ہے، فیصلہ نافذ ہو چکا ہے اب شور مچانے سے کیا فائدہ۔ تو یوں اہلِ دوزخ قرار دیے جانے والے یہ سارے لوگ، آپس میں اور شیطان کے ساتھ لڑتے جھگڑتے دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔

کردار اور منزل:

جس لمحہ اللہ کے نافرمان، شیطان کے پیروکار دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اپنی منتخب کردہ راہ کی منزل پر پہنچ رہے ہوں گے اسی لمحے دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے وَاُدۡخِلَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ جو ایمان لائے اور جنہوں نے انبیاء و رسلؑ کی راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ اپنی منزل کو پالیں گے۔ اپنے ربّ کے حکم سے، اس کی اجازت سے جنت میں داخل ہو رہے ہوں گے۔ ایسے باغات جن کے تابع نہریں بہتی ہیں، جنہیں اُن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داخلہ نصیب ہوگا۔

ایمان اور عملِ صالح:

قرآن حکیم ان دو صفات کو یعنی ایمان اور عمل صالح کو بار بار دہراتا ہے اور ہمیشہ ساتھ ساتھ ارشاد فرماتا ہے۔

حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایمان ایک دعویٰ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ کہ ہم ایمان لائے، تو یہ ایک دعویٰ ہے۔ اور دعویٰ، شہادتوں اور گواہوں کے بغیر قبول نہیں کیا جاتا۔ ایمان کے گواہ اعمال ہوتے ہیں، کردار ثبوت ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی شخص عدالت میں دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں زمین کا مالک ہوں، یا یہ مکان میرا ہے، مجھے دلایا جائے۔ لیکن دعویٰ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک وہ اس پر گواہ، دلائل یا ثبوت پیش نہ

کرے۔ اسی لیے قرآن کریم نے دعویٰ ءایمان کو عمل صالح سے متصل رکھا ہے۔ یاد رہے کہ ہر وہ عمل صالح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع ہے۔ خلافِ سنت کوئی عمل صالح نہیں ہوسکتا۔ صالحیت کا معیار لوگوں کی رائے پر نہیں ہے۔ انسانوں پر چھوڑا جائے تو جو کام جسے پسند ہوگا وہ اسی کو صالح کہے گا۔ عملِ صالح وہ کام ہے جو اللہ پر ایمان لانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کیا جائے۔

سلامتی ہی سلامتی:

انسان اپنے کردار کے انجام کو پالیں گے تو جو دوزخ میں ہوں گے وہ باہم جھگڑا کریں گے، الزام تراشی کریں گے، ایک دوسرے کے حق میں بددعائیں کریں گے اور لعنت ملامت کریں گے۔ دوسری طرف جنت جانے والے، گو وہ بھی انسان ہی ہیں اور دنیا میں ان کے درمیان اختلافِ رائے بھی رہا، اختلافِ حیثیت بھی رہا تو کیا وہاں بھی آپس میں کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار ہوگا؟ ہرگز نہیں بلکہ تَحِیَّتُهُمۡ فِیۡهَا سَلٰمٌ (۲۳) وہاں سب ایک دوسرے کو سلامتی کی دعائیں دیں گے۔ اہل جنت کو اتنی نعمتیں عطا ہوں گی جو ان کی توقعات سے بہت زیادہ ہوں گی۔ اتنی سہولتیں فراہم کی جائیں گی کہ کسی کو کسی قسم کے اعتراض کا موقع ہی نہ ملے گا۔ جھگڑا تو تب ہوتا جب انسان کو امید سے کم نعمت ملے۔ وہاں باہم جھگڑے یا کسی کدورت کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ مزاج پاکیزہ ہو جائیں گے، خواہشات پاکیزہ ہو جائیں گی اور حقیقی اور ابدی لذات نصیب ہوں گی۔ دنیا کی لذتیں عارضی اور مادّی ہیں جبکہ جنت کی لذتیں حقیقی ہیں اور ان سے نہ صرف وجود مستفید ہوں گے بلکہ روح کی گہرائیوں تک ان کا اثر پہنچے گا اور وہ اللہ کریم کا شکر ادا کریں گے اور ایک دوسرے کو سلامتی کی دعائیں دیں گے مزید ترقی ءدرجات کی دعائیں دیں گے۔

قرآن حکیم کا اندازِ تعلیم:

اللہ کا کلام پڑھا جائے اور سمجھا جائے تو سمجھ آتی ہے کہ اللہ کتنا کریم ہے۔ اپنی عاجز مخلوق کو کس طرح پیار سے حسن اور سلیقے سے باتیں سمجھاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ذہن نشین کروا کر بندوں کی تربیت فرماتا ہے۔ مثال دے کر بات سمجھاتا ہے کہ یہ کرو اس میں فائدہ ہے، یہ نہ کرو اس میں نقصان ہے اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کیا آپ دیکھتے ہیں کہ کلامِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ کس طرح مثال دے کر سمجھاتے ہیں۔ اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً فرمایا، کلمہ طیبہ ایک پاک اور مبارک بات ہے۔ جس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مبارک پاکیزہ درخت ہو۔ سب سے پہلا کلمہ طیبہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ پھر ہر نیک بات، اور ہر وہ عمل، جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع میں کیا جائے، وہ کلمہ طیبہ ہے۔ تو کلمہ طیبہ ایسا پاکیزہ درخت ہے اَصۡلُهَا ثَابِتٌ جس کی جڑ زمین میں

بہت گہری اور مضبوط ہو، اتنی طاقتور ہو کہ بوجھ بھی اٹھا سکتی ہو اور غذا بھی خوب پہنچا سکتی ہو۔

مبارک کلمہ ایسا مضبوط درخت ہے جس کی جڑیں انسانی قلوب کے اندر ہوتی ہیں، اور بڑی مضبوطی سے گہرائی میں جمی ہوتی ہیں۔ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ(۲۴) اس پاکیزہ درخت کی شاخیں بالائے آسمان ہوتی ہیں تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا اور ہر بار، ہر فصل پر اپنے ربّ کی عطا سے پھل دیتا ہے۔ اپنے مالک کی اطاعت سے ہر فصل پر بہترین پھل دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا مضبوط درخت ہے جس کی جڑیں گہرائی میں ہیں، مضبوط ہیں اور شاخیں آسمانوں کی بلندیوں تک پھیل گئی ہیں۔ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ(۲۵) اللہ کریم انسانوں کی تربیت اور نصیحت کے لیے یہ مثالیں ارشاد فرماتے ہیں تا کہ وہ بات کو سمجھ سکیں۔ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ(۲۶) ناجائز یا ناپاک کلام، کفریہ یا شرکیہ بات یا اس پر عمل، اس کی کوئی جڑ نہیں ہوتی۔ جیسے وہ زمین کے اوپر اوپر ہی ہو، اس کی جڑ زیر زمین نہ ہو، بلکہ سطح پر ہی ہو اور زمین بھی خراب ہو، پودا بھی خراب ہو، اور جڑیں بھی کمزور اور سطح پر ہوں۔ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ(۲۶) یہ پودا اپنے وجود کو بھی باقی نہ رکھ سکتا ہو بلکہ ہوا کے رُخ کے ساتھ ساتھ جھولتا رہے اور آندھی میں گر جائے، یا اُڑ جائے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ہر غلط بات اور غلط کام کی حیثیت یہی ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہوتی، اور اس کو ثبات نہیں ہوتا۔

کلامِ الٰہی اور ہمارا رویہ:

اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں مثالوں سے انسانوں کو حقائق سمجھاتے ہیں تو اس کلام کو پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن ہمارا رویہ دو طرح سے ہے اور بہت عجیب ہے۔ اوّل تو ہمارے پاس اس کو پڑھنے کے لیے فرصت ہی نہیں ہوتی حالانکہ بہت عقیدت رکھتے ہیں، قدر کرتے ہیں۔ احترام سے سنبھال کر ریشمی غلافوں میں رکھتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی کہ اس کو پڑھا جائے تو جب ہم پڑھیں گے ہی نہیں تو سمجھ کیا آئے گی؟

دوسرا رویہ یہ ہے کہ جب ہم پڑھنا چاہتے ہیں تو ایک دوڑ سی لگ جاتی ہے کہ میں نے ایک دن میں ختم کر لیا، یا ایک دن میں دس یا بیس سپارے پڑھ لیے۔ یوں کوئی نہیں کرتا کہ دو آیات پڑھ کر ان پر غور و فکر کر لے، ایک گھنٹہ ہی ان پر صرف کرے، ترجمہ پڑھے، مفسرین کرام کی رائے پڑھے۔ کم از کم ایک مسئلہ ہی سمجھ لے۔ ایسا کرنے والا آپ کو کوئی نہیں ملتا۔ قرآن تو سمجھنے اور سمجھ کر عمل کرنے کے لیے ہے۔ جب سمجھیں گے نہیں تو عمل کیا ہوگا؟ پھر عمل بھی سنے سنائے پر ہوگا۔

مروّجہ شبِ برأت، ایک مثال:

ہمارا رویہ یہ ہوتا ہے کہ ہر کسی کے کہنے پر کسی بھی عمل کو باعثِ ثواب سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے پندرہویں شعبان کی شب کے بارے میں بہت سی باتیں رواج پا گئی ہیں۔ قرآنِ کریم میں سورۃ الدخان میں لیلۃ المبارکہ کا ذکر ہے فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (الدخان: 4) مفسرین فرماتے ہیں، اس سے مراد لیلۃ القدر ہے جس میں نزولِ قرآن ہوا، جس میں احکام و دلائل اور احکام و شرائط کی تفصیل بیان کی گئی اور امور کے فیصلے کیے گئے۔ یہ رات کوئی الگ رات نہیں ہے بلکہ لیلۃ القدر ہی ہے۔ یہ الگ سے رات لوگوں نے خود ہی بنالی۔ کھانے پینے کے بہانے بن گئے ہیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ اس شب (یعنی شب برأت) کو اس طرح مناتے تھے؟ کوئی ثبوت نہیں۔ کیا صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعین سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟ نہیں ملتا۔ تو جن پر قرآن نازل ہوا انہوں نے نہیں سمجھا، آج لوگوں نے آ کر سمجھ لیا؟ وہ مبارک ذات ﷺ جن کا منصب جلیلہ یہ تھا کہ قرآن کو اللہ سے وصول کریں اور اس کی مخلوق کو پہنچائیں، سمجھائیں اور لوگوں سے اس پر عمل کرائیں۔ انہوں نے تو لیلۃ المبارکہ کو شب برأت نہیں بتایا تو آج کے مولوی کی کیا حیثیت ہے کہ وہ معنی گھڑ لے کہ یہ آیات لیلۃ القدر کے بارے نہیں بلکہ شب برأت کے بارے میں ہیں۔ اللہ کے بندو! یہ بات تمہیں رسول اللہ ﷺ نے بتائی، صحابہؓ نے بتائی، تبع تابعین نے بتائی، متقدمین نے بتائی؟ وہ تو سارے فرما رہے ہیں کہ یہ بات لیلۃ القدر کے بارے میں ہے۔ تم نے یہ ایک نئی رات اور نئی عید کہاں سے نکال لی؟

رسومات کیوں جاری کی جاتی ہیں؟

دراصل یہ باتیں لوگوں نے گھڑ لی ہیں اس لیے کہ پیسے آ جاتے ہیں، چندے جمع ہو جاتے ہیں۔ خود کھایا پیا، کچھ لوگوں کو کھلایا تو اس کے لیے رسومات جاری کی جاتی ہیں۔ یہ رسومات جاری کرنے والے اتنے روپے اکٹھے کر لیتے ہیں کہ بوریوں میں وصولی ہوتی ہے اور بعض کو تو گننے کی بھی فرصت نہیں ہوتی اور دینے والوں کا خیال ہوتا ہے کہ ہم بہت نیکی کما رہے ہیں اور یہ چونکہ بہت مبارک رات ہے تو کم از کم ایک سال کے فیصلے تو ہمارے حق میں ہو گئے۔ اور بڑی عجیب بات ہے کہ رسومات اور رواجات کی پوری محنت سے پابندی کی جاتی ہے اور فرائض، واجبات اور سنن کی پروا بھی نہیں کی جاتی۔

کلمہ طیبہ پر قائم رہنے کا انعام:

یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ اللہ کریم اہل ایمان کو، کلمہ طیبہ پر استقامت دکھانے والوں کو، مبارک کلمات پر ڈٹ جانے والوں کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ انسان کا قدم اس کی اپنی کمزوری سے ڈگمگا تا ہے، کوئی غلط بات سوچتا ہے، یا کوئی غلط کام کرتا ہے کوئی غلط بات منہ سے نکالتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ کی اطاعت پر جما رہے، نبی کریم ﷺ کے اتباع پر جما رہے تو اسے کوئی طاقت ہلا نہیں سکتی کیونکہ اللہ کریم اسے ثابت قدم رکھتے ہیں۔ اللہ کریم اس کی مدد فرماتے ہیں لیکن جب وہ اپنی مرضی سے دامانِ رسالت ﷺ چھوڑتا ہے تو پھر ڈگمگا جاتا ہے۔ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ایمان والوں کو اللہ کریم ہمیشہ ثبات اور مضبوطی عطا فرماتا ہے اور تھام کے رکھتا ہے بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ جب وہ بھی حق پر ڈٹے رہنے کا عزم رکھتے ہیں۔ جب وہ یہ عزم کر لیتے ہیں کہ انہیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت پر جمے رہنا ہے تو پھر اللہ ان کی مدد فرماتا ہے اور انہیں استقامت کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ اس دنیا میں بھی ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ رسالت ﷺ پر جمے رہنے کی قوت عطا فرماتے ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی حفاظت فرماتے ہیں۔

ظلم کا انجام، گمراہی:

وَیَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۲۷) اور اللہ ہی مالکِ کُل ہے۔ تمام مخلوق کا مالک ہے اور تمام فیصلے اس کے اپنے ہیں جو ہمیشہ برحق اور صحیح ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کا کتنا منصفانہ اور بڑا فیصلہ ہے کہ اس نے انسان کو اختیار دے دیا کہ وہ اپنے لیے کس راہ کا انتخاب کرتا ہے، کسی کو زبردستی مسلمان بننے کو کہا نہ ہی زبردستی کسی کو کفر میں دھکیلنا اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (الدھر: 3) اللہ کریم نے دونوں راستے کھول کر انسان کے سامنے رکھ دیے ہیں، ان کے بارے میں سب کچھ بیان کر دیا ہے، سمجھا دیا ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار انسان کو دے دیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کو پانا چاہتا ہے یا اس کے غضب کا طالب بننا چاہتا ہے۔ وہ شکر کی راہ اپناتا ہے یا کفر و انکار کا راستہ منتخب کرتا ہے۔

سورۃ ابراہیم رکوع 5 آیات 28 تا 34

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَاۗىِٕبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو (شکر بجالانے کی بجائے) کفر سے بدل دیا اور انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں پہنچا دیا ﴿۲۸﴾ جہنم جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے ﴿۲۹﴾ اور انہوں نے اللہ کے شریک بنائے تاکہ (لوگوں کو) اُس کی راہ سے گمراہ کریں۔ فرما دیجیے کہ تھوڑے دن گزار لو پھر بے شک تمہارا انجام دوزخ میں جانا ہے ﴿۳۰﴾ میرے ایمان والے بندوں سے فرما دیجیے کہ وہ نماز کی پابندی رکھیں اور ہمارے

دیے ہوئے مال میں سے درپردہ اور ظاہر (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں اس دن کے آنے سے پہلے کہ جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی (کام آئے گی) ﴿۳۱﴾ اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور آسمان سے پانی (مینہ) برسایا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل پیدا فرمائے اور (تمہارے نفع کے لیے) بحری جہازوں کو تمہارے تابع فرمایا کہ اُس کے حکم سے سمندر میں چلیں اور دریاؤں (نہروں) کو بھی تمہارے زیرِ فرمان کیا (کہ ان سے فائدہ حاصل کرتے ہو) ﴿۳۲﴾ اور سورج اور چاند کو تمہارے کام پر لگا دیا کہ دونوں (رات دن) ایک دستور پر چل رہے ہیں اور رات اور دن کو بھی تمہاری خاطر کام میں لگا دیا ﴿۳۳﴾ اور جو کچھ تم نے اس سے مانگا سب تم کو عنایت فرمایا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو ان کو شمار نہ کر سکو بے شک انسان بڑا ہی بے انصاف، بڑا ناشکرا ہے ﴿۳۴﴾

تفسیر و معارف

رِزق کی اَزلی تقسیم:

فرمایا، اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ اللہ کریم نے انسانوں کی تخلیق سے بہت پہلے انہیں دارِ دنیا میں ملنے والا رزق تقسیم فرما دیا۔ ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے کہ دنیا کا جو کچھ جسے ملنا تھا وہ تقسیم ہو چکا۔ سیاہی خشک ہو چکی، فیصلہ ہو چکا۔ جو جس کے نصیب میں ہے وہی اسے ملے گا۔ دیکھا یہ جائے گا کہ وہ حصولِ رزق کے لیے کون سے ذرائع استعمال کرتا ہے۔

رزق کی تقسیم، ایک آزمائش:

ارشاد باری ہے، فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (الفجر: 15) کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو آزمائش میں ڈالنے کے لیے اللہ کریم بے پناہ دولت دے دیتے ہیں۔ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ عزت، شہرت، عہدے، حکمرانی عطا کر دیتے ہیں۔ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ تو جو

اُن میں صالح اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں وہ گمراہ نہیں ہوتے، بلکہ انہیں احساس ہوتا ہے کہ یہ سب نعمتیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں اور ان پر مزید شکر واجب ہے۔ رزق کی زیادتی بہت سخت آزمائش ہے۔ دولت کے ساتھ شہرت از خود آجاتی ہے۔ ایک مقام و مرتبہ از خود بن جاتا ہے۔ وسائل کی فراوانی میں بداعمالیوں کے مواقع بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن ان کے لیے نہیں جنہیں یہ احساس ہو کہ یہ نعمتیں اللہ کی عطا ہیں، ہمارا ذاتی کمال نہیں لہٰذا ہم پر زیادہ شکر واجب ہے اور دوسروں کی نسبت زیادہ عبادات، نیک کام اور اچھائی کرنی چاہیے۔ جس پر زیادہ انعامات ہوں اس کو اتباع رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں زیادہ سرگرم ہونا چاہیے۔

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ (الفجر:16) کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ رزق کی تنگی سے آزماتے ہیں۔ رزق کی تنگی میں یہ آزمائش ہوتی ہے کہ ان حالات میں بھی کیا وہ اللہ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں یا مختلف دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں، ایسا کرنے سے اس کا رزق بڑھتا تو نہیں ہے کیونکہ وہ تو ازل سے مقدر ہے صرف اس کے کردار کو جانچا جا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جسے زیادہ عطا ہوتا ہے اس کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے یا خود ہی خدا بن کر بیٹھ جاتا ہے، اپنی مرضی کرتا ہے۔ اللہ کریم تو ازل سے جانتے ہیں کہ کون کیسا رویہ اختیار کرے گا۔ یہ تو اس انسان پر حجت قائم کی جاتی ہے کہ تمہیں رزق عطا کیا گیا تو تم نے کیا کیا؟

زوالِ نعمت کے اسباب:

رزق کی فراوانی اللہ کریم کی نعمت ہے لیکن صرف تب تک جب تک انسان کو اس کے شکر کی توفیق ہو۔ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا لیکن اگر انسان اس نعمت کو بگاڑ دے تو یہ بگاڑ نافرمانی سے شروع ہو کر کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ گویا اللہ کے انعامات پر شکر واجب ہے، اطاعت واجب ہے۔ اگر کفر و نافرمانی کی راہ اپنائی جائے تو نعمتیں بدل دی جاتی ہیں۔

ناشکروں کی تقلید کے نتائج:

جو لوگ دولت کی فراوانی کی نعمت پا کر ناشکری اور کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے اگر عقائد بھی تباہ ہو جائیں، عادات و اطوار بگڑ جائیں، وہ خسیس و ذلیل بھی ہو جائیں تو بھی لوگ محض دولت کے لیے ان کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ بڑے اپنے پیروکاروں کو کچھ دیتے نہیں، نہ دولت بانٹتے ہیں۔ لیکن لوگ ہیں کہ ایک موہوم امید پر ان کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور پھر جب گمراہ شخص کی پیروی کرتے ہیں تو خود بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی تقلید میں اس جیسی عادتیں اپناتے ہیں۔ اس جیسی باتیں کرتے ہیں، اس جیسا حلیہ بناتے ہیں۔ پھر یہ ایک

"ism" بن جاتے ہیں اور اس میں غرق ہو جاتے ہیں۔ وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۲۸) فرمایا، ان بڑوں نے اپنی قوم کو، اپنے پیروکاروں کو ہلاکت کے گھر پہنچا دیا۔ خود تو تباہ ہوئے ہی، پیروکاروں کو بھی تباہ کر دیا۔ ان کے عقائد برباد ہوئے، ان کا کردار تباہ ہوا اور بربادی کے گھر یعنی جہنم جا پہنچے۔

ناشکری کا، برائی کا راستہ اختیار کیا۔ ناچ گانوں، شراب و شباب کی محفلوں کے رسیا بن گئے، اور یہ پیروکار اتنے بے وقوف ہیں، اتنے بدنصیب ہیں کہ یہ گمراہ دولت مندوں کی پیروی اس امید پر کرتے ہیں کہ وہ شاید خوش ہو کر انہیں بھی اپنی دولت میں سے کچھ دے دیں گے۔ حالانکہ یہ گمراہ امراء اتنے حریص ہوتے ہیں کہ جو کچھ ان غریبوں کے پاس ہوتا ہے وہ بھی چھین لیتے ہیں۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا مشاہدہ روزمرہ کی زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسانی مزاج ہے جب بھٹکتا ہے تو بھٹکتا ہی چلا جاتا ہے۔ فرمایا، یہ بڑے اپنے پیروکاروں کو لے کر جہنم جا پہنچتے ہیں۔ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا اس میں داخل ہوں گے وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۲۹) اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ انتہائی تکلیف دہ ٹھکانہ ہے۔

اللہ کی رضامندی کی دلیل:

ثابت ہوا کہ محض دولت یا اقتدار کا ملنا اللہ کی رضامندی کی دلیل نہیں ہے۔ اللہ کی رضامندی کی دلیل صحتِ عقیدہ اور صحتِ عمل ہے۔ ہاں! اس کے ساتھ دولت بھی ہو تو یہ اللہ کا مزید انعام ہے۔ انسان کا عقیدہ بھی درست ہو، کردار بھی درست ہو اور اس کے پاس دنیوی نعمتیں بھی ہوں تو یہ اللہ کریم کا احسان ہے۔ لیکن اگر دولت و اقتدار کی وجہ سے بھٹک گیا، گمراہ ہو گیا بدکردار ہو گیا تو اس مقتدر کی پیروی میں جو گمراہ ہوں گے، ان سب کے سمیت اسے جہنم میں جانا ہو گا۔ جہاں اللہ کا غضب ہے۔

گمراہی کا ایک انداز، شرک:

اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے جب لوگ بھٹکتے ہیں، دولت و اقتدار پا کر گمراہ ہوتے ہیں تو پھر وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ مخلوق میں صفاتِ الٰہی کو ماننا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ صفات جو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا خاصہ ہیں انہیں دوسروں میں مان کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ آج یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ خلاف سنت جتنی رسومات و بدعات رواج پا چکی ہیں ان میں سب سے زیادہ حصہ اُمراء کا ہے۔ فرائض و سنت پر تو عمل کرتے نہیں البتہ رسومات پر بہت خرچ کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ آخر انہیں اس شرک سے، یا اللہ کے شریک بنانے سے کیا فائدہ ہوا، کس لیے بنائے؟ فرمایا، بنائے تو لالچ میں تھے مگر

اس بات نے انہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دیا۔

عارضی فائدہ:

فرمایا، قُلْ تَمَتَّعُوْا انہیں فرما دیجیے کہ اس عارضی مہلت میں جو اللہ نے دی ہے، جتنا فائدہ اٹھانا ہے اٹھالو۔ جب تک یہ فرصت نصیب ہے، موج کرلو۔ اللہ کریم نے ہر شخص کے لیے ایک حد مقرر کی ہے، اس کی زندگی کی ایک معین مدت ہے اور اسے اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اچھائی کرے اور چاہے تو برائی کرے۔ اس برائی کا اثر گو اُسے زندگی میں بھی پہنچتا رہتا ہے لیکن موت کے بعد تو مکمل طور پر چھا جائے گا۔ فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ (۳۰) تو یہاں چندے فائدہ اٹھالو، بالآخر تمہارے اس سفر کی منزل آجائے گی۔ وہ دوزخ ہے۔

عابد و معبود:

فرمایا، قُلْ لِّعِبَادِيَ میرے حبیب ﷺ میرا یہ پیغام میرے بندوں کو دے دیجیے کہ۔۔۔

مالک سب کا ایک ہے، مالک کا کوئی ایک

بندے تو سب اسی کے ہیں لیکن سب اللہ کے بندے نہیں بنتے، اپنی مرضی کرنا چاہتے ہیں اور اس نے کس پیار سے ارشاد فرمایا کہ میرے حبیب! (ﷺ) میرے جو بندے دولت ایمان سے سرفراز ہوتے ہیں، انہیں فرما دیجیے۔ اس خطاب کی لطافت کو پانے کے لیے محسوس کرنا پڑے گا کہ کسی کا کوئی محبوب ہو جس کے لیے انسان سب کچھ قربان کر سکتا ہو، یہاں تک کہ جان بھی دے سکتا ہو اور وہ معشوق اسے بے حد عزیز ہو بغیر اس شرط کے کہ معشوق اسے جانتا ہو یا نہیں، مانتا ہو یا نہیں۔ عاشق کی طرف سے محبت ہو۔ اب ایسے میں اگر معشوق بھی اسے پکارے اور کہے 'تو میرا ہے' تو یہ کیسی خوبصورت بات ہوگی۔ اس کی لذت تو وہ جانتا ہے جسے محبت ہو۔ ہم دعوے کرتے رہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں یہ تو ہمارا دعویٰ ہے لیکن جب وہ فرمائے یہ میرے بندے ہیں تو بات کا مزہ ہی اور ہے۔

ایمان اور عبادات:

اللہ نے فرمایا، میرے ایمان دار بندوں سے فرما دیجیے، يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ کہ دو باتیں اللہ تعالیٰ نے ضروری قرار دی ہیں۔ ان کی پابندی کریں يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ عبادات کو پورے خلوص، خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کریں۔ پوری محنت و کوشش کے ساتھ پابندی کریں کہ فرائض کو فرض جان کر، سنت کو سنت جان کر، واجب کو واجب جان کر، مستحب کو مستحب جان کر ادا

کریں۔یعنی عنداللہ کوئی ایسا مقام نہیں آتا جہاں عبادات معاف ہوجائیں۔ بندے کا اور اللہ کا رشتہ ہی عابد و معبود کا ہے۔ بندے کا کام اس کی عبادت کرنا اور اس کا کام اس کی عبادت کو قبول کرنا ہے۔ اللہ اور بندے میں تعلق ہی یہ ہے۔ اللہ خالق ہے، بندہ مخلوق ہے، اور کوئی نسبت ہی نہیں۔ مخلوق کے مابین تو تعلقات ہوسکتے ہیں کہ دونوں مخلوق ہیں۔ہم اگر جانور پالتے ہیں تو ان کو بھی ہم سے پیار ہوجاتا ہے کہ ہم آزاد بھی چھوڑ دیں تو وہ ہمارے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔اسی طرح پودے لگاتے ہیں تو تجربہ بتاتا ہے کہ ایک صحن میں اگر دو پودے لگا کر ایک پودے کی نگہداشت خود کریں، اس کے پتے جھاڑیں اسے پانی خود دیں اور دوسرا کسی ملازم کے حوالے کردیں کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے تو جس پودے کو آپ نے ذاتی توجہ دی اس کی نشوونما دوسرے پودے سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ یہ محبت کا احساس اتنا شدید ہے کہ اسے پودے بھی محسوس کرتے ہیں۔لوگ پرندے پال لیتے ہیں، طوطے مینا پالتے ہیں، دیگر جانور پالتے ہیں گائے بھینس وغیرہ جس سے پیار کرتے ہیں وہ ساتھ ساتھ پھرتا رہتا ہے۔ وہ بھی محبت کا اسیر ہوجاتا ہے۔ یہ تو پھر مخلوق کی مخلوق سے محبت ہے۔ انسان اور انسان کی آپس میں محبت ہوگی کہ ہم جنس ہیں۔ خالق اور مخلوق میں رشتہ کیا ہوگا؟ وہ بے نیاز ہم عاجز، تو فرمایا، میرا بندوں سے رشتہ ہی یہی ہے کہ میں معبودِ برحق ہوں اور وہ میری عبادت کرتے رہیں۔ بندے سے تعلق تو یہی بنے گا۔ بندہ کہتا ہے کہ مجھے اللہ سے محبت ہے۔ضرور ہوگی لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ محبت کا تقاضا کیا ہے؟ محبت کیا چاہتی ہے؟ فَاِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ الْمُطِیْعُ یعنی محبت کرنے والا اپنے محبوب کا اطاعت گزار بن جاتا ہے۔ اس کی ہر بات تسلیم کرتا ہے، کسی بات سے انکار نہیں کرتا، تو اگر اللہ کریم سے دعوئ ءالفت ہے تو پھر احکاماتِ الٰہی کی تعمیل بدرجہ ءاتم کرنی چاہیے۔ تو فرمایا، میرے بندوں سے فرما دیجیے کہ عبادات پورے خلوص، خشوع و خضوع سے قائم رکھیں۔

حُبِ دُنیا کا علاج:

انسان کے دعوئ محبت الٰہی کو جو چوٹ لگتی ہے، وہ دنیوی نعمتیں ہوتی ہیں۔ بندہ محبت کا راگ الاپتا رہتا ہے لیکن دنیا کی محبت میں کھوجاتا ہے۔ مال و دولت، عہدہ و مرتبہ ہی اس کی محبت کا محور بن جاتے ہیں تو اس کا علاج اللہ کریم نے عطا فرمایا، وَیُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ جو نعمتیں میں نے دی ہیں انہیں میری راہ میں خرچ کرتے رہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ انہیں یہ احساس رہے گا کہ ان نعمتوں کا حقیقی مالک میں نہیں بلکہ اللہ ہے اور اللہ نے کچھ عرصہ کے لیے مجھے ان کا امین بنا دیا ہے، لیکن میں انہیں اپنی مرضی سے خرچ نہیں کرسکتا بلکہ مالک کے حکم سے خرچ کرسکتا ہوں۔ اگر یہ احساس ہو تو پھر دنیوی نعمتیں خطرہ نہیں بنتیں ورنہ تو یہ محبت کے لیے خطرہ بنی رہیں گی کہ کسی بھی وقت محبت کا رخ اللہ کی طرف

سے پھیر کر اپنی طرف کر لیں۔ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ جو نعمت بھی کسی کے پاس ہے وہ اللہ کی عطا کردہ ہے، خواہ حسن و جوانی ہو، اقتدار، حکومت ہو، مال و دولت ہو، طاقت و اختیار ہو۔ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے۔ اسے اللہ ہی کے حکم کے مطابق خرچ کرنے سے بندوں میں یہ احساس زندہ رہے گا کہ یہ ان کا ذاتی کمال نہیں ہے۔ اگر کسی کو علم عطا ہوا ہے تو اسے چاہیے کہ اس علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے، ان کو ہدایت کی طرف لائے۔ جسے طاقت عطا ہوئی ہے اسے لوگوں کی خدمت کرنی چاہیے، جسے اقتدار ملا ہوا سے لوگوں سے اللہ کے حکم کے مطابق انصاف کرنا چاہیے۔ فرمایا، جو نعمتیں ہم نے دی ہیں، ہماری راہ میں خرچ کریں سِرًّا وَّعَلَانِيَةً پوشیدہ بھی اور اعلانیہ بھی۔ جہاں اللہ نے علی الاعلان خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں علی الاعلان کرے جیسے جہاد کے لیے یا کسی قومی ضرورت کے لیے دینا، اعلانیہ دینا ہے، جہاں پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا ہے وہاں پوشیدہ طور پر لوگوں کو دیں۔

اسلام میں ٹیکس:

اسلام میں ایک ہی ٹیکس ہے اور وہ ہے زکوٰۃ، جس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مرکزی حکومت کو دی جائے۔ پھر یہ حکومت کا کام ہے کہ اس سے ملک کی دفاعی ضروریات پوری کرے، شفاخانے بنائے، تعلیمی ادارے بنائے، نظام تعلیم بنائے اور پورا ملکی نظام اس سے چلائے۔ اگر پورے ملک سے وصول شدہ زکوٰۃ کم پڑتی ہے اور ضرورت بڑھ گئی ہے تو ضرورت پوری کرنے کے لیے صاحب ثروت لوگوں پر ٹیکس لگا دیا جائے۔ یاد رہے! کہ ضرورت ٹل جائے تو ٹیکس ختم ہو جائے گا، حکومت کو بے جا ٹیکس لگانے کی اجازت نہیں ہے۔

فرصتِ عمل کو غنیمت جانو:

فرمایا، اللہ کی راہ میں اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اعلانیہ یا پوشیدہ خرچ کرو اس سے پہلے مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ (۳۱) کہ وہ دن آ جائے جس دن نہ کوئی اعمال کی سودے بازی ہو سکے گی نہ ہی کوئی دوستی کام آئے گی، یعنی قیامت کا دن۔ اس سے پہلے دنیوی زندگی میں ہی عمل کی فرصت ہے۔ چونکہ موت بھی ایک طرح سے قیامت ہی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے، فَمَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (حدیثِ مرفوع) او کما قال رسول اللہ ﷺ۔ جو مرتا ہے اس کی اپنی قیامت تو قائم ہو جاتی ہے۔ ایک دن قیامت کا وہ ہوگا جب ساری مخلوق ایک میدان میں جمع کی جائے گی۔ لیکن مرنے والے پر ایک طرح سے قیامت وارد ہو جاتی ہے کہ عمل کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اجر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لہٰذا موت سے پہلے پہلے یہ انتظام رکھو، عبادات کو قائم رکھو اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اللہ کی راہ پر خرچ کرتے رہو۔ کیونکہ جب موت آئے گی تو

اس کے بعد نہ توبہ قبول ہوگی نہ ہی دولت دے کر ثواب ملے گا کہ فرصتِ عمل ختم ہو چکی ہوگی۔ کوئی دولت لینے والا ہوگا نہ ہی خود دولت دینے کے قابل رہو گے۔ موت، دولت اور اقتدار سے تمہارا رشتہ منقطع کر دے گی۔ فقیر مر جائے تو بھی میت کہلاتا ہے، شہنشاہ مر جائے تو وہ بھی میت ہی کہلاتا ہے۔ دونوں مٹی میں دفن ہوتے ہیں۔ فقیر کی قبر پر مٹی کی ڈھیری بن جاتی ہے جبکہ شہنشاہ کے لیے سنگِ مرمر کا مقبرہ بن جاتا ہے۔ لیکن مقبرہ قبر کے حال کو متاثر نہیں کرتا۔ قبر کا حال وہی ہوتا ہے جو وہ دنیا سے کما کر لے گیا ہے۔ اب اگر وہ چاہے کہ میں وہاں اپنی دولت خرچ کر کے گناہ دھلوں تو یہ ممکن نہیں۔ یا یہ چاہے کہ میرا کوئی وزیر، یا جرنیل یا کوئی دوست میرے کام آئے تو ایسا ممکن نہیں ہوگا، وہاں وہی زادِ راہ کام آئے گا جو دنیا سے کما کر ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہاں جو دوستی کام نہیں آئے گی وہ دوستی ہے جو اللہ کے نافرمانوں سے کی گئی ہوگی۔ ایسی دوستی جو اللہ کی راہ سے بھٹکانے میں معاون ہو وہ خواہ کتنے با اثر شخص سے بھی کی گئی ہو ہرگز کام نہیں آئے گی کیونکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ البتہ جو دوستی اللہ کے بندوں سے کی جائے، انبیاء، صلحا اور نیک بندوں سے کی جائے اور اللہ کی طرف لے جائے تو وہ عین انعامِ باری ہے۔

عظمتِ باری:

اللہ کی عظمت تو یہاں ہے، سامنے ہے، اس کی تخلیق میں دیکھی جا سکتی ہے اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اللہ تو ایسا قادر و قیوم ہے جس نے زمینوں اور آسمانوں کو پیدا فرمایا۔ زمین میں اس قادرِ مطلق نے کتنے خزانے رکھے کہ جب سے حضرت آدمؑ نے اسے آباد کیا، اولادِ آدمؑ نے کھیتی باڑی کی، کتنے زمانے بیت گئے اور یہ تب سے اناج، پھل سبزیاں اور بے شمار رزق اُگل رہی ہے۔ کتنی مخلوقات استعمال کرتے کرتے گزر گئیں۔ زمین بہر حال ایک محدود شئے ہے مگر اس میں کتنے خزانے ہیں کہ کھربوں انسان، حیوان، پرندے، درندے کھاتے کھاتے گزر گئے اور آج بھی اس کا سینہ اللہ کے عطا کردہ رزق سے پُر ہے، سوئی دھرنے کی جگہ نہیں ہے۔ سب کھا رہے ہیں اور سارا رزق اسی زمین سے نکلتا چلا آ رہا ہے۔ کتنی وسعت ہے اس میں اور کب تک یہ خزانے اگلتی رہے گی؟ صرف غذا کا ہی اگر اندازہ لگایا جائے کہ جب سے یہ جہاں آباد ہوا ہے، انسانیت اگر یہاں اربوں سالوں سے آباد ہے تو اب تک کتنا اناج، کتنا پھل، کتنی سبزیاں اس زمین سے نکل چکی ہیں جو وہ استعمال کرتے رہے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اگر وہ تمام سبزیاں، پھل اور غلہ اکٹھا کیا جائے تو اس کا حجم زمین سے بڑھ جائے گا لیکن زمین ہے کہ مسلسل دیے ہی جا رہی ہے۔ پھر آخر کون ہے جس نے اس میں اتنا خزانہ سمو دیا ہے! وہ قادرِ مطلق اللہ ہے جس نے

آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔ اس نے کتنے عجائبات آسمانوں میں رکھے جو ہماری مادّی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی جان سکے ہیں جو دیکھ پاتے ہیں۔ وَاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ فرمایا، اللہ نے آسمان کی بلندیوں سے پانی برسایا۔ اس کی قدرت نے پانی کو بھاپ کی شکل دی جسے بادل کی صورت میں ہوا اڑائے پھرتی ہے۔ انہی بادلوں سے بجلی کڑکتی ہے، انہی بادلوں سے بارش برستی ہے، برف برستی ہے، اولے برستے ہیں۔ کہیں یہ بادل تباہی کا سبب بن جاتے ہیں جبکہ عموماً ساری زندگی آبادی کا سبب ہی بنتے ہیں۔ ہوا کو دیکھیں ٹنوں کے حساب سے پانی اٹھائے پھرتی ہے۔ جہاز جب بادلوں سے گزرتا ہے تو نہ پانی نظر آتا ہے نہ بجلی، لیکن جب گرجتا ہے تو بجلیاں کڑکتی ہیں۔ سائنسدان تجزیہ کرتے ہیں کہ بجلی کی ایک چمک میں اتنی روشنی ہے کہ اگر اسے ذخیرہ کرنے کا کوئی نظام ہو تو اس ایک چمک سے اتنی توانائی حاصل ہو سکتی ہے جو برسوں ایک ملک کو روشن رکھ سکتی ہے۔ بادلوں کے درمیان سے کیسا توانائی کا ذخیرہ مل سکتا ہے۔ لیکن جب یہ بادل زمین پر اتر آتے ہیں، ساون میں بھی اور سردیوں میں بھی اور ہم ان میں گزرتے ہیں تو کوئی بجلی محسوس نہیں ہوتی۔ جہاز گزرتے ہیں تو محسوس نہیں ہوتی مگر جب گرجتے ہیں تو نہ جانے کس قوت کی بجلی ان میں آجاتی ہے۔ وہ قادر ہے پھر اسی پانی سے قادر مطلق نے فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ زمین کے سینے سے تمہارے لیے رزق کے خزانے کھول دیے۔ پانی ایک ہی ہے، بے رنگ و بے ذائقہ ہے لیکن اس کے برسنے سے زمین سے انواع و اقسام کا رزق نکلتا ہے۔ ہر ایک کا رنگ، ذائقہ اور تاثیر جدا ہے۔ مٹی ایک ہی ہے، ساتھ ساتھ کھیت ہیں مگر اسی پانی سے زمین سے مختلف چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الۡفُلۡكَ لِتَجۡرِیَ فِی الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ اس نے تمہیں بحری جہاز بنانے کی توفیق دی جس سے سمندروں کے سینے چیرتے پھرتے ہو۔ یہ احساس رہے کہ جہاز تب تک ہی چلتے ہیں جب تک اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اللہ ہی انہیں سنبھالے ہوئے ہے۔

تکبر کا ایک جملہ:

اہلِ مغرب نے ایک بحری جہاز بنایا تھا جو ٹائی ٹینک (Titanic) کے نام سے مشہور ہے۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ پورے شہر کی آبادی قریباً پانچ سے سات ہزار لوگ اس میں آسکتے تھے۔ ان سواریوں کے علاوہ تقریباً ڈھائی ہزار جہاز کا عملہ اور اتنے افراد کا راشن، دوائیں ڈاکٹر اور خدام بھی اس میں سما سکتے تھے۔ اس جہاز کو اتنا مضبوط بنایا گیا تھا کہ کوئی بم بھی اس پر اثر نہ کر سکے۔ اس کے ارد گرد ربڑ کی موٹی تہیں لگائی گئیں تھیں کہ اگر کوئی گولہ یا بم لگے تو وہ دور جا کر گرے اور پھٹے۔ جب ہر طرح کے حفاظتی اقدامات کر لیے گئے تو پھر اسے سمندر میں اتارا گیا۔ جب اسے سمندر میں اتارا گیا تو یہ جملہ کہا گیا کہ "اب ٹائی ٹینک کو خدا بھی نہیں ڈبو سکتا"

(Not even God can sink this ship) یہ اتنا مضبوط ہے تو جب سواریوں سے بھرا ہوا اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا۔ غالباً پچھلے پہر عصر یا مغرب کے وقت روانہ ہوا اور اسی رات دس ہی بجے تھے، تاریکی پھیلی تو انہیں پتا چلا کہ برف کا ایک تودہ (گلیشیر) تیرتا ہوا تھوڑے ہی فاصلے پر سمندر میں آ گیا تھا۔ بڑا زور لگایا لیکن کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور وہ سیدھا آ کر جہاز سے ٹکرایا اور جہاز کو پھاڑ دیا۔ جہاز میں پانی داخل ہونا شروع ہو گیا۔ جہاز دو ٹکڑے ہو گیا۔ پانی ایک طرف سے داخل ہوا اتنا وزن بن گیا کہ آدھا اوپر رہ گیا اور آدھا درمیان سے ٹوٹ کر پہلا آدھا نیچے چلا گیا پھر دوسرا آدھا بھی بعد میں غرق ہوا۔ ان کا وہ متکبرانہ جملہ کہ ''اب اسے خُدا بھی نہیں ڈبو سکتا''، چند ہی گھنٹوں میں سامنے آ گیا اور اللہ نے اسے تہہِ آب پہنچا دیا۔

تو اللہ کریم فرماتے ہیں، یہ جو تم بحری جہازوں میں سفر کر رہے ہو، ہوائی جہازوں میں اڑ رہے ہو، ریل گاڑیاں ایجاد کر لی ہیں، یہ سب سواریاں اللہ کی عطا ہیں۔ یہ جہاز تب تک ہی کام دیتے ہیں جب تک اللہ انہیں تھامے رکھتا ہے، سہارا دیتا ہے، جب وہ سہارا نہیں دیتا تو تمہاری ساری کاریگری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهٰرَ (۳۲) وہ ایسا کریم ہے کہ اس نے دریا بھی تمہارے تابع کر دیے ہیں۔ کہیں ان سے مشینیں چلاتے ہو، کہیں بجلی پیدا کرتے ہو۔ کہیں ڈیم بناتے ہو، کہیں کھیتیاں سیراب کرتے ہو۔ ان سے جیسی چاہو خدمت لیتے ہو۔ اللہ نے تمہیں اختیار دے دیا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے سورج اور چاند کو بھی تمہاری خدمت پر مامور کر دیا ہے۔ دَآئِبَيْنِ دونوں اپنے مقررہ راستوں پر پوری پابندی سے چلتے ہیں۔ نہ کوئی اپنے راستے سے بھٹکتا ہے نہ ہی کوئی تقدیم و تاخیر کرتا ہے۔ نہ کوئی اپنے وقت سے پہلے آتا ہے نہ وقت کے بعد آتا ہے۔ اگر یہ ذرا سی بھی تقدیم و تاخیر کرتے تو دنیا تباہ ہو جاتی۔ کب سے یونہی چل رہے ہیں اور جب تک اللہ نے اس دنیا کو آباد رکھنا ہے چلتے رہیں گے۔ اللہ کریم نے ان کے راستے مقرر فرما دیے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۳۳) اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کر دیا اور اوقات کا پابند کر دیا۔ روشنی اور تاریکی، گرمی و سردی کا ایک منظم نظام بنا دیا۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ اور تمہارا ہر مطالبہ مانا، یعنی انسانی جسم گو بظاہر پانچ یا چھ فٹ کا وجود ہے مگر اس کی ضروریات بے شمار ہیں۔ اس کے مطالبات بے حد ہیں۔ جب تک یہ زمین پر زندہ رہتا ہے اس کے مطالبات ختم نہیں ہوتے، اس کی ضرورتیں مکمل نہیں ہوتیں۔ غذا دوا، لباس کی ضرورتیں ہی پوری نہیں ہوتیں۔ غذا ہے تو صبح الگ ہے شام کا کھانا الگ ہے۔ لباس ہے تو سردی میں الگ ہے گرمی میں الگ ہے۔ دن میں الگ ہے رات کو الگ ہے۔ اتنی ضروریات ہیں کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں، ایک پوری ہوتی ہے دس

نئی پیدا ہو جاتی ہیں۔ فرمایا، وہ ایسا غفور و رحیم ہے کہ جو کچھ بھی تمہارے وجود نے طلب کیا اس نے پیدا فرما دیا، کائنات میں مہیا فرما دیا۔ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ جس جس چیز کی تمہیں حاجت تھی، جو تمہاری خواہش، تمہاری ضرورت تھی اس کریم نے ہر چیز تمہارے لیے کائنات میں مہیا فرما دی۔

اللہ کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں:

فرمایا، وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنے بیٹھ جاؤ تو انہیں گنتے تمہاری عمر بیت جائے گی مگر تم شمار نہیں کر سکو گے۔ اللہ کی نعمتیں شمار نہیں ہو سکیں گی۔ اللہ کی نعمتیں بے حد و بے شمار ہیں کہ اگر انسان گننا بھی چاہے تو گن نہیں سکتا۔ اللہ کریم نے چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا، چاند، سورج، ستارے، بادل، ہوائیں سب کو اس کی خدمت پر لگا دیا۔ انسان خود نہیں جانتا کہ اگلے ہی لمحے اسے کس چیز کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ اس کی ضرورتیں ہر آن بدلتی رہتی ہیں، لیکن اس کریم نے اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے سارے ذرائع میسر کر دیے۔ اب انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان نعمتوں کا احساس کر کے ہی اللہ کا احسان مانتا، اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا اور پھر وہ اتنا کریم ہے کہ اس نے اپنے انبیاءؑ بھیجے، کتابیں بھیجیں اور یہ ساری نعمتیں گن گن کر بتائیں۔ لیکن بے شک انسان بے انصاف ہے اور ناشکرا ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۳۴) اس ربِّ کریم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے اس کے لیے اتنا اہتمام فرمایا۔ اور یہ شکر ادا نہیں کرتا، اللہ کا احسان نہیں مانتا۔ یہ بہت ناشکرا ہے۔

سورۃ ابراہیم رکوع 6 آیات 35 تا 41

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿٣٥﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٦﴾ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٧﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿٣٨﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿٣٩﴾ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ﴿٤٠﴾ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿٤١﴾

اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ بنا دیجیے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھیے ﴿۳۵﴾ اے میرے پروردگار! بے شک انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے پھر جو شخص میرا کہا مانے سو یقیناً وہ میرا ہے اور جس نے میری بات نہ مانی تو یقیناً آپ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۳۶﴾ اے ہمارے پروردگار! بے شک میں نے اپنی اولاد کو آپ کے عزت والے گھر کے پاس (کفِ دست) میدان

(مکہ) میں آباد کیا جہاں کھیتی بھی نہیں ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تا کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام رکھیں تو آپ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردیجیے اور ان کو پھل کھانے کو دیجیے تا کہ وہ (آپ کا) شکر کریں ﴿۳۷﴾ اے ہمارے پروردگار! بے شک آپ سب جانتے ہیں جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں۔ اور اللہ سے تو کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں (نہ) زمین میں اور نہ آسمان میں ﴿۳۸﴾ اللہ کو تمام حمد (وثنا) سزاوار ہے جس نے مجھ کو بڑی عمر (بڑھاپے) میں اسمٰعیل اور اسحٰق (علیہم السلام) (دو بیٹے) عطا فرمائے بے شک میرا پروردگار دعا کا بہت سننے والا ہے ﴿۳۹﴾ اے میرے پروردگار! مجھ کو نماز قائم کرنے والا بنایئے اور میری اولاد میں سے بھی۔ اے ہمارے پروردگار! اور میری دعا قبول فرمایئے ﴿۴۰﴾ اور اے ہمارے پروردگار! مجھ کو بخش دیجیے اور میرے ماں باپ کو اور تمام ایمان والوں کو جس دن حساب قائم ہوگا ﴿۴۱﴾

تفسیر ومعارف

اہلِ مکہ کا زعمِ باطل:

اہل مکہ کو اپنے آبائی عقیدے پر بڑا ناز تھا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ دینِ ابراہیمی پر ہیں اور چونکہ مکہ مکرمہ تو وہ شہر مبارک ہے جس کی بنیاد ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے رکھی لہٰذا انہیں اپنی حیثیت پر بڑا فخر تھا۔ ان کا یہ دعویٰ کہ وہ دینِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں سراسر غلط تھا اس لیے کہ وہ اس کو نہ صرف تبدیل کر چکے تھے بلکہ کفر وشرک میں مبتلا ہو چکے تھے، بت پرستی تک شروع کردی تھی۔ اس کے باوجود وہ کہتے تھے کہ ہم دینِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں۔

اللہ کریم ان کے اس زعمِ باطل کے جواب میں ارشاد فرما کر واضح کر رہے ہیں کہ اس شہر کی بنیاد کس نظریے پر رکھی گئی، اس دین کی اساس کیا ہے، اور تقابل میں دیکھ لو کہ تم کہاں کھڑے ہو؟ فرمایا، ایک وقت وہ تھا جب ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا اور وہ اپنی اہلیہ محترمہ اور ننھے بچے اسماعیل علیہ السلام کو لے کر روانہ ہوئے۔

بیت اللہ شریف:

مفسرینِ کرام اس کی تفصیل میں لکھتے ہیں کہ بیت اللہ شریف کی بنیاد تو حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی اور اوّل مرتبہ خانہ کعبہ انہوں نے تعمیر فرمایا تھا۔ طوفانِ نوح تک تو یہ قائم رہا پھر طوفانِ نوح میں یہ منہدم ہو گیا جبکہ حجرِ اسود کو اللہ کریم نے پہاڑوں میں محفوظ کر دیا۔ پھر ایک طویل مدت تک صرف بنیادوں پر ہی رہا۔ انبیاءؑ کو اللہ کریم نشاندہی فرما دیتے تھے، وہ یہاں تشریف لاتے تھے۔

بیت اللہ شریف کی پہلی صورت یہ تھی کہ بڑے بڑے پہاڑوں کے درمیان ایک اونچی سی، اور گول سی ٹیکری تھی جس کے اوپر بیت اللہ شریف تھا۔ تین چار نالوں کا پانی پہاڑوں کے درمیان سے بیت اللہ شریف میں آتا اور وہاں سے ایک طرف کو ایک نالے میں نکل جاتا۔ بیت اللہ کے گرداگرد بڑی گہری کھائی تھی اب تو یہ بھرتے بھرتے برابر ہو گئی۔ اب تو صفا اور مروہ بھی تقریباً برابر ہو گئی ہیں ورنہ یہ بھی اچھی خاصی بلند پہاڑیاں تھیں۔ جب حضرت نوحؑ کے زمانے میں طوفان آیا تو بیت اللہ شریف کی عمارت منہدم ہو گئی، اور صرف بنیادیں رہ گئیں، اور بنیادوں پر بھی مٹی پڑ گئی۔ جن انبیاءؑ کی قومیں عذاب کے سبب تباہ ہوئیں وہ اپنے علاقے چھوڑ کر بیت اللہ تشریف لے آئے، اور یہیں وقت گزار کر وصال پا گئے۔ مرورِ زمانہ نے مٹی ڈال دی، اور دفن ہوئے۔

ایک ولی اللہ کا کشف:

استاذی المکرّم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ ستر (70) کی دہائی کے اوائل میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ بیت اللہ میں حاضری نصیب ہوئی تو فرماتے ہیں کہ صرف مطاف کے نیچے ننانوے (99) انبیاءؑ کی زیارت انہیں کشفاً نصیب ہوئی جو وہاں دفن ہیں۔

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی اہلیہ محترمہ اور ننھے اسماعیل علیہ السلام کو بیت اللہ شریف کے پاس چھوڑ آئیں تو آپؑ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی راہنمائی میں روانہ ہوئے۔ چونکہ لق و دق صحرا تھا اور دور دور تک آبادی کا نشان نہیں تھا۔ جب پانی نہ ہو تو وہاں آبادی بھی نہیں ہوتی کہ پانی بنیادی ضرورت ہے۔ ایسی جگہ نہ سبزہ ہو سکتا ہے نہ کھیتی باڑی لہٰذا انسان تو کیا حیوان بھی نہیں رہتے۔ پرندے اور درندے بھی نہیں رہتے۔ اہل عرب جب صحراؤں میں سفر کرتے تو اگر کسی سمت پرندے اڑتے دیکھتے تو اس طرف رخ کرتے کہ ضرور وہاں کوئی چشمہ یا پانی کا کوئی انتظام ہوگا جو پرندے جا رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی اہلیہ محترمہ اور اسماعیل علیہ السلام کو یہاں چھوڑ دیں اور خود واپس چلے

جائیں۔ حدیث شریف میں یہ قصہ آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں چھوڑ کر چلنے لگے تو مائی صاحبہ نے پوچھا کہ اس ویرانے میں جہاں کوئی پرندہ بھی نہیں، کوئی درندہ بھی نہیں، زندگی کا کوئی وسیلہ بھی نہیں تو ہمیں آپؑ کس کے بھروسے پر چھوڑ کر جارہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا، اللہ کے بھروسے پر جس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم دونوں کو یہاں چھوڑ دوں۔ مائی صاحبہ نے بڑا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ اگر آپؑ اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر جارہے ہیں تو اللہ ہمیں ضائع نہیں کریں گے، اور مطمئن ہوگئیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عالمِ پیری میں اللہ کریم نے اولاد عطا کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر لگ بھگ ایک سوبیس برس تھی جبکہ مائی صاحبہ نوے (90) برس کی تھیں۔ تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام چھوڑ کر واپس پلٹے اور آنکھوں سے وہ منظر اوجھل ہوگیا اور پہاڑ کی پشت پر پہنچے تو رک گئے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، اس وقت میرے بندے ابراہیمؑ، میرے خلیل نے یہ دعا فرمائی، وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے۔ ذرا اندازہ کیجیے کہ لق ودق صحرا اور ویرانی ہے، سیاہ وسنگلاخ پہاڑ کھڑے ہیں، ہر طرف چٹانیں ہی نظر آتی ہیں۔ کوئی سبزہ، جھاڑی کوئی درخت بھی نہیں۔ دُور سے یوں نظر آتا ہے گویا جلے ہوئے کوئلے کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ چاروں اطراف گہری وادیاں ہیں اور کوئی ذی روح نظر نہیں آتا۔ اور اللہ کے خلیل دعا مانگ رہے ہیں کہ اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے۔ یہ نگاہِ نبوت تھی جو بہت دور تک دیکھ رہی تھی۔ یہ اللہ کے خلیل تھے جو اس شہر کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ماوشما کی نظر میں تو ایک ویرانہ تھا جہاں ایک ننھے بچے اور ایک عمر رسیدہ خاتون کو چھوڑ دیا گیا۔

دُعا کی برکت:

کتنی صدیاں بیت گئیں لیکن دعائے خلیلؑ سے آج بھی وہاں امن ہے۔ الحمد للہ! اور اللہ کرے ہمیشہ رہے۔ زمانے کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ لیکن اللہ کے فضل سے وہاں کا امن خراب نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ قائم رکھیں۔ آمین۔

دُعا میں سبق:

دعائے خلیلؑ میں ایک بنیادی سبق ہے، کسی بھی قوم، حکمران، حکومت یا عام شہری کے لیے اور وہ ہے کہ کسی بھی ملک یا شہر کی آبادی کی بنیاد امن ہوتا ہے۔ جہاں امن نہیں ہوگا اسے آپ شہر کہتے رہیں لیکن وہ ویرانہ ہوگا اور زندگی درندوں کی طرح ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے میں گزرے گی۔ ہر طاقتور کمزور کو چیر پھاڑ دے گا۔ شہروں کی، ممالک کی اور اقوام کی آبادی کا دارومدار امن پر ہے۔ تو آپؑ نے کتنی جامع دعا فرمائی اور اللہ کی صفت ربوبیت کو

پکارا کہ اے میرے پروردگار! اپنی ربوبیت کے صدقے اس شہر کو شہرِ امن بنا دے وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۳۵) اللہ! مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے محفوظ رکھنا۔ اللہ کا نبیؑ اور بتوں کی پوجا! نبی تو معصوم ہوتے ہیں۔ اور جس بیٹے کو دعا میں ساتھ شامل کر رہے ہیں وہ بھی نبیؑ ہیں۔

بت صرف پتھر کے نہیں ہوتے:

ہم سمجھتے ہیں بت صرف پتھر کے ہوتے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ خواہشات کے بُت پتھر کے بتوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ہر وہ خواہش جو اللہ کی اطاعت سے روکے وہی بت ہے۔ ہر وہ فکر، وہ خیال بُت ہے جو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جائے۔ لحۂ فکریہ یہ ہے کہ خواہشات کے بُت تو بڑے بڑے اہل اللہ اور عالم و فاضل لوگوں کے اندر بھی آ جاتے ہیں کہ مجھے بڑا مانا جائے، میری عزت کی جائے، مجھے تحفے دیے جائیں، میری دُعا، بددعا کے ساتھ امیدیں وابستہ کر لی جائیں، تو بندہ خود بھی بُت بن جاتا ہے۔ جیتا جاگتا انسان بُت بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس سے بھی توقعات وابستہ کر لی جائیں اس کے لیے وہی بُت بن جاتا ہے۔

ہر وہ خواہش بُت ہے جو گناہ کی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی ہو۔ بشری تقاضوں سے گناہ سرزد ہو جانا ایک الگ بات ہے۔ اس پر ندامت ہو، توبہ کی جائے تو معاف ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان کی سوچ جب بھٹکتی ہے تو وہ اپنی غلطی کا جواز تلاش کرنے لگ جاتا ہے۔ غلطی کرتا ہے اور دلیل دیتا ہے کہ فلاں نے بھی ایسے کیا، فلاں نے ایسا کہا تھا۔ بھئی! دلیل صرف اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ میرے مالک! میری اور میرے بچوں کی ان مجسم اور غیر مجسم افکار اور ارادوں کے بتوں سے بھی حفاظت فرما۔ کبھی تیری نافرمانی کا خیال بھی ہمارے دلوں میں جاگزیں نہ ہو۔ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ اے پروردگار! ان بتوں نے تو تیری بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا۔ یہ خواہشات کے بُت، امیدوں کے بُت، غلط افکار کے بُت، یہ ایسے خطرناک بُت ہیں کہ انسان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ان بتوں نے تو تیری کثیر مخلوق کو راہ سے بھٹکا دیا۔

اطاعت سے ہی نسبت برقرار رہتی ہے:

انبیاءؑ کتنے کریم ہوتے ہیں پھر دعا فرمائی، بارِ الٰہا! فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ جو میری پیروی کرے گا، میری اطاعت کرے گا، وہ تو میرا ہی ہوا۔ جو کرم و احسان تیرا مجھ پر ہے، میری اتباع کرنے والا اس کے سائے میں آ گیا۔ وہ تو میرا ہو گیا۔

آج کے مسلمانوں میں الحمدللہ! ایک عجیب جذبہ ہے۔ جیسے بھی ہیں، جہاں بھی ہیں، نبی کریم ﷺ کا نام آئے تو سب فدا ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے سارا عالمِ کفر پریشان ہے کہ یہ کیسی قوم ہے کہ یہ جیسے بھی ہوں، گناہگار ہوں، بے دین ہوں، دین کا زیادہ علم نہ بھی رکھتے ہوں پھر بھی جب حضور ﷺ کا نام آتا ہے تو جان دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کا توڑ عالمِ کفر کے پاس نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یہ خود سوچنا ہو گا کہ ہمیں حضور ﷺ کا ساتھ کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ صرف اطاعت اور اتباع سے۔ اگر ہم نبی کریم ﷺ کی غلامی کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے کردار کا جائزہ لینا پڑے گا کہ ہم آپ ﷺ کی کتنی اطاعت کرتے ہیں؟ ہر قدم پر، زندگی کے ہر لمحے میں آپ ﷺ کی اطاعت لازمی ہے۔

انبیاءؑ کی شانِ کریمی:

انبیاءؑ کے قلوب میں اللہ کی رحمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ کیسی شانِ کریمی ہے کہ فرماتے ہیں، وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳۶) اور جو میری نافرمانی کرے گا تو تُو بخشنے والا مہربان ہے۔ کہ بندے کی نافرمانی پروردگارِ عالم تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے، تُو کریم ہے اگر تو گنہگاروں پر بھی رحمت کر دے تو کون روک سکتا ہے۔ تیری رحمت تو بے پناہ ہے، تُو غفور رحیم ہے، تُو بخش سکتا ہے۔ یہ شانِ کریمی ہے انبیاءؑ کی۔ اور نبی کریم ﷺ تو رحمۃ اللعالمین ہیں، آپ ﷺ تو مجسم رحمت ہیں اور آپ ﷺ کے کرم کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ احساس زندہ رکھنا چاہیے کہ ہم آپ ﷺ کی اطاعت کا حق ادا کریں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے عرض کی کہ اللہ! اس شہر کو امن کا شہر بنا۔ وہ بات مستقبل کی تھی جو اللہ نے ان کے سامنے رکھ دیا۔ اب حال کی بات کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں، رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ ... (۳۷) یا ربّ! میں نے اس اُجاڑ بیابان میں اپنی اولاد کو چھوڑ دیا ہے۔ میدان ہے، ویران پہاڑ ہیں، کوئی زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ مگر تیرا حکم تھا کہ یہاں تیرا عزت والا گھر ہے، بیت اللہ ہے، تیری ذاتی تجلیات کا مرکز ہے۔ پروردگارِ عالم! تیرے حکم کے مطابق میں نے اپنی اولاد کو تیرے محترم و معزز گھر کے پاس چھوڑ دیا۔ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ تاکہ تیرے گھر کے پاس تیری عبادت کرنے والے بھی ہوں۔ تیری عبادات کو قائم رکھیں۔ تیرے اطاعت گزار، تجھے یاد کرنے والے بندے ہوں جو تجھے رکوع و سجود کرتے رہیں۔ تیری تسبیح و تہلیل کرتے رہیں۔ اب تُو مہربانی فرما۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ ... (۳۷) تُو لوگوں کے دلوں کو پھیر دے کہ وہ ان کے پاس آجائیں اور یہ شہر آباد ہو جائے۔ آپؑ کی اس دعا میں بھی بہت حکمت ہے کہ آپؑ نے خود منتخب نہیں فرمایا کہ کسی خاص

قوم کو بھیج دے، یا کسی مخصوص قبیلے کو بھیج دے۔ بلکہ فرمایا، اے میرے پروردگار! تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے۔ اس دُعا میں یہ حکمت تھی کہ اللہ جنہیں چنے گا وہ یقیناً اچھے بندے ہوں گے۔ جبکہ اگر میں کسی کی نشاندہی کروں، یا کسی خاندان یا قبیلے کا کہہ دوں، نہ جانے اس میں کیسے کیسے لوگ ہوں، اچھے بھی ہوں اور شاید ایسے بھی ہوں جو اچھے نہ ہوں۔ تو انتخاب اللہ کریم پر چھوڑا کہ جن لوگوں کو اللہ کریم توفیق دیں گے وہ یقیناً اللہ کے بندے ہوں گے۔ تو فرمایا، شہر کو اپنے بندوں سے آباد کردے، ان کے دل اس کی طرف مائل کردے۔

پھر رزق کے لیے دعا فرمائی۔ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ اے اللہ! ان کے لیے پھل عام کردے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس دعا میں حکمت دیکھیں! پھل وہ نعمت ہے جو اناج، سبزیاں سب کے بعد حاصل ہوتا ہے یعنی جہاں پھل ہوتے ہیں وہاں باقی تمام کھانے کی چیزیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ تو آپؑ نے ایک ایک چیز نہیں گنی کہ انہیں آٹا بھی بہم پہنچا، دالیں بھی دے، سبزیاں بھی دے، پیاز بھی دے بلکہ فرمایا، وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ انہیں پھلوں سے شادکام کردے۔ ان کے لیے ہمیشہ پھلوں کی فراوانی رہے۔ اس میں حکمت تھی کہ جہاں پھل ہوں گے وہاں ساری غذائیں ہوں گی۔ چونکہ پھل تو سب سے اعلیٰ نعمت ہے۔ اور آج بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ جہاں باغات اور پھل میسر ہیں وہاں ہر فصل ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا اثر:

الحمدللہ! مکہ مکرمہ میں دُنیا کا ہر پھل ہمہ وقت دستیاب ہے۔ نہ موسم کی کوئی قید ہے، نہ ہی فاصلوں کی۔ اور آپؑ کی دُعا سے مکہ مکرمہ میں مثالی امن قائم ہے۔ مشاہدہ ہے کہ بڑی شارع پر زیورات کی دکانیں ہیں جن میں منوں کے حساب سے سونا ہے۔ شیشے کی دیواریں ہیں جو شاید ہاتھ کی ضرب سے ہی ٹوٹ جائیں۔ دکاندار رات کو بند کرکے چلے جاتے ہیں اور روشنی جلتی چھوڑ جاتے ہیں۔ جبکہ زیورات نمائش کے لیے رکھے ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو جھانکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ دکاندار اشیائے ضرورت کا سامان دور تک دکان کے باہر سجا دیتے ہیں۔ جیسے ہی اذان ہوتی ہے تو ایک جال سا اٹھا کر ایک دروازے سے اٹکا کر ساری بوریوں کے گرد پھیر کر، دوسرے دروازے سے اٹکا دیتے ہیں۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ دکاندار نماز پڑھنے چلا گیا ہے اور دکان بند ہے۔ انسانوں کے لیے تو وہ جال کافی ہیں لیکن بازاروں میں جو آوارہ کتے ہوتے ہیں وہ بھی ان بوریوں کو نہیں چھیڑتے۔ جانور بھی اس امن کے پابند ہیں۔ اللہ کریم اس امن کو ہمیشہ قائم رکھیں۔

شکر کی حقیقت:

فرمایا، وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ان کو رزق کے طور پر پھل عطا فرما۔ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۳۷) تا کہ یہ تیرا شکرادا کریں۔ یعنی اللہ کی نعمتیں نصیب ہوں تو یہ مقامِ شکر ہے۔ شکر کا بہترین معنی یہ ہے کہ پورے خلوص، پورے خشوع وخضوع سے اللہ کی اطاعت اور حضور اکرم ﷺ کا اتباع کیا جائے۔ کوئی زبانی کہتا رہے یا شکرانے کے نفل پڑھے تو، شکر تو ہے، لیکن شکر کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ہر عمل حضور اکرم ﷺ کی غلامی میں ڈھل جائے۔

امن اور عبادت:

اس دُعا میں دین اور دنیا کا کتنا خوبصورت امتزاج ہے۔ اپنے ننھے سے بچے اور اپنی رفیقۂ حیات عفیفہ حضرت ہاجرہ کو چھوڑ رہے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! اس شہر کو امن کا شہر بنا۔ یادرہے! جہاں امن ہوتا ہے وہیں عبادت اور اتباع کا لطف ہوتا ہے۔ اور امن آتا ہے شکرانِ نعمت سے۔ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۳۷) اور دُعا کا اختتام اس پر کیا "تاکہ یہ تیرے شکرگزار ہوں"۔

بشری خصوصیات اور انبیاءؑ:

انبیاء کرامؑ انسان ہوتے ہیں اور تمام انسانی یا بشری خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں بھی خوشی ہوتی ہے، دکھ بھی ہوتا ہے۔ تکلیف بھی ہوتی ہے، آرام بھی پہنچتا ہے۔ بیماری بھی آجاتی ہے، صحت بھی ملتی ہے۔ گرمی سردی بھی محسوس ہوتی ہے اور بھوک پیاس بھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس کیفیت سے دوچار تھے کہ اپنی نوے (90) سالہ رفیقۂ حیات کو اس عمر میں بغیر کسی ظاہری سہارے کے، بغیر کسی زندگی کے سبب کے، ننھے بچے کے ہمراہ چھوڑ کر جارہے تھے۔ اس کا اظہار اللہ سے فرمارہے ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ... (۳۸) اے پروردگار! جو ہم پر بیتتی ہے وہ تُو جانتا ہے، جو ہم سوچتے ہیں وہ تیرے علم میں ہے۔ جو ہم کلام کرتے ہیں وہ تُو جانتا ہے اور جو سفر میں دل پر بیتی ہے وہ بھی تیرے سامنے ہے۔ بیوی اور بیٹے کو چھوڑنے کا جو حادثہ دل پر بیتا ہے وہ بھی تیرے سامنے ہے اور جو میں زبان سے عرض کر رہا ہوں وہ بھی تُو جانتا ہے۔ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۳۸) کائنات کے کسی گوشے میں کوئی شئے اللہ سے پوشیدہ نہیں۔ ہر چیز ہمہ وقت پیش رُو ہے۔ نہ زمینوں میں کوئی چیز پوشیدہ ہے اور نہ ہی آسمانوں میں اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ ہے۔ تو سارا دکھ

بیان کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ تجھ سے تو کچھ پوشیدہ نہیں۔ تُو دلوں کے راز جانتا ہے۔ اس قربانی سے جو دل پر بیتی ہے تُو اس سے واقف ہے۔ اور جہاں تک میری بات ہے تو میں عرض کردوں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ۔۔۔(۳۹)

مصیبت میں نعمتیں شمار کرنا:

فرمایا، اے اللہ! میں تو تیری اس ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کرسکتا کہ تُو نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے فرزند عطا فرمائے۔ ایسے بیٹے عطا فرمائے جن کی پیشانیاں نورِ نبوت سے منور ہیں۔ اور اس وقت نوازے جب بظاہر ان کے عطا ہونے کا کوئی آسرا، یا اُمید نہیں تھی۔ ضعف پیری میں بظاہر صاحب اولاد ہونے کے کوئی اسباب نہیں تھے۔

دُعا کا سلیقہ:

فرمایا، اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ(۳۹) میرا پروردگار دعائیں سننے والا یعنی دعائیں قبول فرمانے والا ہے۔ سمیع کا مطلب تو سننے والا ہے۔ لیکن جو بات سن کر مانی نہ جائے، تو پھر کیا سنی؟ پھر تو سننا نہ سننا برابر ہو گیا۔ تو فرمایا، میرا پروردگار دعائیں سننے والا ہے یعنی قبول کرنے والا ہے۔ آپؑ نے اس دعا میں یہ فرمادیا اِنَّ رَبِّیْ پہلے تو اسے اپنا ربّ، اپنا پروردگار مانو۔ اگر دعا کرنا چاہتے ہو، دعا کی قبولیت چاہتے ہو، تو پہلے اسے اپنا ربّ تو مانو۔ اگر تمہاری آرزوئیں اور امیدیں غیر اللہ سے وابستہ ہیں۔ تمہاری پیشانی بتوں کے آگے جھکی ہوئی ہے اور دعا اللہ سے کررہے ہو تو تمہاری طرف سے تو رابطہ ہی استوار نہیں ہوا۔ بات آگے جائے گی ہی نہیں۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ رابطے کے دو سِرے ہوتے ہیں۔ کہنے والے کے پاس ایک سرا ہوتا ہے اور سننے والے کے پاس دوسرا۔ جیسے مقرر کی بات سننے والے تک سپیکر کے ذریعے پہنچتی ہے۔ اب اگر سپیکر کا کنکشن ہی صحیح نہ ہو تو سننے والا سن نہیں سکے گا اور اگر کہنے والے کی طرف سے گڑبڑ ہے تو بات نہیں ہو سکے گی۔ تو دُعا میں اللہ کو ربّ مانا جائے تمام امیدوں کا مرکز بنایا جائے تو پھر بات بنے گی۔ یعنی ان دو لفظوں میں دُعا کا سلیقہ بتا دیا کہ دُعا مانگنے والے کا عقیدہ درست ہو۔ یعنی ویسا عقیدہ ہو جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ساری اُمیدیں اللہ کی ذات سے وابستہ ہوں تو پروردگار دعائیں قبول فرمانے والے ہیں۔ اور یہ سلیقہ بھی تعلیم فرمایا کہ دُعا کے شروع میں اللہ کے نیک بندوں کو شامل کرلو کہ اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اللہ کے نبیؑ تھے، اللہ کے مقبول بندے تھے، ان کے فرزند عالی تھے۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود خلیل اللہ تھے۔ لیکن دُعا کرتے ہوئے ان کا بھی ذکر فرمادیا کہ میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے

اسمعیلؑ عطافرمایا، مجھے اسحٰقؑ عطافرمایا۔ تو دُعا سے پہلے اگر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجا جائے، بزرگوں کے حوالے سے دُعا کی جائے تو اس میں قبولیت کی استعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ مومن کی دُعا کبھی ردّ نہیں ہوتی بشرطیکہ مومن ہو۔ اور مومن دعویٰ سے نہیں بلکہ کردار سے ہوتا ہے تو دُعا مانگنے کا سلیقہ یہ ہے کہ آپ خالص ہو کر، صرف اللہ کے ہو کر اللہ کے پاس جائیں، پھر اللہ کے نیک بندوں کو شامل کرلیں اور پھر سب کی اجتماعی بخشش، اجتماعی قبولیت کی دُعا کریں۔ اللہ کے کرم سے یہ بعید ہے کہ وہ آدھی قبول کرلے اور آدھی چھوڑ دے۔ وہ جب مانے گا تو ساری مانے گا۔

سورۃ الفاتحہ، بہترین دُعا:

سورۃ الفاتحہ سب سے اعلیٰ دُعا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اللہ کی عظمت کا ذکرِ خیر ہے۔ اس کی شان کے مطابق اس کی تسبیح کی جائے۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ ابھی تک واحد متکلم میں بات کر رہا تھا کہ یکا یک جمع متکلم پر آ گیا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ ہم سب صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اس 'ہم' میں انبیأ، صلحأ، علمأ اور ہر عبادت کرنے والے متنفس کو شامل کرلیا۔ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ ہم سب تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔

یہی سلیقہ ہے دُعا کا کہ اللہ کی حمد وثنا کی جائے، اللہ کے نبی ﷺ پر درود بھیجا جائے، اللہ کے نیک بندوں کو شامل کیا جائے اور سب کے لیے دُعا کی درخواست کی جائے تو یہ قبولیت کے قریب تر ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی، رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ اے میرے پروردگار! مجھے ہمیشہ نماز قائم رکھنے والا بنا۔ ہر حال میں تیری عبادت کروں۔ زندگی کی کوئی مصروفیت، کوئی مشکل مجھے فرائض کی ادائیگی سے نہ روک پائے۔ مجھے عبادت کی توفیق ہمیشہ دیے رکھنا۔ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ اور میری اولاد پر بھی یہ احسان فرما، انہیں بھی عبادت پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ اے ہم سب کے پروردگار! میری گزارشات قبول فرما۔ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ اے ہمارے پروردگار! مجھے، میری ذات کو معاف فرمادے وَلِوَالِدَیَّ اور میرے ان بزرگوں کو جو میرے لیے دنیا میں آنے کا سبب بنے۔

والدین کا مقام:

والدین نے مجھے پالا پوسا، صحت مند جوان بنایا تو مجھے توفیق ہوئی، انہوں نے مجھے بتایا کہ میرا ربّ کون ہے! یعنی والدین کا بہت بڑا مقام ہے لیکن تب ہے جب وہ بچے کو مسلمان بنائیں۔ اپنا حق ادا کریں۔ آج جدید تہذیب کے دلدادہ لوگ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ بیٹے کو پڑھایا لکھایا، امریکہ میں پڑھایا، برطانیہ میں پڑھایا،

آکسفورڈ میں پڑھایا اور اب وہ نافرمان ہو گیا ہے، بات نہیں مانتا ہے۔ آخر انہوں نے بچے پر کون سا احسان کیا ہے، کیا بچے کو مسلمان بنایا؟ تو پھر وہ والدین کس بات کا احسان دھرتے ہیں؟ یوں تو جنگل میں جانور بھی بچے دیتے ہیں، وہ پل بھی جاتے ہیں اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تو کبھی پلٹ کر یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی ماں کون ہے اور باپ کون ہے؟ جانوروں کے بچے کبھی نہیں پوچھتے تو اگر والدین نے بچے کو انسان ہی نہیں بنایا تو وہ کس لیے پوچھے؟ انسان بنانے سے مراد ہے کہ اسے بہترین مسلمان بنایا جائے۔ انہی ماؤں کے قدموں تلے جنت ہے جو انہیں حلال دودھ پلاتی ہیں اور انہیں اللہ کا بندہ بناتی ہیں۔ اور انہی باپوں کی یہ عظمت ہے جو بچوں کو انسان یعنی مسلمان بناتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ بچوں کو دنیوی علوم نہ پڑھاؤ، انہیں دنیا کے بہترین علوم پڑھاؤ، ڈاکٹر بناؤ، انجینئر بناؤ، سائنسدان بناؤ، مؤرخ بناؤ، ادیب بناؤ، دانشور بناؤ لیکن پہلے مسلمان بھی تو بناؤ۔ انہیں دین کی خبر بھی تو دو۔ دین کی سمجھ بھی تب ہی آتی ہے جب دنیوی علوم میں بھی دسترس حاصل ہو کیونکہ ایسا شخص دنیا کا تقابل کر کے یہ دیکھ سکتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم میں کتنا حسن ہے اور اس کے خلاف کرنے میں کتنی قباحت۔ جسے دنیا کی خبر ہی نہ ہو وہ نیک تو ہو سکتا ہے لیکن تقابل نہیں کر سکتا۔

اگر والدین بچے کی دینی تربیت نہیں کرتے، تو پھر انہیں شکایت نہیں کرنی چاہیے۔ پھر جیسے تیسے اپنا بڑھاپا گزارنا چاہیے کہ یہ سب ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے اسے انسان نہیں بنایا تو پھر وہ جانور کا بچہ ہے اور جانوروں کے بچے والدین کو بڑھاپے میں پوچھنے نہیں جاتے۔ اکثر لوگ دیکھے ہیں جن کے بچے افسر ہیں لیکن ماں باپ کے پاس دو وقت کا کھانا نہیں ہے۔ جو ذرا زیادہ مہذب بچے ہیں وہ ماں باپ کو پکڑ کر خیراتی اداروں میں چھوڑ آتے ہیں کہ انہیں پکا پکایا کھانا میسر رہے۔ اگر وہ بچے مسلمان بھی ہوتے، ان کے پاس انبیاءؑ کی تعلیمات بھی ہوتیں اگر اُن بچوں نے یہ آیات بھی پڑھی ہوتیں تو پھر وہ والدین کے خادم ہوتے اور ان کی خبر گیری بھی کرتے اور ان کے لیے دُعائیں بھی کرتے۔ جو بچہ والدین کے لیے دُعا کرتا ہے اسے پھر اتنی شرم تو آئے گی کہ میں اللہ سے والد کی صحت کے لیے دُعا تو کر رہا ہوں کیا میں والد کے علاج معالجہ کا اہتمام بھی کر رہا ہوں؟ وہ خود ماں باپ کی خدمت کرے گا تو ان کے لیے اللہ سے بخشش بھی چاہے گا۔

فرمایا، اللہ مجھے اپنی عبادت قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی، اللہ! ہماری دُعا قبول فرما اور مجھے بخش دے، میرے والدین کو بخش دے وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ اور تمام ایمان والوں کو بخش دے۔ اب ساتھ ایمان کی قید بھی آگئی یعنی والدین بھی دُعا کے تب ہی مستحق ہوں گے جب ان میں ایمان اور عقیدہ صحیح ہو گا۔ اگر عقیدہ صحیح نہیں ہے تو بھی

والدین کی خدمت کرنا اولاد پر فرض ہے۔ آپ ﷺ کا حکم ہے کہ اولاد پھر بھی ان کی خدمت کرے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے، فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْ هُمَا (بنی اسرائیل: 23) والدین سے بیزاری سے بات نہ کرے، نہ ان سے اپنی طبیعت کو بیزار ہونے دے، انہیں بوجھ نہ سمجھے۔ اگر وہ مسلمان نہیں ہیں پھر بھی والدین تو ہیں اور اولاد کے ذمے واجب ہے کہ ان کی عزت کرے۔ یہ حسن سلوک آپ ﷺ واجب کر رہے ہیں تو اگر اولاد کو آپ ﷺ کی تعلیمات سے آشنا ہی نہیں کیا جائے گا تو وفا کی امید کیونکر رکھی جا سکتی ہے؟ بخشش کے لیے آپ ؑ نے ایمان کی قید بڑھا دی کہ بخشش تب ہوگی جب وہ مومنین ہوں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ اے پروردگار! جتنے بھی لوگ ایمان لائے ہیں سب کو بخش دے يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ کہ ایک بڑا سخت دن آرہا ہے جب سارے حساب کتاب جوڑے جائیں گے تو اے اللہ! مجھ پر، میری اولاد پر، میرے والدین پر اور تمام ایمان والے لوگوں پر رحم فرما، ان کی بخشش فرما۔

یہ خوبصورت جامع دُعا تھی اور یہ پس منظر تھا دین ابراہیمی ؑ کا، اور مکہ والے اسی زعم میں مبتلا تھے کہ وہ چونکہ دینِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں لہٰذا وہ آپ ﷺ کی بات کیوں مانیں۔ فرمایا، دینِ ابراہیمی ؑ تو یہ ہے۔ اب تم اپنے عقیدے، اپنے نظریات اور اپنے کردار کو دیکھو اور فیصلہ کرو کہ دینِ ابراہیمی ؑ پر اللہ کا رسول ﷺ اور اس کی امت ہے یا تم ہو؟ بلکہ تم : بہت دور جا چکے ہو۔

سورۃ ابراہیم رکوع 7 آیات 42 تا 52

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ ۙ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿ؕ۴۳﴾ وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾ وَّسَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿ؕ۴۷﴾ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَی الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ﴿ۚ۴۹﴾ سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰی وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۙ﴿۵۰﴾ لِیَجْزِیَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِیُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِیَعْلَمُوْۤا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِیَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے باخبر نہیں۔ بے شک ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس روز (ان کی) نگاہیں پھٹی رہ جائیں

گی۔﴿۴۲﴾ اپنے سر اٹھائے ہوئے (میدانِ حشر کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے ان کی نظریں خود ان کی طرف نہ لوٹیں گی (کہ اپنے حال کی خبر ہو) اور ان کے دل (مارے ڈر کے) ہوا ہو رہے ہوں گے ﴿۴۳﴾ اور لوگوں کو اس دن سے ڈرایئے جب ان پر عذاب آئے گا تب ظالم لوگ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم کو تھوڑی سی مدت تک مہلت عطا فرمایئے تا کہ ہم آپ کا ارشاد (دعوتِ توحید) مان لیں اور پیغمبروں کی پیروی کریں (ارشاد ہوگا) تو کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہ کھاتے تھے کہ تم کو کبھی زوال نہ ہوگا ﴿۴۴﴾ اور تم ان (پہلے) لوگوں کی جگہوں میں رہے جنہوں نے اپنی جانوں پہ ظلم کیا اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا اور ہم نے تم سے مثالیں بیان فرمائیں ﴿۴۵﴾ اور یقیناً ان لوگوں نے اپنی بہت سی تدبیریں کیں اور ان کی تدبیریں اللہ کے سامنے تھیں اور وہ تدبیریں ایسی (غضب کی) تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں ﴿۴۶﴾ پس تم یہ گمان نہ کرنا کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں سے جو وعدہ فرمایا ہے اس کے خلاف کریں گے بے شک اللہ زبردست (اور) بدلہ لینے والے ہیں ﴿۴۷﴾ جس دن زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان (بھی) اور سب لوگ اللہ واحد (اور) زبردست کے روبرو پیش ہوں گے ﴿۴۸﴾ اور اس دن تم گناہگاروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھو گے ﴿۴۹﴾ ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے اور ان کے چہروں پر آگ لپٹی ہوگی ﴿۵۰﴾ تا کہ اللہ ہر (مجرم) شخص کو اس کے کیے کی سزا دیں بے شک اللہ بڑی جلدی حساب لینے والے ہیں ﴿۵۱﴾ یہ (قرآن) لوگوں کے نام پیغام ہے تا کہ اس سے انہیں (انجام بد سے) ڈرایا جائے اور تا کہ وہ جان لیں کہ وہ اکیلا ہی معبود ہے اور تا کہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۲﴾

تفسیر و معارف

فرمایا، وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ کسی کو یہ خیال نہ گزرے کہ جو لوگ ظلم کر رہے ہیں، اللہ کی نافرمانی کر رہے ہیں ان کا بظاہر کچھ نہیں بگڑ رہا۔ اللہ کریم کی ذات والا صفات کو ہر کسی کی خبر ہے۔

عمومی رویہ:

نفسِ انسانی بھی عجیب باتیں سوچتا ہے، اور یہ بہت عجیب بات ہے کہ اچھے انسانوں کی پیروی بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب کم ہی ہوتے ہیں۔ اکثریت کے لیے برائی مثال بنتی ہے کہ فلاں نے چوری کی تو وہ پکڑا نہیں گیا لہٰذا میں بھی چوری کر لوں یا فلاں نے قتل کیا اور دوسرے دن رہا بھی ہو گیا، کون پوچھتا ہے تو میں بھی قتل کر لوں تو انسانی نفس برائی کی طرف بہت بھاگتا ہے اور اس کے لیے مثالیں تلاش کرتا ہے۔ یا پھر یوں کہتا ہے کہ جو نماز پڑھتے ہیں یا روزے رکھتے ہیں تو کون سا تیر مارتے ہیں۔ اور جو نماز نہیں پڑھتے ان کا کیا بگڑ جاتا ہے بلکہ وہ تو ان نمازیوں سے زیادہ خوشحال ہیں زیادہ مزے میں ہیں۔ فرمایا یہ مت بھولو کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کریم کے روبرو کر رہے ہیں۔

وقتِ مقررہ تک مہلت:

تو پھر ان کی پکڑ کیوں نہیں ہوتی؟ فرمایا، اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ انہیں ایک خاص وقت تک کے لیے اللہ کریم نے مہلت دی ہے۔ نیکی اور بدی دونوں راستے واضح کر دیے ہیں۔ انبیاءؑ و رسلؑ اور کتابیں بھیجی ہیں اور دعوتِ حق دی ہے۔ لیکن اختیار بندے کو دیا ہے کہ وہ کون سا راستہ اپنانا چاہتا ہے۔ اگر وہ برائی کی راہ اختیار کرتا ہے تو بھی اس کے پاس ایک وقت مقررہ تک کی مہلت ہے۔ کر کے دیکھ لے کیا کر سکتا ہے۔ آخر وہ دن آجائے گا جب نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ قیامت تو بہت بڑا حادثہ ہے۔ اللہ معاف فرمائے، قیامت تو بہت عجیب دن ہو گا جب حضرت آدمؑ سے لے کر ساری نسلِ انسانی ایک جگہ جمع ہو گی۔

جب کسی کی بھی موت آتی ہے تو اس کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ ابھی بدن میں روح باقی ہوتی ہے لیکن اسے نہ گھر نظر آتا ہے، نہ رشتہ دار نظر آتے ہیں، نہ اولاد نظر آتی ہے، نہ کسی کی فکر ہوتی ہے۔

فرمایا، ایک وقت آرہا ہے جب ان کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ جب قیامت قائم ہو گی تو مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ سر اٹھا کر میدان حشر کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ اور

خوف کا وہ عالم ہوگا کہ آنکھیں جامد ہو جائیں گے اور ان سے پلکیں بھی نہ جھپکائی جاسکیں گی۔ ان کی نگاہ ان کی طرف واپس نہ آئے گی وَاَفۡـِٕدَتُهُمۡ هَوَآءٌ (۴۳) دلوں میں ایسی ہیبت الٰہی ہوگی گویا دُھواں بن کر اڑ رہے ہیں جیسے دل سینے میں نہیں رہا بلکہ غبار بن کر اڑ رہا ہے۔

انذار:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب جلیلہ ہے کہ وَاَنۡذِرِ النَّاسَ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس خطرے سے، آنے والے اس سخت وقت سے بروقت مطلع کر دیجیے اور انہیں بتا دیجیے! يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمُ الۡعَذَابُ فَيَـقُوۡلُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ جب وہ وقت آئے گا ظالموں پر گرفت ہوگی تو بڑے بڑے ظالم، طاقتور اور جابر گڑ گڑا کر پکاریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! رَبَّنَاۤ اے ہمارے ربّ! ہمیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں ایک دفعہ دنیا میں واپس جانے دیں، چند برسوں کی، چند مہینوں کی زندگی دے دیں اَجَلٍ قَرِيۡبٍ تھوڑی سی مدت دے دیں کہ ہم کس طرح آپ کی دعوت قبول کرتے ہیں، کتنے خلوص سے قبول کرتے ہیں۔ وَنَـتَّبِعِ الرُّسُلَ اور کتنی جانفشانی سے آپ کے رسولوں کا اتباع کرتے ہیں۔

حشر قائم ہونے پر اقرارِ ربوبیت لا حاصل ہوگا:

جب حشر قائم ہو جائے گا تو سب حقائق کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ جنت دوزخ سامنے ہوگی، فرشتے بھی سامنے ہوں گے۔ وہاں یہ بھی سمجھ آ جائے گی کہ صرف اللہ سے ہی درخواست کی جاسکتی ہے۔ وہ ربّ ہے اور اس کے سوا کوئی دینے والا، پالنے والا، سننے والا، دیکھنے والا نہیں۔ کوئی ضرورتیں پوری کرنے والا نہیں ہے۔ حالانکہ اس روز ساری مخلوق جمع ہوگی۔ ان میں بڑے بڑے امراء سلاطین، بادشاہ ہر طرح کے لوگ ہوں گے لیکن یہ پھر کسی کے پاس نہیں جائیں گے۔ پھر اللہ کو ہی پکاریں گے کہ اے اللہ! تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ تیری ہی ساری نعمتیں ہیں، تو ہی دینے والا ہے، تو ہی دُعا قبول کرنے والا ہے۔ ہماری یہ دُعا قبول کر لے اور ہمیں پھر سے دُنیا میں جانے کی اجازت دے اور تھوڑی سی مہلت دے دے۔ پھر دیکھ ہم کس طرح تیری دعوت قبول کرتے ہیں اور کس خلوص اور محنت سے تیرے انبیا اور رسل کا اتباع کرتے ہیں۔

تو اللہ کریم انہیں وہ باتیں یاد دلائیں گے جو دُنیا میں وہ کرتے تھے، جو کام وہ کرتے تھے۔ ارشاد ہوگا، اَوَلَمۡ تَكُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ (۴۴) کیا تم دُنیا میں قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمہارے پاس جو اقتدار، طاقت، دولت یا صحت جیسی نعمتیں ہیں انہیں کبھی زوال نہیں ہوگا۔ تم اس بات پر قسمیں کھاتے تھے کہ

تمہاری یہ نعمتیں کبھی ضائع نہیں ہوں گی، تمہارا اقتدار، تمہاری حکومت، تمہاری طاقت تم سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔ تمہیں اتنا یقین تھا کہ یہ نعمتیں لازوال ہیں اور ہمیشہ تمہارے پاس ہی رہیں گی۔ اور تم ایسے بے وقوف ہو کہ تم نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جن نعمتوں کو تم لازوال سمجھے بیٹھے ہو، تم سے پہلوں کے پاس شاید تم سے زیادہ تھیں۔ آج انہیں تلاش کرو، وہ کہاں ہیں۔ جن شہروں، گاؤں، قریوں میں تم رہتے ہو، جن آبادیوں میں رہتے ہو ان میں بسنے والے تم پہلے انسان تو نہیں ہو۔ جن قلعوں کے آج مالک ہو یہ کس نے بنائے تھے؟ تم سے پہلے یہ اُن لوگوں نے بنائے تھے جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، گمراہی اختیار کی۔ یہ آبادیاں انہوں نے بسائی تھیں، وہ کہاں گئے؟ ان کے تو نام ونشان مٹ گئے۔ پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہارے پاس آج جو دولت ہے، طاقت ہے، اختیار ہے، یہ ہمیشہ رہے گا؟ تم ان کی قبروں پر تخت بچھائے بیٹھے ہو، کل تمہاری قبر پر کوئی تخت بچھا کر بیٹھے گا تو پتا چلے گا کہ تب تو تمہیں اتنی سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہم نے تمہاری طرف انبیاءؑ مبعوث فرمائے، کتابیں نازل فرمائیں اور انہوں نے وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ (۴۵) تمہیں تفصیل سے نافرمان اور ظالم لوگوں کے کردار کی وضاحت کی اور اس کا انجامِ بد بھی بتایا۔ تم تک یہ بات پہنچائی گئی، تمہیں یاد دلایا گیا کہ برائی کرنے والوں کا، ظلم کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ تمہیں مثالیں دے کر، بات تفصیل سے بیان کی گئی۔ لیکن تم انبیاءؑ کی تعلیمات کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ تم تو دین کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ انبیاءؑ کی تعلیمات کو قدامت پسندی اور فرسودہ قرار دیتے رہے اور خود کو ترقی کی راہ پر گامزن سمجھتے رہے۔ تم نے انبیاءؑ کی تعلیمات کو پرانی باتیں کہہ کر یہ گمان کیا کہ ان سے قوم ترقی نہیں کر سکتی تو دیکھ لو! جس ترقی کی راہ پر تم چلے آج ترقی کرتے کرتے کہاں پہنچ گئے ہو؟

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (۴۶) اور تم نے بہت تدبیریں کیں، بہت حیلے کیے، تجویزیں کیں اور یہ سب اللہ جانتا تھا۔ تمہاری کوئی تدبیر، حیلہ یا تجویز اللہ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ تمہارے مکر اور تمہاری تدبیریں تو ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ انسانی مزاج ایسا ہے کہ خود خواہ کتنا ہی گمراہ ہو جائے کوشش یہی کرتا ہے کہ سارے لوگ اسی راہ پر آ جائیں۔ تدبیریں کرتا ہے کہ ساری قوم، سارے انسان اسی طرح کے ہو جائیں۔ ایسے خوش نصیب بہت ہی کم ہوتے ہیں جو تجزیہ کریں کہ سچ کیا ہے حقیقت کیا ہے؟ اور میں کہاں کھڑا ہوں؟ اور مجھے راستی اور حق پر رہنا چاہیے۔

فرمایا، تم نے تو بڑی بڑی تدبیریں کیں، بڑی تجویزیں کیں، بڑے جال بچھائے لیکن وہ اللہ سے تو پوشیدہ

نہیں تھے اور جن کا اللہ سے تعلق تھا اور مخلص تھے اُن کی تو اللہ نے حفاظت فرمائی اور تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ورنہ تمہاری تدبیریں تو ایسی تھیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں لیکن بندۂ مومن کو تم نہیں بہکا سکے۔

اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے:

فرمایا، فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ یہ خیال نہ کرو کہ اللہ اپنے وعدوں کے خلاف کرے گا۔ جو کچھ اللہ کی کتاب، اللہ کا رسول ﷺ تمہیں بتا رہا ہے یہ حرف بہ حرف سچ ہے اور ایسا ہی ہوگا اور یہ بھی یادرکھو! اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ اللہ غالب ہے جو چاہے کرسکتا ہے۔ ذُو انْتِقَامٍ (۴۷) اور اللہ برائی کا بدلہ ضرور دے گا۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے توبہ کرلو، معاف کرالو، وہ الگ بات ہے لیکن اگر برائی پر، ظلم پر خاتمہ ہوا تو ظلم کا بدلہ تمہیں بھگتنا ہوگا اور کسی غلط فہمی میں مبتلا مت رہنا کہ تمہارے پاس بڑے لاؤ لشکر ہیں، پہرے دار ہیں، محلات ہیں اور خزانے ہیں تو شاید بچ سکو۔ جب قیامت آئے گی تو ساری بنیاد ہی بدل جائے گی۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔ یہ زمین وہ نہیں رہے گی جو تمہارے لیے بچھونا ہے، جو تمہارے لیے فصلیں اُگاتی ہے، جو پھل اور پھول دیتی ہے۔ بلکہ یہ بالکل بدل جائے گی، اس کی ساری خصوصیات بدل جائیں گی۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ، ساری زمین کو کھینچ کر برابر کر دیا جائے گا۔ سمندر خشک ہوکر ہوا میں اڑ جائیں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ کر برابر ہو جائیں گے اور ساری زمین ہموار کر دی جائے گی اور اس کی تمام خصوصیات بدل جائیں گی۔ ایک ہی وقت میں بندہ مومن کے لیے رحمت اور بادِ بہاری ہوگی جبکہ کافر کے لیے نارِ جہنم سے تپتی ہوگی۔ اس پر مت رہو کہ تم نے زمین پر بڑے قلعے بنا لیے، بڑے عالیشان محل بنا لیے، یہ سب کچھ تو تباہ ہو جائے گا۔ اس کی ساری خصوصیات بدل جائیں گی۔ آسمان کی ساری خصوصیات بدل جائیں گی۔ یہ چاند کی چاندنی، ستاروں کی چمک، ہواؤں کی روانی یہ سب بھول جاؤ گے کہ آسمان بیک وقت بندۂ مومن کے لیے رحمت برسا رہا ہوگا اور کافر کے لیے غضبِ الٰہی برسانے کا سبب ہوگا۔ مفسرینِ کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کے لفظ تُبَدَّلُ کا معنی تبدیل کر دینا ہے۔ ہوسکتا ہے ان زمینوں، آسمانوں کو فنا کر کے اللہ نئے بنا دے۔ اللہ قادر ہے۔ لیکن ان کی بھی جب ساری خصوصیات تبدیل ہو جائیں گی تو پھر یہ بھی نئے ہی ہوں گے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۸) اس روز ہر شخص اللہ کے روبرو پیش ہونے سے لرزاں و ترساں ہوگا اور ہر کسی کو اپنی ہی فکر ہوگی۔ حضور ﷺ کے ایک ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ میدانِ حشر میں، سوائے اللہ کے خاص

بندوں کے،لوگ بے لباس ہوں گے۔کسی نے کفن دیا وہ بھی مٹی کھا گئی لرزاں وترساں اپنے پسینے میں غرق ہوں گے۔ تو عرض کی گئی کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ لوگ برہنہ ہوں گے تو کیا انہیں ایک دوسرے کے سامنے برہنگی کا احساس نہیں ہوگا؟ ارشاد پاک کا مفہوم ہے کہ کسی کو دوسرے کی کچھ خبر نہیں ہوگی، ہر کوئی اپنی فکر میں گرفتار ہوگا، اپنی اتنی مصیبت پڑی ہوگی کہ کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آرہا ہوگا۔ ہر ایک اسی دھیان میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ اللہ واحد کی بارگاہ میں سب کو پیش ہونا ہے جو اَلْقَھَّار ہے۔ ظالموں کے لیے بہت سخت گیر ہے، بہت زبردست ہے۔ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ(۴۹) اور تم دیکھو گے کہ بڑے بڑے مجرم، ظالم اور متکبر، بڑے بڑے کفار زنجیروں میں جکڑے ہوں گے۔ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ اور ان کو گندھک کے کرتے پہنائے جائیں گے۔ ان کے لیے ٹخنوں تک لمبے لمبے کرتے ہوں گے جو آتش گیر مادے کے بنے ہوں گے اور اس کی آگ بھڑک کر ان کو گھیر رہی ہوگی۔ پاؤں سے لے کر سر تک وہ شعلہ سا بنا ہوا ہوگا اور ان کے چہروں کو آگ جلا رہی ہوگی۔ وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (۵۰) اور آگ نے ان کے چہروں کو ڈھانپ رکھا ہوگا۔ آخرت اتنی مضبوط، اتنی حقیقت ہے کہ دنیوی زندگی میں اس کا عمل دخل رہتا ہے۔ اس کا پرتو انسانی زندگی پر رہتا ہے تو زندگی میں بھی ایسے ظالم اندر ہی اندر اسی طرح جلتے بھی رہتے ہیں۔ اسی طرح بے چینیاں ہوتی ہیں، بے قراریاں ہوتی ہیں۔ دولت ہے، گھر میں سواریاں ہیں لیکن اندر دوزخ بھڑک رہی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے! آج جدید دور میں کفار جو فلمیں بناتے ہیں، پروگرام پیش کرتے ہیں ان میں اکثر ایسے کردار دکھاتے ہیں، ایسے منظر دکھاتے ہیں جو بالکل قیامت کا اور جہنمیوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ تو سوچنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے قرآن تو پڑھا نہیں، آخرت پر ایمان نہیں۔ یہ آخرت کتنی مضبوط ہے کہ اس کا پرتو انسانی زندگی پر ہے اور ان کے دماغ میں وہ خیالات گردش کرتے ہیں کہ ایسا بھی ہوگا۔ ذہن میں خیال آتا ہے تو بندہ اس کی تصویر بناتا ہے۔ تو یہ بڑے بڑے ظالم اللہ کے روبرو پیشی کے لیے لائے جارہے ہیں اور ان کے لباس آتش گیر مادے کے ہیں اور چہرے کو آگ جھلسا رہی ہے۔ ابھی ان کے اعمال وکردار کی سزا کا حساب تو آگے ہونا ہے۔ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ابھی تو اعمال تولے جارہے ہیں کہ جو کام انہوں نے کیے اس کا انہیں بدلہ دیا جائے۔ یہ تو پیشی پر جارہے ہیں، سزا کا اعلان تو آگے جا کر ہوگا۔

دُنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں جب مجرم کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے تو بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ پولیس

والے انہیں بغیر ہتھکڑی کے بھی لے آتے ہیں، بعض ایسے ہوتے جنہیں بغیر ہتھکڑی کے نہیں لاتے۔ پھر بعض کو ہتھکڑیوں کے ساتھ بیڑیاں بھی لگا کر لاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں بیڑیاں، ہتھکڑیاں لگا کر لوہے کی گاڑی میں اردگرد پہرے دار کھڑے کرکے لایا جاتا ہے۔

تو یہ ظالم بھی پیشی کے لیے لائے جارہے ہیں سزا کا اعلان تو ابھی ہونا ہے۔اِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ بیشک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔انسان اس چند سالہ زندگی میں یہ بھول جاتا ہے کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔اس کا عرصہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑا ہے۔آخرت کی زندگی ابدی ہے، دائمی ہے، کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے، وَاِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ(الحج: 47) عند اللہ آسمانوں پر ایک دن گزرے تو زمین پر ایک ہزار سال گزر جاتا ہے۔عرصہء محشر کا ایک دن پچاس ہزار سال کا ہوگا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے لیکن یہ تشریح نہیں ملتی کہ وہ پچاس ہزار دُنیا کے ہوں گے یا آسمانی ہوں گے تو چونکہ وہ اس عالم میں ہے تو زیادہ امکان تو یہ ہے کہ وہ آسمانی دن شمار کیے جائیں گے۔تو اب اس حشر کے ایک دن کے مقابلے میں اپنی دنیوی زندگی کا اندازہ لگائیے، تو کتنی نظر آتی ہے؟ نہ ہونے کے برابر! فرمایا، تو ایسے بے وقوف تھے کہ انہوں نے ابدی اور دائمی زندگی کو چند روزہ لذتوں پر قربان کر دیا، ضائع کر دیا۔ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِیُنۡذَرُوۡا بِہٖ وَلِیَعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّلِیَذَّکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ(۵۱) حضور ﷺ کی بعثت، اللہ کا پیغام، یہ قرآن، حضور ﷺ کے ارشادات، یہ سارے ذرائع اس لیے ہیں کہ لوگوں تک حقائق پہنچیں۔ لِلنَّاسِ اولادِ آدمؑ کو حقیقت سے آشنا کر دیا جائے، ان تک حقائق پہنچا دیے جائیں اور انہیں انجامِ بد کی بروقت خبر دی جائے۔

انذار کیا ہے؟

انذار کا ترجمہ اُردو میں تو ڈر ہی لکھا جاتا ہے۔ چونکہ اُردو کا دامن تنگ ہے اور اس میں عربی جیسی وسعت نہیں ہے۔ ڈر تو بہت سی قسموں کا ہوتا ہے، دشمن کا ڈر ہوتا ہے، بیماری کا ہوتا ہے، ڈاکو، درندے کا ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی پر بھی اَنۡذِرۡ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اَنۡذِرۡ تنبیہ کو کہتے ہیں کہ کسی کو اس کے کام کا برا انجام وقت سے پہلے

بتا دیا جائے تا کہ وہ اس سے بچ جائے۔ مثلاً کوئی بندہ کچھ کھانے لگے تو دوسرا کوئی سمجھدار اسے سمجھائے کہ یہ جو تم کھانے لگے ہو یہ ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ کھاتے رہو تو کچھ نہیں ہوگا لیکن مہینے بعد اس کا اثر ہوگا اور وہ تمہارے لیے مہلک ہوگا۔ ایسی چیز مت کھاؤ۔ یعنی جو کر رہے ہو اس کے برے انجام کی بروقت اطلاع کو انذار کہتے ہیں۔ اُردو میں اسے ڈر لکھا جاتا ہے۔ تو فرمایا، قرآن کریم اور اللہ کے نبی ﷺ کا پیغام اسی لیے ہے کہ لوگوں کو آخرت کی تباہی سے بروقت مطلع فرما دیا جائے، آگاہ کر دیا جائے، ان تک بات پہنچا دی جائے۔

وَلِيَعْلَمُوٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اور وہ جان لیں، انہیں یقین دلایا جائے کہ عبادت کا مستحق صرف وہی واحد لاشریک ہے۔ صرف وہی ہستی اس بات کا حق رکھتی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

عبادت کا مفہوم:

عبادت سے مراد صرف نماز روزہ نہیں ہے۔ عبادت سے مراد اطاعت ہے، جس میں نماز روزہ بھی شامل ہے، نفلی عبادات بھی شامل ہیں، جس میں ساری زندگی شامل ہے۔ کہ انسان کا ہر کام، ہر سوچ، ہر لفظ یا تو عبادت ہے، یا اگر اطاعت کی حد سے باہر ہے، تو گناہ ہے۔

وَلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

اور نزولِ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ صاحب دانش لوگ جو اپنی عقل کو استعمال کرتے ہیں، اللہ کی عطا کردہ فکر اور سوچ کو استعمال کر کے اس سے تجزیہ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کی راہنمائی ہو سکے۔ وہ ہدایت پا سکیں، اپنی اصلاح کر سکیں، اللہ کے سیدھے راستے پر آسکیں۔

سورۃ الحجر آیت 1

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ①

الٓرٰ یہ (اللہ کی) کتاب اور واضح قرآن کی آیتیں ہیں۔﴿۱﴾

تفسیر ومعارف

سورۃ الحجر کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا۔ چونکہ مکہ مکرمہ میں تیرہ سالہ حیاتِ پاک عقاید ونظریات کی جدوجہد سے عبارت ہے اس لیے جتنی سورتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں ان میں زیادہ بحث عقائد ونظریات پر ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی اور ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ معاملات میں فیصلے کرنا جیسے اہم امور پیش آئے تو اللہ کریم کی طرف سے احکام ومسائل نازل ہوئے اس لئے جو سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں ان میں زیادہ احکام کا بیان اور تشریح ہے۔ مکی سورتوں میں عقاید ونظریات پر زیادہ بحث کی گئی ہے۔ سورۃ الحجر میں بھی اسی تسلسل میں جو پیچھے سے آرہا ہے اس سے آغاز ہوتا ہے۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ

الٓرٰ حروفِ مقطعات ہیں جن پر بہت مرتبہ بات ہوچکی۔ فرمایا، یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اَلْکِتٰبِ معرفہ ہے اور اس سے مراد ایسی کتاب ہے جس کی نظیر ممکن نہیں۔ صرف اکیلی ہے۔ ال (الف لام) جب ساتھ لگتا ہے تو اس سے خصوصیت مراد ہوتی ہے کہ یہ بے مثل و بے مثال، اعلیٰ اور کائنات میں ایک ہی ہے۔ فرمایا، تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ یہ اس قرآن کی باتیں ہیں جو ہر بات کھول کر بیان کردیتا ہے۔ پوری تفصیل سے ہر چھوٹی چھوٹی سی بات کو بھی واضح کردیتا ہے، روشن کردیتا ہے۔

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکؐ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد و خواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ، روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقہِ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔